۔ بصداعتذار ۔

کرونا وائرس کی وباء نے طویل لاک ڈاؤن کی شکل میں دنیا کو شدید بحرانی کیفیت سے دوچار کر دیا ہے جس سے نہ صرف روزمرہ کے معمولات بلکہ کاروبارِ زندگی بھی ایک طرح سے ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ تمام تر کوشش اور کاوش کے باوجود ''چہارسو'' کی باقاعدہ اشاعت کی سبیل کسی طور نہ بن پائی۔آئندہ کی بابت بھی غیر یقینی احاطہ کیے ہوئے ہے۔

امید رکھنی چاہیے ،حالات جلد بہتر ہوں اور ''چہارسو'' تین دہوں کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے طباعتی شکل میں آئندہ بھی آپ کے مطالعے کی زینت بنا رہے۔

مستقبل کی بابت خوش اُمیدی قائم رکھنا زندگی کی دلیل ہے۔

گلزار جاوید

''چہارسُو''

..... دو مینار .....

(رپورتاژ)

آج کے پاکستانی نوجوان نے قائداعظم کا پاکستان نہ تو دیکھا ہے، نہ اس کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے۔

قائداعظم کے پاکستان کی عمر صرف گیارہ برس تھی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک۔ اُس کے بعد یہ اغواء ہوگیا اور پچھلے ۶۰ برسوں سے سیاسی، غیر سیاسی اور مذہبی اقتدار پرستوں کے ذاتی مفادات اور باہمی گٹھ جوڑ کا یرغمال ہے۔

قائداعظم کا پاکستان ایک فلاحی ریاست تھی۔ اس کے شہری باکردار تھے۔ کیونکہ وہ یوپی کے سرسیّد، بنگال کے اے کے حق، نواب سلیم اللہ خان، پنجاب کے علامہ مشرقی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان، بمبئی کے محمد علی جناح اور کئی دوسرے علاقوں کے باکردار لیڈروں کے پروردہ تھے۔ اس کی بیوروکریسی امورِ سلطنت کی ماہر تھی۔ کیونکہ وہ ایک صدی سے برطانوی سلطنت کی وسعت میں حسنِ انتظام کی مضبوط کڑی رہی تھی۔ اس کے سیاستدان ابتدائی تربیتی لڑھکنیاں کھا کر سنبھل گئے تھے اور اب اتنے بالغ نظر ہوگئے تھے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی اختلافات حل کر چکے تھے۔ اس کے بعد ملک کے دونوں حصے پوری یک جہتی سے ہم قدم تھے۔

آج کا پاکستانی نوجوان یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ اسے دانستہ لاعلم رکھا گیا ہے۔ اغوا کرنے والے نہیں چاہتے کہ اغوا ہونے والے کی پہچان ہو سکے یا اس کا ذکر بھی ہو۔

آج کا پاکستانی نوجوان صرف اس پاکستان کو جانتا ہے جس کے سیاستدان موقع پرست ہیں۔ عوام بے آواز ہیں۔ بیوروکریسی بدنام ہے اور لیڈر خودغرض ہیں۔ جس میں بدامنی ہے، بدقماشی ہے، بدعہدی ہے اور ہر بدی کے سر پر چمکدار تاج ہے۔ منافقت بھرے ماحول میں اسلام، جمہوریت، آئین، قانون، انصاف اور عوامی بہبود کے قصیدے تو دن رات گائے جاتے ہیں لیکن عملی طرزِ عمل سے ہر دم ان کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ ملک میں جا بجا دھماکے ہیں، لاشیں ہیں، خون کے فوارے ہیں، سنگ و خشت مستقل طور پر مقید ہیں اور سگ بالکل آزاد ہیں۔

آج کا پاکستانی نوجوان یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان اپنے جنم دن سے ہی ایسا ہے کیونکہ اس نے پاکستان میں صرف بدنظمی اور بدامنی کا دور دیکھا ہے۔ لیکن میں نے اس خطۂ زمین پر تین ادوار دیکھے ہیں:

۱۔ انگریز حاکم کی غلامی کا دور۔

۲۔ قائداعظم کے آزاد پاکستان کا بہتر و برتر دور۔

۳۔ یرغمال پاکستان کا ابتر دور۔

زیرِ نظر رپورتاژ ان تین ادوار کی عینی گواہی ہے۔ اس لیے اس کا رُوئے سخن پاکستانی نوجوان کی طرف ہے تاکہ قائداعظم کے پاکستان کو جان سکے، اس کی روح کو پہچان سکے، اغوا کی واردات کو سمجھ سکے اور مغوی کو رہا کروانے کے لیے خود کو تیار کر سکے۔

میرے بچپن (میٹرک پاس کرنے تک) نے برٹش دور کے اچھے انتظام کو دیکھا۔ میرے لڑکپن نے قائداعظم کے پاکستان کی محنتی اور مخلص بیوروکریسی دیکھی۔ اس کے انتظامی معجزوں کی وجہ سے اپنے وطن کی حیرت انگیز ترقی دیکھی، بلکہ اس کا سنہری زمانہ دیکھا۔ پھر جوانی کی دہلیز پر میں جب پاکستان کی انتظامیہ کا پرزہ بن گیا تو قدم قدم پر وہ ناقابلِ یقین مناظر دیکھتا رہا۔ جب وطن کی دائمی سیاست عارضی حکومتوں کے پاؤں تلے روندی جا رہی تھی۔ قائداعظم کی سدھائی ہوئی بیوروکریسی کو اصلاحات کے پتھروں سے سنگسار کیا جا رہا تھا اور حاکموں کے ذاتی مفادات حسنِ انتظام (Good Governance) کو تباہ کر رہے تھے۔

یہ کب ہوا؟۔۔۔ کیوں ہوا؟۔۔۔ ان سب کی جھلک ان صفحات میں موجود ہے۔

مسعود مفتی

اشاعت: ۲۰۲۰، قیمت: ۶۹۵ روپے، دستیابی: اوکسفرڈ، کراچی

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۹،شمارہ:مئی جون ۲۰۲۰ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِ سالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ: 537/D-1 ‘ گلی نمبر 18، ویسٹریج -III ‘ راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: 8730433-8730633-51-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

شوقِ دید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۷

السلام السلام۔۔۔۔۔نواز دیوبندی ۹

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۰

آگ کا سمندر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۱۵

شعروسخن کا آفتاب۔۔۔۔۔۔مولانا محمود احمد خاں ۲۰

حقیقت پسند شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منظور عثمانی ۲۳

شاعرِ فکر و فن ۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ایس وائی قریشی ۲۷

غزل اور اخلاقیات کا شاعر۔۔۔۔۔رضوان انصاری ۲۹

شعری تقاضوں کا عرفان۔۔۔۔۔۔راحت اندوری ۳۱

شاعری اور اس کا تخلیقی رچاؤ۔۔۔پروفیسر اختر الواسع ۳۴

شاعری، نقاد اور نواز دیوبندی۔۔۔۔۔یعقوب یاور ۳۶

شاعرِ فطرت شناس۔۔۔۔۔۔۔۔۔توقیر احمد خاں ۳۸

حقائقِ زندگی۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عبید اقبال عاصم ۴۰

غزل کے اجالے کا شاعر۔۔۔۔ڈاکٹر عنبرین حسیب ۴۳

علاجِ رنج و غم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۴۵

یک مطلعِ خورشید

رؤف خیر۔ ۴۷

افسانے

ظلمت کدے میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شموئل احمد ۴۸

چیچہ وطنی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رضیہ اسماعیل ۵۱

قرنطینہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آصف فرخی ۵۶

ماربا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شہناز خانم عابدی ۵۹

داستانِ حیات

اقبال عظیم، یونس شرر، حسن عسکری کاظمی، محمود شام، واصف حسین، ہارون الرشید، پرتپال سنگھ بیتاب، علی ارمان، آصف ثاقب، نسیم سحر، عرش صہبائی، ڈاکٹر ریاض احمد، اشرف جاوید، نثار ترابی۔ ۶۲

افسانے

اینڈ تھنگ الس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مشتاق اعظمی ۶۹

واپسی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قمر جمالی ۷۲

حریا کی حیرانیاں۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر ذاکر فیضی ۷۵

دلتوں کی اندھیری رات۔۔۔۔۔۔۔۔۔ندیم راعی ۷۹

الہام کا گماں

تصور اقبال، قاسم جلال، شگفتہ نازلی، مظہر بخاری، سبھاش گپتا شفیق، شہلا نقوی، رشی خان، رومانہ رومی، شبہ طراز، ابراہیم عدیل، نصرت جعفری، افتخار حیدر، احمد سراج، پریم ناتھ بسمل، عبدالوہاب، اسد رضا، عامر بیگ۔ ۸۱

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۷

ابرِ نو بہار

اور سب چاند ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظفر قریشی ۹۳

دائمی گردشیں

عبداللہ جاوید، پروین شیر، یوگیندر بہل، انیس الرحمٰن، فرح کامران، شگفتہ نازلی، جہانگیر اشرف، سہیلہ انعام صدیقی، تصور اقبال، سیمیں کرن، رینو بہل۔ ۹۷

زندگی نایاب ہے

کرونا وائرس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۱۰۵

آئینۂ فن

مائیکروفکشن کانفرنس۔۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۱۰۸

نشانِ راہ

اک گمشدہ شناخت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رؤف خیر ۱۱۰

ایک صدی کا قصہ

پردیپ کمار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۳

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۶

☆

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر نواز دیوبندی

کے نام

شوقِ دید

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

نام : محمد نواز خان
قلمی نام : ڈاکٹر نواز دیوبندی (اردو شاعر اور ماہر تعلیم)
والد : عبدالسبحان خان (مرحوم)
تاریخ پیدائش: ۱۶۔جولائی ۱۹۵۶ء
جائے پیدائش: ضلع دیوبند، سہارنپور، یوپی، بھارت
پتہ : محلّہ قلعہ، دیوبند، پین 247554، یوپی، بھارت
موبائل : 9319155237,9219181271
تعلیم: ڈی لٹ (جامعہ اردو علی گڑھ)
پی ایچ ڈی اردو (سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ)
ایم اے اردو (سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ)
بی کام (سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ)
ادیب کامل (جامعہ اردو علی گڑھ)
معلم اردو (جامعہ اردو علی گڑھ)
آئی جی ڈی (ممبئی)

چیئرمین شپ:
۱۔ اتر پردیش اردو اکادمی
۲۔ رفیق الملک ملائم سنگھ یادھو اردو آئی اے ایس سٹڈی سینٹر
۳۔ بین الاقوامی قلم فاؤنڈیشن
۴۔ (مختلف زبانوں کی تنظیم) بھارت
۵۔ ایس آئی ٹی (سوسائٹی برائے اسلامک نظریات) بھارت
۶۔ سوشل تنظیم

منیجر:
نواب عظمت علی خان گرلز ڈگری کالج۔ایم نگر
نواب عظمت علی خان گرلز ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ۔ایم نگر
نواب عظمت علی خان گرلز پرائمری سکول۔ایم نگر
نواب عظمت علی خان گرلز انٹر کالج۔ایم نگر
نواب گرلز پبلک سکول، دیوبند
سرسید اکیڈمی، دیوبند
سبحانیہ سلائی سینٹر، دیوبند
سبحانیہ کمپیوٹر سینٹر، دیوبند
عمر دراز ہیلتھ کیئر سینٹر، دیوبند
نواز پبلی کیشنز، دیوبند

چیف کنٹرولر:
مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، دیوبند

سیکرٹری:
نواب عظمت علی خان ایجوکیشنل ایسوسی ایشن۔ایم نگر
آل انڈیا ایجوکیشنل سوشل ویلفیئر سوسائٹی، دیوبند

اعزازی سپروائزر:
پبلک ہائر سیکنڈری سکول، دیوبند

ممبر:
مسلم ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ ویلفیئر ایسوسی ایشن، نئی دہلی

سابقہ ممبر:
اردو اکیڈمی آف امریکہ شکاگو (یو ایس اے)
ایڈوائزر برائے ریسرچ بورڈ
امریکہ بائیوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ، نارتھ کورلینا (یو ایس اے)

بانی مشیر:
ایم اے کانونٹ پبلک سکول (سجرو)
رام پور پبلک سکول (گرلز)، رام پور، یوپی
رام پور پبلک سکول (بوائز) رام پور، یوپی
رام پور پبلک سکول، رام پور، یوپی
امتیاز الحق انٹر کالج نصیر پور باسا (مغل سرائے)
اے بی سی پلے سکول، خرجا

مشاغل: اردو شاعری، تعلیم نسواں، سوشل ویلفیئر

ادبی غیر ملکی دورے:
دبئی، ابو دہبی، العین، شارجہ، دوحہ قطر، نیپال، پاکستان، کینیڈا، میکسیکو، یو ایس اے، نیویارک، نیو جرسی، بوسٹن، ہیوسٹن، لاس اینجلس، سن فرانسسکو، لاس ویگاس، کلے لینڈ، موریشیئس، اومان، سعودی عریبہ، ریاض، جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، ماسکو، لندن۔

ریڈیو پروگرام:
آل انڈیا ریڈیو، دہلی۔
نجیب آباد، لکھنو، ناگپور، بھوپال، ممبئی، کول کتہ، بنگلور، حیدر آباد، جے پور، پٹنہ، رام پور، گورکھپور، جدہ، کراچی، ٹورنٹو، مختلف ریڈیو اسٹیشن یو ایس اے اور دیگر، ایم بی سی پورٹ لیوس اور ماریشیس، ماسکو وغیرہ۔

ٹیلی ویژن پروگرام
دوردرشن کنڈ رد ہلی، ممبئی، لکھنؤ، جالندھر، حیدر آباد، کول کتہ۔

''چہارسُو''

پی ٹی وی (کراچی)، ٹی وی سینٹر (شکاگو، نیویارک)، ذی ٹی وی، ای ٹی وی (اردو)، المنصور (دبئی) ایم بی سی ٹی وی (ماریشیس)، سہارا ٹی وی، یو ٹی این (اردو)، سب ٹی وی، سونی ٹی وی، این ڈی ٹی وی، سٹار پلس، ذی سلام، دبنگ ٹی وی، چینل ۷، آج تک، اقرا ٹی وی (لندن) و دیگر۔

پبلی کیشنز:

۱۔ پہلا آسمان (مجموعہ اردو شاعری)
۲۔ پہلی بارش (مجموعہ ہندی شاعری)
۳۔ خبر مہکی (گجراتی شاعری)
۴۔ Due Drops (انگریزی شاعری)
۵۔ سوانح علمائے دیوبند (جلد اول) ۶۵۶ صفحات
۶۔ سوانح علمائے دیوبند (جلد دوم) ۶۵۶ صفحات
۷۔ حکایتِ اسلافِ دیوبند

اعزازات:

۱۔ اتر پردیش گورنمنٹ کی طرف سے ''لیش بھارتی ایوارڈ'' ۲۰۱۵ء
۲۔ ''غزل کی شام نواز دیوبندی کے نام'' جوالاپور ۱۹۸۷ء
۳۔ ایوارڈ برائے ''بہترین شاعر'' بریلی ۱۹۸۷ء
۴۔ ایوارڈ برائے ''نئی آواز'' دہلی ۱۹۸۹ء
۵۔ ''فراق ایوارڈ'' جھانسی ۱۹۹۰ء
۶۔ ''شمس ایوارڈ'' مرادآباد ۱۹۹۴ء
۷۔ ''روٹری ایوارڈ'' میرٹھ ۱۹۹۵ء
۸۔ ''تہذیب ایوارڈ'' غازی آباد ۱۹۹۶ء
۹۔ ''فکرِ دیوبند'' از دیوبند پتر کار پری شاد ۱۹۹۶ء
۱۰۔ ''جگر ایوارڈ'' مرادآباد ۱۹۹۷ء
۱۱۔ ''تہذیب ایوارڈ'' غازی آباد ۱۹۹۸ء
۱۲۔ ''ایک شام نواز دیوبندی کے نام'' جدہ، سعودی عریبیہ ۱۹۹۹ء
۱۳۔ تعریفی سند از کونسلیٹ جنرل آف انڈیا، جدہ ۱۹۹۹ء
۱۴۔ ''استقبالیہ'' از شعبہ اردو، سی سی ایس یونیورسٹی، میرٹھ ۲۰۰۱ء
۱۵۔ ''ساہتیہ رتن'' مرادآباد
۱۶۔ ''کیفی اعظمی ایوارڈ'' نوئیڈا ۲۰۰۲ء
۱۷۔ ''راشٹریہ ایکتا ایوارڈ'' از انجمن ارتقائے اردو، روہڑکی ۲۰۰۲ء
۱۸۔ ''روٹری انٹرنیشنل ووکیشنل ایوارڈ'' میرٹھ ۲۰۰۳ء
۱۹۔ ''دشیانت سمن'' ایوارڈ، سہارنپور ۲۰۰۳ء
۲۰۔ ''ویدھ اگروال سمرتی سمن ایوارڈ'' میرٹھ ۲۰۰۳ء
۲۱۔ ''شہیدِ اعظم بھگت سنگھ ایوارڈ'' غازی آباد ۲۰۰۳ء
۲۲۔ ''اک شام نواز کے نام'' سہارنپور ۲۰۰۴ء
۲۳۔ ''سمن سمرو ایوارڈ'' ایم ایچ ۲۰۰۴ء
۲۴۔ ''کنہیہ لال مشر اپر بھکار ایوارڈ'' سہارنپور
۲۵۔ ''مسلم ایواڈ'' ۲۰۰۰ء
۲۶۔ ماریشیس کے صدر کی جانب سے ''والہانہ استقبالیہ'' ۱۹۹۹ء
۲۷۔ ''ابھی نندن'' رہڑکی
۲۸۔ ''حفیظ میرٹھی ایوارڈ'' میرٹھ ۲۰۰۰ء
۲۹۔ ''ایکسی لینس ایوارڈ'' از روٹری انٹرنیشنل برائے شاعری
۳۰۔ ''مشیر جھنگوی ایوارڈ'' ایم نگر ۲۰۰۱ء
۳۱۔ ''سمن پرتیک ایوارڈ'' کلیان منچھ، دیوبند ۲۰۰۱ء
۳۲۔ ''ساہتیہ رتن ایوارڈ'' دیرہ دون ۲۰۰۴ء
۳۳۔ ''شالندرہ سمن ایوارڈ'' رہڑکی ۲۰۰۴ء
۳۴۔ ''گیتوں غزلوں بھری شام ڈاکٹر نواز دیوبندی کے نام'' سہارنپور ۲۰۰۴ء
۳۵۔ ''کویا شرومنی ایوارڈ'' سہارنپور ۲۰۰۴ء
۳۶۔ ''سادھورام آرزو ایوارڈ'' سہارنپور ۲۰۰۴ء
۳۷۔ ''سروچی ساہتیہ کالا سمن ایوارڈ'' ۲۰۰۵ء
۳۸۔ ''اعزازی سند برائے تعلیم وادب'' مظفرنگر ۲۰۰۵ء
۳۹۔ ''ساہتیہ بھارتی الانقرہ'' ۲۰۰۶ء
۴۰۔ ''گیان بھارتی پرسکار ایوارڈ'' نئی دہلی ۲۰۰۶ء
۴۱۔ ''مظفر نوید ایوارڈ'' مظفرنگر ۲۰۰۷ء
۴۲۔ ''اعزاز'' سہارنپور ۲۰۰۸ء
۴۳۔ ''شاہِ ہند ایوارڈ'' نئی دہلی ۲۰۰۸ء
۴۴۔ ''غزل شری ایوارڈ'' سہارنپور کانٹی نینٹل ۲۰۰۸ء
۴۵۔ ''اعزازی سند'' از روزنامہ امر اجالا، میرٹھ ۲۰۰۹ء
۴۶۔ ''تعریفی سند'' از ONGC، دیرہ دون ۲۰۱۰ء
۴۷۔ ''وردہ ایوارڈ'' ۲۰۱۰ء
۴۸۔ ''قومی بہترین شخصیت ایوارڈ'' اتر کھنڈ ۲۰۱۵ء
۴۹۔ ''دھرم شاعری ایوارڈ''
۵۰۔ ''فانی شکیل بدایونی ایوارڈ'' بدایوں ۲۰۱۵ء
۵۱۔ ''مسرور خان سروہا ایوارڈ'' سہارنپور ۲۰۱۰ء
۵۲۔ ''سہارنپور شری ایوارڈ'' از مدر ٹریسہ میڈیکل کالج ۲۰۱۵ء
۵۳۔ ''میر تقی میر ایوارڈ'' ۲۰۱۳ء
۵۴۔ ''متی رتن ایوارڈ'' ۲۰۱۴ء
۵۵۔ ''سید اطہر الدین ایوارڈ'' میرٹھ ۲۰۱۵ء
۵۶۔ ''اتر پردیش ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ'' اتر پردیش ۲۰۱۴ء

☆

السلام السلام السلام

درِ کبریا پہ جھکاؤ سر
درِ مصطفیٰ سے لگاؤ دل
یہ جو سر ہے اس کو بناؤ سر
یہ جو دل ہے اس کو بناؤ دل
السلام السلام السلام

شاہِ ذیشان کو شانِ قرآن کو
روح ایمان کو رب کے مہمان کو
السلام السلام السلام

ان کے اطوار کو اعلیٰ کردار کو
نرم گفتار کو تیز رفتار کو
السلام السلام السلام

سبز دستار کو اُن کے رخسار کو
حسنِ معیار کو زلف خم دار کو
السلام السلام السلام

آمنہ مائی کو آپ کی دائی کو
بوڑھی ہمسائی کو ہر شناسائی کو
السلام السلام السلام

ماں کی ممتاؤں کی جنتی پاؤں کو
پیار کی چھاؤں کو امتی ماؤں کو
السلام السلام السلام

عشق کے فخر کو علم کے قصر کو
پیکر صبر کو بنتِ بو بکر کو
السلام السلام السلام

ناز بردار کو اُن کے غمخوار کو
چار کے چار کو یعنی ہر یار کو
السلام السلام السلام

اُن کے دلدار کو عاشقِ زار کو
زانوئے یار کو یارکو غار کو
السلام السلام السلام

ہوش کی آب کو جوش کی تاب کو
عدل کے باب کو ابنِ خطاب کو
السلام السلام السلام

مال کو جان کو دستِ فیضان کو
ابنِ عفان کو اُن کے عثمان کو
السلام السلام السلام

تیر تلوار کو فتح بردار کو
عزمِ کرّار کو اُن کے گھر بار کو
السلام السلام السلام

ایک جاں باز کو اُن کے دم ساز کو
حبشی انداز کو اُجلی آواز کو
السلام السلام السلام

اک سخن دان کو اک ثناخوان کو
نعت کی شان کو یعنی حسان کو
السلام السلام السلام

○

براہِ راست

شاعری بالخصوص اردو کی نسبت بہت سے صاحبانِ علم تفریح یا تسکین کے تاثرات رکھتے ہیں حالانکہ یہ ایسی صنفِ لطیف ہے جس کو پیغمبر، انبیاء، اولیاء، صوفیا نے نہ صرف پسند فرمایا بلکہ ذریعہ اظہار بھی بنایا۔

ہماری خوش قسمتی کہ اس بار ہم ایک ایسی شخصیت کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کر رہے ہیں جو عالم بھی ہیں، فاضل بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، ماہر تعلیم اور خدمت خلق سے سرشار ایسی ہمہ جہت شخصیت ہیں جن کا احاطہ مشکل بھی ہے اور دشوار بھی۔

آج کی مجلس میں کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر نواز دیوبندی صاحب کی نسبت اثابت رائے کو مربوط انداز میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کے فکری خال وخد اور شعری نقوش کچھ اس طرح نمایاں اور واضح کیے جائیں کہ موجودہ زمانے کے ساتھ آنے والے وقت میں بھی ڈاکٹر صاحب کے قاری، ناقد اور محققین کے لیے آسانیاں مہیا ہو سکیں۔

گلزار جاوید

☆ اگر آپ ہمیں اپنے نام کے لاحقے ''خان'' کی تفصیل بتلانا پسند کریں تو آپ کے آبائی پس منظر سے بہ آسانی آگاہی ہو سکتی ہے؟

☆☆ خاندانی اعتبار سے یوسف زئی پٹھان ہوں میرے آباؤ اجداد دیوبند کے رہنے والے تھے۔

☆ کچھ روشنی اُن حالات و واقعات پر ڈالیے جب چھٹی جماعت کا طالب علم خود بھی پڑھتا اور چند روپیوں کی خاطر دوسرے بچوں کو بھی پڑھاتا تھا؟

☆☆ پانچویں کلاس کے طالب علم کا یہ عمل اس کے فطری رجحان، صلاحیت اور جذبے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت کا بھی مظہر ہے اور ذوق وشوق کا بھی!

☆ گھریلو ماحول علمی اور برادرِ بزرگ کے شاعر ہوتے ہوئے آپ کی شعر گوئی پر والد صاحب محترم کو کس نوعیت کے اعتراضات تھے؟

☆☆ والد صاحب قبلہ کو شاعری پر اعتراض نہیں تھا فرمایا کرتے تھے کہ طالب علم کی تعلیمی زندگی میں کوئی بھی چیز اگر خارج ہو تو اس سے گریز کرنا چاہیے اپنے بچوں کی تربیت پر بڑا دھیان دیتے تھے بلکہ تعلیم و تربیت میں تربیت کو اولیت دیتے تھے بڑے سخی طبیعت تھے لوگوں کی ضرورت کا سامان رکھنے اور ان کو ضرورت مند لوگوں کو دینے کا شوق تھا جیسے ھقہ، ترازو، باٹ، کھرپہ، چارپائی، بستر، کھانا بنانے کے برتن وغیرہ۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ اپنے پڑوسیوں کے کام آیا کرو اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

☆ تخلیق کار کو اکثر ابنارمل کیوں کہا جاتا ہے۔ اس رائے کو مثبت جانا جائے یا منفی، اپنے حوالے سے بھی صورتِ حال کی وضاحت فرمادیں تو کیا کہنے؟

☆☆ بلاشبہ تخلیق کا جنون سے بہت قریبی رشتہ ہے مگر میں اس میں خوش گوار جنون کا قائل ہوں، تخلیقی عمل کے لیے یہی نارملسی ہے جسے عرف عام میں انبارملسی کہا جاتا ہے۔

☆

یہ لوگ کیسے اچانک امیر بن بیٹھے
یہ سب تھے بھیک مرے ساتھ مانگنے والے

روئے سخن کس جانب ہے؟

☆☆ جن کا شعر ہے ان سے پوچھیں۔

☆ کھڑی بولی اور برج بھاشا کو غزل میں کثرت سے برتنا پرموش کے سبب ہے یا مزاج کا حصہ؟

☆☆ لسانی ارتقاء کے سبب۔

☆ کولرج کی نصیحت ''بہترین الفاظ اور ترتیب'' کو آپ نے کب اپنی لغتِ شعری میں شامل کیا اور اس کے نتائج سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

☆☆ بہترین الفاظ اور ترتیب یقیناً تخلیق کے ماتھے کا جھومر ہیں اسے تخلیق کا لباس فاخرہ بھی کہا جا سکتا ہے میں نے بھی ہمیشہ فکر و خیال کی مضبوط بنیاد پر خوبصورت الفاظ اور ان کی خوبصورت ترتیب کے حوالے سے غزل کا تاج محل تعمیر کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے اور ابھی یہ کوشش جاری ہے۔

☆ آپ نے اردو شاعری میں ہیئت اور اسلوب و لفظیات کی جو تبدیلیاں کی ہیں اُس کی ضرورت کیوں آن پڑی۔ مستقبل میں آپ کی محنت کا پھل کس شکل میں ظاہر ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ میں اردو کا معمولی سا طالب علم ہوں معاف کرنا ''تبدیلیاں'' بڑا ٹائٹل ہے۔ میرا ماننا ہے کہ تغیر و تبدل فطری تقاضوں کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں ارادہ کر کے کوئی تخلیق کار بڑی تبدیلیوں کا داعی نہیں ہو سکتا جیسے جیسے تخلیقی عمل آگے بڑھتا ہے خالق کے فطری رجحانات کا عکاس ہوتا جاتا ہے۔ جدت اختراعی نہیں ہو سکتی اسی طرح لب ولہجہ بھی فطری طور پر ودیعت ہوتا ہے البتہ اس پر قدرے مشق و محنت اس کو نکھارتی ہے یہی اسلوب کی بافت ہے۔

☆ آپ کے ہاں چراغ کا استعمال جس تواتر سے ہوا ہے اُسی شدومد

سے اُس کی بابت قاری کا اشتیاق سوا ہوا جاتا ہے؟

☆☆ چراغ میرے تحت الشعور کا حصّہ ہے۔ چراغ روشنی کا ہی نہیں زندگی کا بھی استعارہ ہے جب تک اندر سے بھی روشن ہو اور باہر سے بھی!

☆ کچھ بیان مشکل زمینوں اور کم مروج بحروں کی نشان دہی فرما دیجیے جن میں آپ نے بے ساختہ اشعار کہے۔ یقیناً کچھ اسباب بھی رہے ہوں گے؟

☆☆ ایسے جھمیلے میں نہیں پڑتا، ویسے بھی شاعری میں کرافٹنگ کا قائل نہیں ہوں واضح ہو کہ میں آورد کا نہیں آمد کا شاعر ہوں۔

☆ وہ کون سے تیر ہیں جو آپ نے فکر کی کمانوں کے چلّے پر رکھ کر داغے اور آپ جیسے تحمل مزاج اور بردبار قلم کار کے یہاں یہ نوبت کیونکر در آئی؟

☆☆ تخلیق کار سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

☆ یہ غرور و تمکنت پر واہ، واہ حاصل کرنا قاری کے لیے اُلجھن کا باعث بن رہا ہے؟

☆☆ غرور! استغفراللہ، استغفراللہ۔ البتہ اُس آدمی سے بڑی تمکنت سے ملتا ہوں جو عاجزی کو خوشامد سمجھنے لگتا ہے۔

☆ ادبی سروکار میں سماجی مقصدیت کا عمل دخل کب واجب گردانا گیا اور اس کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

☆☆ ----

☆ نواز دیوبندی کون سی ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے پاسدار یا علمبردار ہیں۔ انتہا پسندی، عدم برداشت، تشدد۔۔۔یا؟

☆☆ کسی بھی تخلیق کار کو کسی سرحد میں قید نہیں کیا جا سکتا اس لیے ایک عام تخلیق کار بھی عالمگیر سطح کی فکر کا حامل ہوتا ہے۔ ایسی قیود و بند سے آزاد ہو جانا ہی انسانیت کا پہلا تقاضہ ہے البتہ جب آپ نے وطنیت میں محدود کیا ہے تو مجھے اپنے وطن کی مٹی سے عشق ہے اور اس کی انسان پرور فضا میرے مزاج کا حصہ ہے۔

☆ آپ کے دور میں مسائل اس تیزی سے پھل پھول رہے ہیں کہ اُن کی بیخ کنی مشکل بھی ہے اور محال بھی، کجا نئے موضوعات اور عنوانات متعارف کرائے جائیں؟

☆☆ مسئلے اور دشواریاں زندگی اور سماج کے وہ حوالے ہیں جن سے جدوجہد، محنت اور کوشش جنم لیتی ہے اور ان ہی سے بیخ کنی کے لیے حوصلہ اور ہمت ملتی ہے۔ میرا شعر ہے:

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کر کے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کر کے دیکھ

یا

راستے میں مشکلیں ملیں
مشکلوں سے راستہ ملا

☆ عملی سیاست میں حصہ نہ لے کر بھی سیاسی شعور اُجاگر کرنے کی دانستہ یا غیر دانستہ کوشش اور کاوش کا سرا کہاں تلاش کیا جائے؟

☆☆ سیاست کی موجودہ بازی گری اور مکر و فریب کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے اس سے اظہار بیزارگی کیا اور اسے شجرِ ممنوعہ قرار دیا حالانکہ قوم و ملت کے لیے بقا کا راز بھی اسی کی پاکیزہ صورت میں پوشیدہ ہے۔ اجتماعی شعور بیدار کرنا ایک تخلیق کار کا کلیدی اور اخلاقی فریضہ ہوتا ہے اس فرض کی ادائیگی میں ضروری نہیں کہ تخلیق کار خود بھی سیاست داں ہو۔

☆ ڈاکٹر صاحب آپ کی ہر دلعزیزی اور ناموری کو آپ یا آپ کے احباب نے کیش کرانے کی کوشش کی ہے کبھی؟

☆☆ گلزار بھائی آپ کی دعا سے میں صد فی صد غیر سیاسی آدمی ہوں۔ البتہ جب الیکشن قریب آتے ہیں تو کئی طرف سے اس طرح کی آوازیں ضرور سنائی دیتی ہیں کہ فلاں پارٹی نواز بھائی کو فلاں ٹکٹ دے رہی ہے جب احباب ان خبروں کی صداقت کے لیے مجھ سے رجوع کرتے ہیں تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ جب تک میں نفی جواب دیتا رہوں گا تب تک یہ خبریں زندہ رہیں گی۔ آپ کی دعا سے جب میں یوپی اردو اکادمی کا چیئرمین تھا تو اُس وقت مجھے تین بار ایم ایل سی کی پیشکش ہوئی مگر میں نے ہر بار اپنا ہی شعر پڑھ کر معذرت کر لی:

میری بے نیازیوں کا یہ صلہ ملا ہے مجھ کو
کہ نیاز و ناز والوں سے سوا ملا ہے مجھ کو

☆ آپ کی غزل کو انسان کی غزل بتلانے والے، دوسرے شعراء کے لیے سوالیہ نشان پیدا کر رہے ہیں؟

☆☆ کسی کا حسن دوسرے کی بدصورتی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

☆ کئی احباب نے آپ کو میر تقی میر، علامہ اقبال، حافظ شیرازی اور اصغر گونڈوی کے مماثل گردان کر بحث کے نئے دَر وا نہیں کر دیے؟

☆☆ حسن میں پرکیسے پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں شعر و ادب میں جب تک مباحثوں کے باب وا نہیں ہوتے۔ ادب کا ارتقائی عمل جامد رہتا ہے مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔

ایک روز ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ نواز بھائی آپ کے پاس پانچ سو روپیہ کھُلے ہیں میں نے عرض کیا کہ میرے پاس پانچ سو روپئی کھُلے تو نہیں ہے البتہ آپ یہ سوچتے ہیں کہ میرے پاس پانچ سو روپیہ ہو سکتے ہیں اس کے لیے شکریہ!

☆ مشاعروں کے ذریعے شناخت حاصل کرنا بجائے خود سوالیہ نشان ہے؟

☆☆ مشاعروں کے ذریعہ ادبی شناخت پر سوالیہ نشان کھڑا کرنا ایمانداری نہیں ہے۔ مشاعروں میں بھی سخن فہم، سخن شناس اور ادب کے پارکھی موجود ہوتے ہیں۔

میر تقی میرؔ، غالبؔ اور داغؔ جیسے متعدد شعراء کرام کے زمانے میں نہ تو جرائد و اخبارات تھے اور نہ ہی مجموعۂ کلام شائع کرانے کا رواج تھا بلکہ اس دور میں

بھی شعری نشستوں میں موجود سخن شناس افراد ہی تخلیق کا معیار طے کرتے تھے اور یہی معیار ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنتا تھا یہ بحث کہ ناقدانِ فن ہی سندِ توصیف دیں تو شاعر، شاعر ہوگا میں اس کو درست نہیں مانتا میرے نزدیک ایک بہترین سامع اور معیاری سخن شناس بھی شاعری کا معیار طے کرسکتا ہے۔

ویسے میری شاعری اور مجھ پر دنیا کے تقریباً ایک سو پچاس سے زائد شاعروں اور ادیبوں کی رائے کتابی شکل میں ''ذرّہ نوازی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

☆ کتب اور مشاعروں کی شاعری کو الگ الگ بتلانے کی نوبت کیوں آن پڑی۔ اس کے نقصانات وفوائد کس شکل میں ظاہر ہورہے ہیں؟

☆☆ یہ بے جا تقسیم ہے شاعر، شاعر ہے شاعر کو اچھا اور سچا شاعر تسلیم کیے جانے کے لیے معقول شاعری بنیادی شرط ہے۔

☆ جس دور میں سٹیج پر متشاعروں، نقال اور گلے بازوں کا قبضہ ہو اُس دور میں مشاعروں کو تہذیبی وتدریسی ادارہ بتلانا سادگی پر محمول کیا جائے گا؟

☆☆ ان سب باتوں کے باوجود آج بھی مشاعروں کے اسٹیج پر باوقار اور معقول شعراء کی موجودگی کی فہرست بڑی طویل ہے اور طویل نہ بھی ہو اگر پورے مشاعرے میں دو حقیقی شاعر موجود ہوں تو مشاعرے کو مکمل جانیے۔

☆ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو مشاعروں کی کامیابی کا تمام تر دارومدار اموشنل بلیک میلنگ کا مرہونِ منت ہے۔ ہر کوئی ماں، بہن، بیٹی کی زبوں حالی کا نوحہ حواسِ خمسہ کی مدد سے پیش کرکے سامعین کے جذبات واحساسات کا سودا کر رہا ہے؟

☆☆ آپ کی بات بہت حد تک درست ہے تاہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ شاعر کی شاعری میں حالات ضرور منعکس ہوتے ہیں۔ میں بذاتِ خود شاعری میں اخباریت اور بے جا احتجاج کا قائل نہیں ہوں اگر احتجاج ہو تو اس میں بھونڈا پن نہ ہو بلکہ اسلوب میں شائستگی اور سلیقہ ہونا چاہیے۔

☆ دینی شعائر کے پابند قومی اور بین الاقوامی شاعر کی موسیقی سے دلچسپی ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ اپنی دلچسپی کے معیار اور پیمانے بتلا کر آپ اس خوشی کو دوبالا کرسکتے ہیں؟

☆☆ کسی شاعر کے اشعار مقرر اپنی تقریریں، واعظ اپنے وعظ میں سادھو سنت اپنے پروچنوں میں پڑھنے لگیں گلوکار گانے لگیں اور موسیقی والے ان میں دلچسپی دکھانے لگیں تو یہ اشعار کی خوش نصیبی ہے۔

☆ ہمیں آپ کے محبوب سے بھی تعارف کا اشتیاق ہے اور ہم بڑی چاہ سے آپ کے انتظار میں شامل ہونے کے شائق ہیں؟

☆☆ میرا شعر ہے:

میری غزلوں میں تو نمایاں ہے
اور ترا نام تک نہیں آتا

☆ غالباً ۲۰۰۵ء کی بات ہے۔ اسلام آباد کی بڑی محفل میں دیگر نامور شعراء کے علاوہ احمد فراز مرحوم اور دیگر قدآور شعراء کی موجودگی میں فرزندِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے اردو شاعری کو یہ کہہ کر سرے سے رد کردیا تھا کہ دوسروں کی بہو، بیٹیوں اور بہنوں کے فراق میں عشقیہ اشعار کہنا شاعری نہیں لچر پن کی دلیل ہے۔ اُن کے خیال میں قومی اور ملّی جذبے کے زیر اثر جو اشعار کہے جائیں وہ شاعری کے زمرے میں آتے ہیں؟

☆☆ یہ بات فرزندِ اقبال کہہ رہے ہیں اقبالؔ نہیں۔

☆ اس خیال کی روشنی میں گئے وقتوں کے محبوبِ مذکر کی تکرار اور کردار پر بحث لازم نہیں ہوجاتی؟

☆☆ بحث کی بہت گنجائش ہے مگر لاحاصل

☆ حسیب صدیقی صاحب سے ملاقات اور مسلم فنڈ کمرشل انسٹی ٹیوٹ کی روداد بھی قاری کے حوصلوں کو مہمیز دے سکتی ہے؟

☆☆ مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند ہندوستان کا پہلا بلاسودی اقتصادی ادارہ ہے۔ ۱۹۶۱ء میں قائم ہوا تھا۔ مسلم فنڈ ضرورت مند لوگوں کو قرض بلاسود کی سہولت مہیا کراتا ہے یہ ایک بڑا رفاہی اور فلاحی ادارہ ہے۔ جناب حسیب صدیقی صاب اس کے منیجر تھے۔ منیجر کیا تھے سب کچھ وہی تھے انہوں نے اس ادارے کو بنانے میں وہ محنت کی جو عام آدمی کے بس کی بات نہیں انہوں نے اس ادارہ کو وہ استحکام دیا کہ ملک میں ان کی تحریک اور نگرانی میں سیکڑوں ایسے ادارے قائم ہوئے جن سے لاکھوں لوگ مستفید ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ حسیب صدیقی صاحب نے اپنے آپ کو اس ادارے کے لیے وقف کردیا تھا ۔موصوف نہایت سنجیدہ اور متین طبیعت کے مالک تھے۔ کام کرنے کا شاندار سلیقہ تھا۔ دردمند دل کے مالک تھے۔ مسائل کی بات کو بڑی توجہ سے سنتے اور بھرپور مدد کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ مسلم فنڈ صرف قرض بلاسود کا کام کرتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں جب میں نے جوائن کیا تو حسیب صدیقی صاحب کی سرپرستی میں اس ادارے سے دیگر فلاحی کام شروع کیے سب سے پہلے طلبہ وطالبات کے لیے تعلیمی قرض کی سہولت مہیا کرائی پھر ٹائپنگ سینٹر بنایا جسے بعد میں کمپیوٹر سینٹر میں تبدیل کیا جہاں سے ہزاروں نوجوان ٹائپنگ یا کمپیوٹرائزڈ ٹائپنگ سیکھ کر معقول روزگار پر ہیں پھر آنکھوں کا اسپتال بنایا (مدنی آئی اسپتال) پھر ۱۹۹۰ء میں لانی آئی ٹی آئی بنایا اس ادارے نے بھی بہت ترقی کی اور روزگار کی راہیں کھولیں۔ موٹر ڈرائیونگ سینٹر بنایا یہ ٹریننگ بھی بے روزگاروں کے لیے نعمت مترقبہ ہے۔ یہ سارے کام محترم حسیب صدیقی صاحب کی سرپرستی اور نگرانی میں انجام پذیر ہوئے۔ مرحوم کو ہر اچھی تجویز پر لبیک کہنے کا شوق تھا اور خوب دلچسپی لے کر مدد کرتے تھے۔ ایسے تاریخ ساز اور فعال لوگ دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ ۹۔ جنوری ۱۹۱۹ء کو اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس سے سرفراز کرے۔

☆ مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، نواب عظمت علی خان ٹرسٹ، انگلش میڈیم ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ، نواز سیکنڈری گرلز سکول اور دیگر رفاہی اداروں کی روداد بیان کرنا ایک طرح سے فرضِ کفایہ ادا کرنے سے برابر ہے؟

☆☆ الحمدللہ پچیس ادارے چلانے کی توفیق قدرت نے دی ہے اس میں اکثر طالبات کے تعلیمی ادارے ہیں۔ ایک مظفر نگر میں ڈگری کالج بھی ہے لیکن میرا زیادہ فوکس ابتدائی اور معیاری تعلیمی اداروں پر ہے۔ مضبوط پیر والے نوجوان ہی ریس کا گھوڑہ بن سکتے ہیں۔ دیوبند میں بھی کئی ادارے ہیں جن میں نواز گرلز پبلک اسکول علاقہ کا معروف اور معیاری ادارہ ہے یہ تمام ادارے مختلف شہروں میں قائم ہیں ان کے علاوہ نئے اداروں کے قیام کی کوشش جاری ہے اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ آمین۔

☆ یوپی اردو اکیڈمی کے چیئرمین کے انتخاب اور خدمات کا احاطہ کیا جائے تو کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں بالخصوص بورڈ کے امتحانات میں امتیازی حیثیت پانے والوں کو ایوارڈ اور سرکاری ملازمین کو اردو زبان کی تعلیم و تدریس جیسے منصوبوں کا ذکر ضروری بھی ہے اور لازمی بھی؟

☆☆ پونے تین سال اتر پردیش اردو اکادمی کا چیئرمین رہا اس میں ایک سال اور کم کر دیجئے کیونکہ ایک سال محبانِ اردو کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہا بلکہ یوں کہا جائے کہ جو اس منصب کے خواہاں تھے انہیں رام کرنے میں گزرے میں نے ان سے کسی طرح کی کوئی جنگ نہیں کی بلکہ اپنے تعمیری کاموں اور خاموشی سے انہیں زیر کیا۔ میں اس منصب کا خواہش مند نہیں تھا میں نے تو سرکاری نامزدگی کے اٹھارہ دن بعد اپنی شرطوں پر جوائن کیا۔ چیئرمین کو اسٹیٹ منسٹر کی تمام سہولیات ملتی ہیں۔ بنگلہ، گنر اور پرسنل اسٹاف جیسی بہت ساری سہولیات، الحمدللہ ان سب سے بے نیاز رہا۔ پونے دو سال میں اللہ تعالیٰ نے اتنا کام کرایا ملک کی تمام اکادمیوں کے لیے ایک نمونہ ثابت ہوا۔ معمول کے مطابق جو کام ہوتے تھے وہ بدستور جاری رہے بلکہ تیز رفتاری سے ہوئے۔ معمول سے ہٹ کر جو غیر معمولی کام ہوئے وہ اکادمی کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں۔ ملک میں پہلی مرتبہ اتر پردیش اردو اکادمی کی طرف سے اردو املا کے لیے ملک کی اعلیٰ سروسز یعنی آئی اے ایس، آئی پی ایس اور پی سی ایس کی تیاری کے لیے ایک کوچنگ سینٹر ڈھائی ایکڑ زمین پر لکھنو میں ''اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر لکھنؤ'' کے نام سے قائم کیا گیا جس میں اردو والوں کے لیے تمام سہولیات جیسے کوچنگ، قیام طعام، لائبریری اور دیگر سہولیات مفت ہیں اس ادارے نے بڑا نام کمایا اور بڑی تعداد میں طلبا و طالبات کو چنگ کر کے کمپیٹیشن میں بیٹھے اور کامیاب ہو کر سرکاری اعلیٰ سروسز میں آئے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح لکھنؤ میں ہی ''اردو ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا'' سینٹر قائم کیا جہاں نوجوانوں کے لیے کم مدتی صحافتی کورس شروع کئے اس طرح اردو والوں کا اعلیٰ سروسز میں آنا اور صحافتی میدان میں ان کا عمل دخل معمولی بات نہیں۔ روزگار کا روزگار اور خدمت کا سنہری موقع!

دسویں اور بارہویں کلاس اردو مضمون کے ساتھ پاس کرنے اور اردو میں ضلع ٹاپ کرنے والے صوبے کے طلبہ و طالبات کو پانچ ہزار ایک سو روپیہ کا چیک، ہزار روپیہ کی کتب اور فخرِ ضلع (جیسے فخر میرٹھ) کا خطاب دے کر نوازا گیا۔ اگر کسی غیر مسلم طالب علم نے اردو مضمون لیا اور پاس کر لیا تو اُسے بھی یہ سارے انعامات دیے گئے فخرِ ضلع کے خطاب کو چھوڑ کر۔ اردو مضمون میں ضلع ٹاپ کرنے والے طالب علم کے استاد کو اس کے والد کو اس کی والدہ کو اور اس کے اسکول کو بھی اعزاز سے سرفراز کیا۔ مقصد تھا اردو کا فروغ اور ان تمام لوگوں کی اردو کے ساتھ وابستگی اور انوولمنٹ! صوبہ اتر پردیش کے اسکولوں میں ''بچوں کا مشاعرہ'' کے نام سے ایک سو پروگرام منعقد کیے۔ سرکاری افسران کے لیے اردو کلاسز چلائیں جس میں اعلیٰ افسران کلکٹر، ایس ایس پی، آئی جی، ڈی آئی اور کمشنر کے علاوہ دیگر افسران بھی شرکت کرتے تھے۔ ''اردو کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ'' قائم کیا جس میں اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی کی کمپوزنگ سکھائی جاتی ہے۔ اکادمی کی جانب سے ملک کا پہلا ''اردو دروازہ'' دیوبند میں تعمیر کیا گیا جس کی بلندی ۴۸ فٹ ہے اور یہ سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے گومتی نگر لکھنؤ میں ''اردو آڈیٹوریم'' بنایا جس میں تقریباً تین سو لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے یہ ہال جدید تمام سہولیات سے آراستہ ہے اور یہاں ادبی اور سماجی پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ اردو اکادمی کی عمارت کی تزئین کاری کرائی گئی تاکہ اہل اردو افتخار محسوس کریں۔ میڈیا سینٹر کو بھی بہت خوبصورت اور دیدہ زیب بنایا گیا ہے۔ سینٹر میں آڈیو اور ویڈیو اسٹوڈیو موجود ہیں جہاں تمام ڈیجیٹل سہولیات موجود ہیں۔ اکادمی نے گذشتہ سالوں سے زیادہ شعراء اور ادبا کی تصنیفات پر مالی امداد دی اور اضافے کے ساتھ دی۔ کتب پر انعامات کی رقم میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ تعداد اور رقم کے اعتبار سے ایک ریکارڈ قائم ہوا۔

شعراء اور ادبا کو دیئے جانے والے وظیفہ کی رقم کو دوگنا سے بھی زیادہ کر دیا گیا۔ صوبے کے مختلف شہروں میں اکادمی کی مالی اور کتب امداد سے لائبریریاں چلتی ہیں ان کی چیکنگ کرائی گئی ان میں بہت سی لائبریریاں فرضی پائی گئیں لہٰذا انہیں امداد دینا بند کیا اور فعال اور نئی لائبریریوں کو اضافے کے ساتھ مالی اور کتب امداد دی گئی۔ اکادمی کے بکڈپو کی تزئین کاری کی گئی۔ نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ پرانی اور ضروری کتابوں کو ری پرنٹ کرایا گیا۔ ماضی قریب میں دنیا سے رخصت ہونے والے بیس شعراء ادباء اور صحافیوں پر ان کے ہم عصروں سے تخلیقی کام کرا کر ''شخصیت سریز'' کے نام سے بیس کتابیں شائع کرائیں۔

اکادمی کی بڑی قیمتی اور قدیم لائبریری ہے اس کا وہی حال تھا جو عام طور سے اردو لائبریریوں کا ہوا کرتا ہے اس کو از سر نو ترتیب دلایا نئے انداز سے الماریاں اور اسٹڈی ہال بنوایا اور خاص بات یہ ہے کہ موجودہ کتابوں کے تقریباً پچیس لاکھ صفحات ڈیجیٹل کرائے۔ چھوڑیئے بات بہت طویل ہوگئی پھر کسی موقع پر! ابھی بہت سارے باب ہیں۔

☆ ہندوستان کی آزادی کے بعد دیوبند کی شادابی کو دوبالا کرنے کی

ضرورت کیوں آن پڑی جبکہ دیوبند مکتبہ فکر تو مسلسل حالتِ جنگ میں ہے؟

☆☆ آپ جنگ کے بجائے جہد استعمال کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ جہدِ مسلسل سے ہی تحریکیں قائم رہتی ہیں۔

☆ پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ اور ''سوانح علمائے دیوبند'' کی افادیت اور انفرادیت سے آگاہی دیجیے؟

☆☆ علماء دیوبند نے مختلف جہتوں میں کام کیا۔ وہ مفسر بھی ہیں محدث بھی، وہ مقرر بھی ہیں مصنف بھی، شاعر بھی ہیں ادیب بھی، ان حضرات کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ مجھے خیال آیا کہ ان حضرات کی صحافتی خدمات پر کام کیا جائے۔ دیوبند چونکہ علم وادب کا گہوارہ ہے۔ رجال سازی اس سرزمین کی پہچان ہے لہٰذا میں نے ''دارالعلوم دیوبند کی اردو صحافتی خدمات'' پر تحقیقی مقالہ ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین صدر شعبہ اردو میرٹھ کالج کی نگرانی میں تیار کیا۔ میرا وائی وا ڈاکٹر بشیر بدر صاحب اور پروفیسر شریف احمد صاحب کی نگرانی میں ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں مجھے پی ایچ ڈی ایوارڈ ہوئی۔

صحافت چونکہ ایک جدید طرزِ نگارش ہے علماء دیوبند نے بھی اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں میں نے کوشش کی کہ ان حضرات کی صحافتی خدمات کو یکجا کر کے قلم بند کر سکوں۔ اسی طرح علماء دیوبند کا تذکرہ بھی ''سوانح علماء دیوبند'' کے نام سے (دو جلدوں میں پندرہ سو صفحات پر مشتمل) ترتیب دیا ہے مجھ جیسے طالب علم کو اعتراف ہے کہ یہ دونوں موضوعات اس قدر وقیع اور عظیم ہیں کہ میں ان کا حق ادا نہیں کر سکا۔

☆ کلام پاک کی شکل میں مکمل ضابطۂ حیات کی موجودگی کے بعد مسالک، فرقے اور خود ساختہ نظریات کی گنجائش کب اور کن لوگوں نے پیدا کی اور کیوں امتِ مسلمہ کو تقسیم در تقسیم کرنے کا ذمہ دار ٹھہرے؟

☆☆ اس سوال سے سائل کی جذباتیت اور حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امت کی فکر ہونا ایک دینی فریضہ ہے۔ ملی وحدت ہر دور بالخصوص عہدِ حاضر کی اہم ضرورت ہے اس کے باوجود میں اس کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کو ترجیح دیتا ہوں۔

☆ کچھ اشعار اور اُن کی تفصیل ضرور درج کیجیے جو آپ نے قرآن پاک کی آیات کو سامنے رکھ کر منظوم کیے؟

☆☆ معاف کیجیے میں اپنے اشعار کی تحدید نہیں کر سکتا یہ کام قارئین اور سامعین کا ہے کہ تلاش وجستجو کریں۔

☆

اُس کے قتل پہ میں بھی چپ تھا میرا اب نمبر آیا
میرے قتل پہ آپ بھی چپ ہیں اگلا نمبر آپ کا ہے

نہیں صاحب ہرگز نہیں۔ آپ چپ تھے آپ نے غلطی کی مگر اُن کی چپ ایک حقیقت ہے جو آپ کو قتل گاہ پر قربان کئے تک چپ ہی رہے گی؟

☆☆ شعر تفسیر تماشۂ جہاں ہوتا ہے
اس شعر کو کسی خاص یا ایک پس منظر میں نہ دیکھا جائے۔

☆ آنجہانی اندرا گاندھی کے بہیمانہ قتل پر آپ نے فرمایا تھا:

اب تو مان لیجیے گا وقت کا یہ فتوی ہے
حق طلب تو کرتے ہیں ہم دغا نہیں کرتے

وقت نے آپ کے خیال کو دو طرح سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوّل بیس کروڑ لوگوں کو انتخابات میں اچھوت بنا کر، اُن کے پیدائشی حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ دوئم نئے نئے قوانین اور ضابطوں کا ڈھ اکھڑا کر کے خوف کی تلوار الگ سے سر پر لٹکا دی گئی؟

☆☆ ----

☆ دنیا کی آدھی دولت دس فیصد لوگوں کے قبضے میں ہے آپ کے ملک کی پچیس فیصد آبادی خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اتھاہ تاریکی کے اس دور میں چراغِ رہ گزر جلانا دل جلانے کے مترادف نہیں؟

☆☆ ----

☆ ڈاکٹر صاحب کوئی اپنی مرضی سے وطن نہیں چھوڑتا حالات اور مجبوری سب کچھ کراتے ہیں۔ خوش فہمی یہ نہیں کہ آپ کو اپنے وطن میں رہ کے عزت ملی نوحہ یہ ہے کہ وطن چھوڑنے والے گھر کے رہے نہ گھاٹ کے؟

☆☆ میرا شعر ہے:

ہجرت تو ایک شخص نے کی تھی پھر اس کے بعد
ہجرت نہ کر سکا کوئی ہجرت کے باوجود

☆ ہماری اطلاع کے مطابق اگلی صدی تک دنیا کی کم وبیش پانچ ہزار زبانیں اپنے وجود سے محروم ہو جائیں گی اس صورتِ حال میں تمام زبانوں کا عالمی لفظیات سے اتفاق کرنا محلِ نظر ہے؟

☆☆ بے شک محلِ نظر ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ بہت سی تبدیلیوں کے باوجود اردو کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہے گا اگر آپ لسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو دنیا کی بہت سی زبانیں اپنی ہیئت بدل چکی ہیں اور بہت سی زبانوں میں بڑی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ دور کے ساتھ ساتھ رویے بدلتے رہتے ہیں۔

☆ بندہ پرور! اردو زبان پوری دنیا بالخصوص ہندوستان میں طبعی عمر کے آخری مرحلے میں بتلائی جاتی ہے۔ اس صورتِ حال میں ''عالمی غزل'' وہ بھی ہندوستان میں چہ معنی دارد؟

☆☆ میرا ماننا ہے کہ نہ اردو ختم ہو رہی ہے نہ کمزور ہو رہی ہے البتہ اس کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ لسانی عصبیت اردو کو مٹا سکتی ہے مناسب نہیں ہے۔

اتنی بات ضرور ہے کہ اردو رسم الخط جاننے والوں کی تو کمی ہو رہی ہے البتہ زبان جاننے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔

باقی صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ کیجیے

''آگ کا سمندر''

(ڈاکٹر نواز دیوبندی کے کلام بلاغ سے جستہ جستہ)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

کسی کی نذر کچھ اشعار کر کے دیکھتے ہیں
غزل میں عشق کا اظہار کر کے دیکھتے ہیں

خراج دینے سے انکار کر کے دیکھتے ہیں
امیرِ شہر سے تکرار کر کے دیکھتے ہیں

ہمارے چاروں طرف آگ کا سمندر ہے
چلو اس آگ کو گلزار کر کے دیکھتے ہیں

ہماری کٹیا تو برباد کر چکا ہے وہ
محل کو اسکے بھی مسمار کر کے دیکھتے ہیں

ابھی ہے ڈوبنے والوں پہ تبصرہ بیکار
چڑھی ہوئی یہ ندی پار کر کے دیکھتے ہیں

یہ رہنما تو جگانے سے بھی نہیں جاگے
چلو عوام کو بیدار کر کے دیکھتے ہیں

..... ○ .....

☆

خدا کے فضل کا سایا بہت تھا
خطاؤں پر مری پردا بہت تھا

وہ خوابوں کی طرح سچا بہت تھا
یہ دھوکا تھا مگر اچھا بہت تھا

بچھڑتے وقت مڑ کر دیکھ لیتا
محبت کے لیے اتنا بہت تھا

وہ میرا ہے، غلط فہمی تھی مجھ کو
مگر یہ سچ ہے میں اُس کا بہت تھا

تعجب کیا جو پتھر ہو گئی ہیں
میں اِن آنکھوں سے کل رویا بہت تھا

سفر میں دوست، محسن اور بھائی
سبھی تھے میں مگر تنہا بہت تھا

مرے احساس نے میٹھا کیا ہے
وفاؤں کا ثمر کڑوا بہت تھا

○

☆

ہم نے عشق کی سب سے پہلی مشکل کو آسان کیا
دل خود کو دانا کہتا تھا دانا کو نادان کیا

ہم بھی کتنے سادہ دل ہیں کتنے بھولے بھالے ہیں
ہم نے اپنے دل میں اپنے دشمن کو مہمان کیا

ہم نے اپنے شعروں میں اس رہبر کو رہزن کیا
جس نے منزل سے پہلے ہی منزل کا اعلان کیا

تب جا کر کچھ خواب سجائے اپنی سونی آنکھوں میں
ساری راتیں کالی کر لیں نیندوں کو قربان کیا

وہ موجود نہیں تھے پھر بھی ان سے بیٹھ کے باتیں کیں
شوقِ دید میں اکثر ہم نے آنکھوں کو حیران کیا

ہنس کے جلا جو، مجھ پہ مٹا جو، وہ پروانہ میرا ہے
شمع نے یہ اعلان کیا پر، صبح کے بعد اعلان کیا

اس کا کتنا بوجھ اتارا، در پر آ کر سائل نے
اور سخی یہ سوچ رہا ہے، سائل پر احسان کیا

○

☆

مرا آنگن مرا در بولتا ہے　　وہ آ جاتے ہیں تو گھر بولتا ہے
الٰہی خیر ہو قاتل کی میرے　　سنا یہ ہے کہ خنجر بولتا ہے
یہ ہے اعجاز انؐ کی گفتگو کا　　مخاطب ہوں تو پتھر بولتا ہے
ہماری پیاس کا معیار یہ ہے　　کہ خود بڑھ کر سمندر بولتا ہے
میں چپ ہوں اور مرے اندر کا شاعر　　غزل میں لفظ بن کر بولتا ہے
شرافت کا پتا چلتا ہے اس کی　　وہ جب غصے میں بھر کر بولتا ہے
چھپاؤں میں غریبی کو کہاں تک　　ذرا بارش ہو چھپر بولتا ہے
مری غزلیں نوآز اور ان کے لب پر　　یہ جادو سر پہ چڑھ کر بولتا ہے

..... ○ .....

☆

اک دوسرے کا ساتھ ہیں ہم یوں نبھا کے خوش
میں رو کے خوش ہوں، اور وہ مجھ کو رلا کے خوش
کچھ دوست ہیں کہ ہم پہ ہیں تہمت لگا کے خوش
ہم دشمنوں کے عیب بھی سب سے چھپا کے خوش
جگنو کو آندھیوں سے بھی لڑ کر نہیں غرور
اور آندھیاں ہیں ننھا سا دیپک بجھا کے خوش
ماں، باپ، بیوی، بچے، بہن، بھائی، بھابیاں
میں اپنے گھر میں چھوٹی سی جنت بسا کے خوش
تم سایہ سایہ چل کے بہت خوش ہو اور میں
رستے میں ایک چھوٹا سا پودا لگا کے خوش
ہم کو تو قتل ہو کے بھی شرمندگی ہے یار
اور تُو ہے اپنے آپ کو قاتل بتا کے خوش
اسی کا ہے سر بلند زمانے میں ہے نوآز
جو ہے بڑوں کے سامنے سر کو جھکا کے خوش

○

☆

ساقیا! تیرا اصرار اپنی جگہ
تیرے میکش کا انکار اپنی جگہ
تیغ اپنی جگہ دار اپنی جگہ
اور حقیقت کا اظہار اپنی جگہ
اب کھنڈر ہیں، کھنڈر ہی کہو دوستو!
شیش محلوں کے آثار اپنی جگہ
بھائی سے بھائی کے کچھ تقاضے بھی ہیں
صحن کے بیچ دیوار اپنی جگہ
مختصر یہ بتا سر بکف کون تھا
جیت اپنی جگہ ہار اپنی جگہ
اوّلاً حق نے تخلیق جس کو کیا
سب کے بعد اس کا اظہار اپنی جگہ
طور پر لاکھ موسیٰ سے ہو گفتگو
عرشِ اعظم پہ دیدار اپنی جگہ

○

☆

تیرے آنے کی جب خبر مہکے　　تیری خوشبو سے سارا گھر مہکے
ذکر خوشبو ہے ہجر میں تیرا　　ہم سفر تُو ہو تو، سفر مہکے
شام مہکے ترے تصور سے　　شام کے بعد پھر سحر مہکے
رات بھر سوچتا رہا تجھ کو　　ذہن و دل میرے رات بھر مہکے
یاد آئے تو دل منور ہو　　دید ہو جائے تو نظر مہکے
وہ گھڑی دو گھڑی جہاں بیٹھے　　وہ زمیں مہکے وہ شجر مہکے
جن کو وابستگی رہی تجھ سے　　وہ ہی الفاظ عمر بھر مہکے
جو روانہ ہوئے تری جانب　　ان پرندوں کے بال و پر مہکے

..... ○ .....

☆

اجالوں نے دیا روشن ضمیر کا پتا برسوں
بجھے بھی تو چراغوں سے دھواں اٹھتا رہا برسوں
مرے ہنسنے کا جس میں حادثہ لکھا مؤرخ نے
زمانے نے وہی قصہ بچشم تر سنا برسوں
ہمیں تو موج طوفاں نے کنارے دیدیئے لیکن
مذاق نامرادی پر ہے رویا نا خدا برسوں
وہی جس نے محبت کی انا کو زندگی بخشی
وفا کی لاش کاندھوں پر لئے پھرتا رہا برسوں
کیا تھا دل سے ہم نے مشورہ ترک تعلق پر
رہا ہم سے جدا دل اور ہم دل سے جدا برسوں
بتا اے چشم تر! تو ہی بتا وہ آگ کیسی تھی
کہ دل بھیگا ہوا کاغذ تھا اور پھر بھی جلا برسوں
مرے جیسی ہی فطرت پائی تھی اس پھول نے شاید
اکیلا رہ کے بھی گلدان میں ہنستا رہا برسوں

○

☆

گفتگو کا بیان کا صدقہ
خوش کلامی زبان کا صدقہ
میرے مولا مجھے عطا کر دے
اس بلالی اذان کا صدقہ
مال و دولت نہیں فقط سر ہے
عشق کے امتحان کا صدقہ
ان امیروں کو کون بتلائے
مال و دولت ہے جان کا صدقہ
میرے بچوں کی مسکراہٹ ہے
سارے دن کی تکان کا صدقہ
شاہ سے کیا کنیز سے پوچھو
شاہزادے کی جان کا صدقہ
شکریہ، جی، جناب، زندہ باد
یہ ہے اردو زبان کا صدقہ

○

☆

تم نظر سے نظر ملاتے تو　　بات کرتے نہ، مسکراتے تو
اختلافات ہوتے رہتے ہیں　　آنا جانا تھا، آتے جاتے تو
چاندنی رات سسکیاں بھرتی　　تم ذرا اپنی چھت پہ آتے تو
بھولتے شوق سے ہمیں، لیکن　　بھولنے کا ہنر بتاتے تو
دوستی میں انا نہیں چلتی　　خود نہ آتے کبھی بلاتے تو
آ بھی جاؤ کہ ہم بلاتے ہیں　　تم بلاتے، جو ہم نہ آتے تو
مانا تم نے بہت کمایا ہے　　لیکن اس میں سے کچھ بچاتے تو
بزم میں دل نوازؔ ہو جاتے　　تم مرے شعر گنگناتے تو

..... ○ .....

☆

دشمنوں کی خبر بھی رکھئے گا
دوستوں پر نظر بھی رکھئے گا
سر پہ آنچل تو اوڑھ رکھا ہے
اپنے آنچل میں سر بھی رکھئے گا
ضِد، انا، تمکنت و خودداری
ان دِواروں[1] میں در بھی رکھئے گا
مشورہ ہے امیر زادوں کو
ہاتھ میں کچھ ہنر بھی رکھئے گا
چاہے رکنے کے سو ٹھکانے ہوں
لیکن اک اپنا گھر بھی رکھئے گا
وہ سفر آخری سفر ہو گا
کچھ متاعِ سفر بھی رکھئے گا
نیند آنکھوں میں چبھ بھی سکتی ہے
جاگنے کا ہنر بھی رکھئے گا

○

☆

بے نظیروں سے مل کے دیکھو تو
دست گیروں سے مل کے دیکھو تو
بادشاہت کو بھول جاؤ گے
ہم فقیروں سے مل کے دیکھو تو
بے اسیری پہ روؤ گے اپنی
تم اسیروں سے مل کے دیکھو تو
بے ضمیری تمہیں جھنجھوڑے گی
باضمیروں سے مل کے دیکھو تو
لوگ کہتے ہیں جن کو تقدیریں
ان لکیروں سے مل کے دیکھو تو
روشنی کے سفیر ہیں جگنو
ان سفیروں سے مل کے دیکھو تو
خود سمندر ہی جن کا دشمن ہو
ان جزیروں سے مل کے دیکھو تو

○

[1] دیوار میں ذرا سی تخفیف کے ساتھ

☆

وہ رلا کے ہنس نہ پایا دیر تک — جب میں رو کر مسکرایا دیر تک
خود بخود بے ساختہ میں ہنس پڑا — اس نے اس درجہ رلایا دیر تک
بھولنا چاہا کبھی اس کو اگر — اور بھی وہ یاد آیا دیر تک
بھوکے بچوں کی تسلی کے لیے — ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک
ناخلف بیٹے تو دردِ سر بنے — بیٹیوں نے سر دبایا دیر تک
اسم اعظم تھا کہ میرا شعر تھا — صوفیوں نے گنگنایا دیر تک
گنگناتا جا رہا تھا اک فقیر — دھوپ رہتی ہے نہ سایا دیر تک
کل اندھیری رات میں میری طرح — ایک جگنو جگمگایا دیر تک
چپکے چپکے میری غزلوں کو نواؔز — دشمنوں نے گنگنایا دیر تک

..... ○ .....

☆

ریت، پانی، ہوا مخالف ہے
سارا دریا مرا مخالف ہے
ناؤ کے بے عمل مسافر کا
ناخدا کیا، خدا مخالف ہے
پتھروں سے جسے بچایا تھا
اب وہی آئینا مخالف ہے
وہ مخالف ہے تو، تعجب کیا
حق کا باطل سدا مخالف ہے
وہ بظاہر تو دوست ہے لیکن
میرا سب سے بڑا مخالف ہے
منزلیں تو ہیں منتظر میری
کیا کروں رہنما مخالف ہے
میرے اعمال ہی کچھ ایسے ہیں
ورنہ تو کیا مرا مخالف ہے

○

☆

کس قدر تیرگی ہے آنکھوں میں
روشنی چبھ رہی ہے آنکھوں میں
دل میں غم ہے ہنسی ہے آنکھوں میں
رابطے کی کمی ہے آنکھوں میں
خواب ہی خواب دیکھتے ہیں، ہم
نیند ٹھہری ہوئی ہے آنکھوں میں
وقتِ آخر، یہ خود غرض دنیا
جانے کیا ڈھونڈتی ہے آنکھوں میں
میں تو خاموش ہوں مگر، میری
خامشی بولتی ہے آنکھوں میں
کچھ تو دھندلے ہیں میرے آئینے
اور کچھ گرد بھی ہے آنکھوں میں
تم سے حل ہو سکے تو حل کر دو
اک پہیلی چھپی ہے آنکھوں میں
ان کو دیکھا تھا خواب میں اک دن
آج تک روشنی ہے آنکھوں میں

○

شعروسخن کا آفتاب

مولانا محمود احمد خاں دریا آبادی

(بھارت)

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کرکے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کرکے دیکھ

تحریر کا آغاز اس شعر سے کیوں کیا گیا اس کی وجہ بھی آپ کے سامنے آجائے گی، ذرا صبر سے کام لیجئے، جلدی کاہے کی ہے۔

اس سے پہلے ہم نے کئی مشہور اردو تنقید نگاروں کے مضامین پڑھ رکھے ہیں مگر ہماری فہم ناقص یہ بات سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتی ہے کہ یہ نقاد صاحبان جب کسی اردو شاعر پر تبصرہ کرتے ہیں تو فرنگی زبان کے سخنوروں پر کیوں مشق ناز فرماتے ہیں، دراصل ان کی تحریروں میں گوئٹے اور کارلائل جیسے نام اور ان کے افکار واقوال بہت کثرت سے ہوتے ہیں (یہ مرعوبیت ہے یا قرب قیامت کی ایک نشانی؟ اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں) دوسری صفت ہمارے رائج الوقت قسم کے شعری ناقدوں میں یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ مثلاً دس شعر کسی شاعر کے نقل کریں گے تو ہر شعر کو نثر میں بھی الفاظ اِدھر اُدھر کرکے بیان فرمائیں گے، مثلاً یہی شعر۔

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کرکے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کرکے دیکھ

اس شعر کو نقل کرنے کے بعد اس کی نثر کچھ یوں بیان فرمائیں گے کہ ''مطلب یہ کہ بھیگے پروں سے ہی پرواز کا آغاز کرکے دیکھ انجام اس کے ہاتھ ہے۔''

اس انداز کی تحریروں سے مبصروں کو دو فائدے ہوتے ہیں۔

(۱) مضمون طویل ہوجاتا ہے، دو کے بجائے چار صفحات کا نظر آتا ہے (۲) جس شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنا ہوتا ہے اس پر دو صفحے کا مزید احسان لادنے کا موقع مل جاتا ہے (پڑھنے والوں پر یہ دھونس بھی ہوجاتی ہے کہ نقاد صاحب کی نظر عالمی ادب پر بھی ہے)

تو صاحبو! ایسے کمالات چونکہ بندے میں نہیں تھے اس لئے ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ کسی شاعر پر تبصرہ کیا جائے مگر کسی کے محبت بھرے اصرار پر اس امید کے ساتھ زیر نظر مضمون کا آغاز کردیا ہے کہ اللہ انجام بخیر فرمائے گا۔

درج بالا شعر دنیائے شعروسخن کے اس آفتاب کا ہے جس نے وادی فضل وکمال ''دیوبند'' سے نمودار ہوکر پورے ملک، برصغیر بلکہ ایشیا، یورپ وامریکہ تک میں اپنی روشنیاں بکھیری ہیں، اس نے ایک کمال یہ بھی کیا ہے کہ ۴=۲+۲ جیسے غیر شاعرانہ میدان یعنی کامرس کا طالب علم ہونے کے باوجود میدان شعروسخن میں بے مثال کامیابی حاصل کی، ساتھ ہی علماء دیوبند کی تاریخ بھی دو جلدوں میں تحریر کردی۔ اپنے البیلے شعری آہنگ اور انوکھے لب ولہجہ سے معمور ایک نعتیہ مجموعہ ''السلام السلام'' اور دو شعری مجموعے ''پہلا آسمان اور پہلی بارش'' بھی شائع کروائے۔

یوں تو ہر اچھا شعر سننے والے پر خمار طاری کردیتا ہے لیکن جب کسی اچھے شعر کو بہترین ترنم بھی مل جائے تو وہ شعر دوآتشہ ہوجاتا ہے، چنانچہ اچھے اشعار اور عمدہ ترنم کی وجہ سے ہمارے ممدوح نے پورے عالم میں برپا ہونے والے مشاعروں میں زبردست مقبولیت حاصل کی، گویا لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ آج کل ترنم چھوڑ کر تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں تب بھی وہ بے مثال مقبولیت برقرار ہے، بے پناہ مصروفیت اور عوامی مقبولیت کے باوجود انہوں نے پی ایچ ڈی کی پڑھائی مکمل کرکے ڈاکٹر کا خطاب بھی حاصل کیا، مزید یہ کہ ان کی سرپرستی میں بیس سے زیادہ تعلیمی ادارے بھی ملک کے مستقبل کی آبیاری کررہے ہیں، قوم کی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ان کی خصوصی ترجیح ہے۔

اس ملک میں وی آئی پی ہونا بذات خود اتنی بڑی کامیابی ہے کہ لوگ اس لال پری (لال بتی) کو حاصل کرنے کے لئے گدھے کو بھی باپ بنالیتے ہیں (ویسے یہ الگ بات ہے کہ کام نکل جانے کے بعد باپ کو بھی گدھا کہنے لگیں) مگر ہمارے ممدوح کا سب سے بڑا کمال (بلکہ کرامت) یہ ہے کہ انہوں نے بغیر چاپلوسی اور تملق کے اترپردیش اردو اکیڈمی کی سربراہی حاصل کی اور اس عہدے کا لطف دیر تک محسوس کرنے کے بجائے پوری دیانت داری کے ساتھ فرائض منصبی انجام دے کر عہدے کا حق بھی ادا کیا۔

پڑھنے والے بھی یہ سوچ رہے ہوں گے کہ واقعی کوئی ''نوسیکھیا'' ہے جس نے اتنی لمبی تمہید تو قلم بند کردی مگر اب تک اس باکمال اور بے مثال شخصیت کا نام نہیں بتایا جس کے اوصاف بیان کئے گیے۔ تو حضرات! وہ ہمہ جہت انسان بلند کردار، یار باش، خلیق، ملنسار، خوبصورت، پاک طینت شخصیت کا مالک ہے جن کو ساری دنیا ''نواز دیوبندی'' کے نام سے جانتی ہے۔ ہم جیسے کچھ بے تکلف انھیں ''ڈاکٹر نواز'' بھی کہتے ہیں، آج کی اس مجلس میں ناچیز آں موصوف کے ''شعری مزاج'' اور ان کے اشعار ''افعال وخواص'' پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہے۔

نواز کی شاعری صرف قافیہ پیمائی نہیں بلکہ عزم، حوصلہ، پیغام صلاح وفلاح، افکار کی بلندی، مقصد کی طہارت، البیلے رنگ وآہنگ اور مشرقی تہذیب کی ترجمانی، اسلامی ورثہ کی حفاظت اور مقصد کی پاکیزگی کی مثالیں ان کے کلام میں کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً۔

کلام اللہ جب سے پڑھ رہا ہوں
مری بینائی بڑھتی جارہی ہے

دینے کو تو دے سکتا ہوں میں بھی اسے گالی
لیکن مری تہذیب اجازت نہیں دیتی

گو وقت نے ایسے بھی مواقع ہمیں بخشے
ہم پھر بھی بزرگوں کے سرہانے نہیں بیٹھے

دیکھ تماشا میخواری کا
نالی میں میخوار پڑا ہے

میاں سجدے میں گر جاؤ دعائیں مانگ کر دیکھو
خدا کاغذ کے پھولوں میں بھی خوشبو بھیج دیتا ہے

ہم نے جو سادہ لوحی میں کھایا کوئی فریب
پھر وہ فریب اوروں کو کھانے نہیں دیا

مرے بچوں کی مسکراہٹ ہے
سارے دن کی تھکان کا صدقہ

ان کے کلام میں ایسی مثالیں بھی ملیں گی جن میں ملت اسلامیہ کو دعوت فکر وعمل نیز قوم کے نوجوانوں کو حیات جاوداں کا پیغام دیا گیا ہے۔

اب بھی بہت غرور ہے اک ہاتھ پر اسے
اک ہاتھ حادثے میں گنوانے کے باوجود

زندگی ایسی جیو تم دشمنوں کو رشک ہو
موت ایسی ہو کہ دنیا دیر تک ماتم کرے

مسجد لئے پھرو نہ شوالے لئے پھرو
سینوں میں دل حضور نہ کالے لئے پھرو

امن ضروری ہے لیکن
جنگ کی بھی تیاری رکھ

امیرو! کچھ نہ دو طعنے تو مت دو ان فقیروں کو
ذرا سوچو اگر منظر بدل جائے تو کیا ہوگا

نہ گھبراؤ اندھیروں سے اندھیری رات کا مالک
مسافر حوصلہ رکھیں تو جگنو بھیج دیتا ہے

یوں تو جدید غزل میں حالات حاضرہ اور عام زندگی کے سبھی مسائل بیان ہوتے ہیں مگر عہد قدیم میں غزل کو محبوب سے گفتگو، رندی وسرمستی، کیف وسرور، ہجر ووصال پر مشتمل جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا، اس کے لئے کچھ مخصوص تلمیحات واستعارات بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ نواز دیوبندی کے یہاں کلاسیکل غزل کے اشعار بھی ملیں گے۔

ہر صبح نئی لغزش ہر شام ہوئی توبہ
ہم ہوگئے پاکیزہ بدنام ہوئی توبہ

اب کے برس جو پیار کا موسم نہ آئے گا
باغوں میں بھی بہار کا موسم نہ آئے گا

تم کو جب مجھ سے تعلق ہی نہیں کوئی تو پھر
چھیڑتی کیوں ہے تمہارے نام سے دنیا مجھے

دیکھنے والوں نے دیکھا جلوہ فرمائی کے بعد
دائرے ابھرے فلک پر تیری انگڑائی کے بعد

درد آہیں خلش تڑپ آنسو
زندگی کوئی بددعا تو نہیں

تیری یادوں سے کھیلتے کب تک
تھک کے تکیئے پہ سوگئے آنسو

وقت کے ساتھ غزل کا سفر بھی آگے بڑھتا رہا، شاہد حقیقی ومجازی، گل وبلبل، رقیب روسیاہ، بہار وخزاں سے ہوتا ہوا حالات حاضرہ کی سنگلاخ وادیوں، تشدد، فسادات دھماکوں سے گزرتا ہوا بھوک، احتیاج، آٹا دال، چاول تک آپہنچا ہے، اب پرانی تلمیحیں، تشبیہات واستعارے بدل گئے ہیں، اب ان کی جگہ نئی علامتوں کا استعمال بلکہ ترقی پسندی کے نام پر براہ راست تخاطب سے بھی گریز کیا جارہا ہے۔ غزل کے مشہور شاعر مجروح سلطان پوری کا شعر

اب زمین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے
اب سنور کے نکلے گا حسن کارخانے سے

ندا فاضلی کہتے ہیں۔

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہوگئی

کسی شاعر کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

روٹی کے اک ورق سے سارے ورق روشن ہوئے
سالن کی اک پلیٹ سے چودہ طبق روشن ہوئے

نواز دیوبندی کی غزل بھی ان ہی راستوں سے گزری ہے مگر اچھی بات یہ رہی ہے کہ راستے کی تکان اور گرد سفر کے باوجود اس کی کیفیت اور اثر پذیری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میں نے ہوا کے شوق میں کھولی تھی کھڑکیاں
ساری گلی کا شور مرے گھر میں آگیا

خود مرگیا تھا جن کو بچانے کے واسطے
اب کے فساد میں وہی بچے نہیں رہے

یوں تو عام زندگی میں خودنمائی اور خودستائی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا مگر

شاعری میں تعلّی اور عزت نفس کے اظہار کو ہمیشہ ایک مستحسن صفت سمجھا گیا ہے۔ علامہ اقبال جیسے اسلامی مفکر کے یہاں بھی فلسفہ خودی کا تصور موجود ہے، دیگر شعراء کے کلام میں تو کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کا یہ شعر کس نے نہیں سنا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اب ذرا ڈاکٹر نواز دیوبندی کے یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حریفوں کا اپنے بھرم توڑ دینا
غزل ایسی لکھنا قلم توڑ دینا

اس آدمی سے بڑی تمکنت سے ملتا ہوں
جو عاجزی کو خوشامد سمجھنے لگتا ہے

جتنا بھی اڑ سکے اڑے بازو کے زور پر
ہم نے کبھی ہَوا پہ بھروسا نہیں کیا

نواز دیوبندی کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت خیال کی ندرت، فکر کی بلندی اور سہل ممتنع سے بھرپور اشعار ہیں، غالب کی زبان میں اگر کہا جائے تو ''سادگی و پرکاری سے خودی و ہوشیاری'' کی کیفیت نواز کے کلام میں ہے۔

صرف وہم وگماں سے ملتی ہے
جب زمیں آسماں سے ملتی ہے

درد بڑھتا گیا دواؤں سے
زندگی مل گئی دعاؤں سے

وہ اپنے گھر کے دریچوں سے جھانکتا کم ہے
تعلقات تو اب بھی ہیں رابطہ کم ہے

مرا ڈوبا نہیں شاید سفینہ
ابھی دریا میں طغیانی بہت ہے

جن میں گم ہوگئے مرے سائے
ان اجالوں کو آگ لگ جائے

میری غزلوں میں تو نمایاں ہے
اور ترا نام تک نہیں آتا

محبوب کی تعریف میں عموماً اس کی رنگت، ملاحت اور صباحت کا ذکر کیا جاتا ہے، ''سیاہ رو'' محبوب کا تصور کم از کم ایشیائی ممالک کے تو اجنبی رہا ہے، البتہ حافظ شیرازی ضرور اپنے ''سلونے'' محبوب کے عارض پر ایک تل کے صدقے میں سمرقند بخارہ جیسے دو عظیم شہر نچھاور کرنے کو تیار نظر آئے ہیں۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند وبخارا را

اب ذرا نواز دیوبندی کا یہ شعر دیکھئے۔

تذکرہ جب کہیں ہو رنگت کا
اس کو کالا گلاب لکھ دینا

اب فیصلہ کیجئے یہ شعر اتفاقاً ہوگیا ہے یا حافظ شیرازی جیسا ذوق نواز صاحب بھی رکھتے ہیں؟ آخر میں نواز دیوبندی کی ایک اور اہم خصوصیت کے بارے میں اشارہ کرکے بات ختم کرتے ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا کہ غزل میں عموماً عاشقی وسرمستی، ہجر و وصال سے متعلق خیالات نظم کئے جاتے ہیں، تاہم بہت سے شعراء نے غزل کے اندر حمد ونعت، پند ونصائح اور اقوال زریں کو بھی نظم کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ غالب جیسے رند بلانوش کا ان کے مخصوص انداز میں کہا گیا ایک شعر مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

اردو شاعروں میں ڈاکٹر اقبال، اصغر گونڈوی و دیگر شعرا کی غزلوں میں کثرت سے اس کی مثالیں ملیں گی۔ نواز دیوبندی بھی ماشاء اللہ دینی فکر کے حامل ہیں نیز ان کی تربیت اور ان کے قرب وجوار کے ماحول میں مذہبی پس منظر ہمیشہ نمایاں رہا ہے اس لئے ان کی غزلوں میں بھی عشق حقیقی، حمد باری اور نعت رسول کے والہانہ اشعار پائے جاتے ہیں جس سے ان کا کلام مزید معتبر اور پاکیزہ ہوجاتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

اولاً حق نے تخلیق جس کو کیا
سب کے بعد اس کا اظہار اپنی جگہ

طور پر لاکھ موسیٰ سے ہو گفتگو
عرش اعظم پہ دیدار اپنی جگہ

نہ دولت نہ شہرت نہ زر چاہتے ہیں
مدینے کا ہم تو سفر چاہتے ہیں

خدا سے نہ محشر میں شرمندگی ہو
غزل میں بھی ایسا ہنر

☆

حقیقت پسند شاعر

منظور عثمانی
(دہلی)

کثیر اور زبان زد معروف شعر ہے

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا
سرپھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا ہے

بات ہے بھی کافی حد تک درست کیوں کہ وطن میں مستقل رہنے سے ایک فرد کے سارے عیوب ومحاسن سب کے سامنے رہتے ہیں، اس لئے لونڈھیار پنے کی خطائیں اور لغزشیں بھی آپ کی خوبیوں پر اپنا عکس ڈالتی رہتی ہیں، پھر بڑے بزرگ (خصوصاً قصبات اور چھوٹی جگہوں پر) یوں بھی ہر چھوٹے کو بڑا نہ بننے دینے پر ہمیشہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ لاکھ فرماتے رہیں کہ ''بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال'' اس کے علاوہ اگر کسی کے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بڑا آدمی بن بھی جائے تو بھی یہ جملے تو اکثر کانوں میں پڑتے ہی رہتے ہیں'' میاں ہمارے سامنے کا چھوکرہ ہے، ڈنڈے بجاتا پھرتا تھا، ناک پونچھنے کی تو تمیز نہ تھی، بڑا بنا پھرتا ہے آج!'' اور کچھ نہ ہو تو اس کے باپ/چچاؤں کی کمیاں یا داغ دار ماضی اس غریب کے سر تھوپ دی جاتی ہیں، غرض ہر ممکن کوشش ہوتی ہے اس بے چارے کا قد گھٹانے کی کیوں کہ:

مسئلہ یہ بھی تو ہے دنیا کا
کوئی اچھا ہے تو اچھا کیوں ہے

لیکن اگر کوئی خوش نصیب اپنے ہی وطن میں بالاتفاق ہر چھوٹے بڑے کا چہیتا اور منظور نظر ہو تو اس کی بڑائی میں کوئی کلام نہیں۔ میں نے اپنی طویل زندگی میں دو افراد ایسے پائے جن کی شخصیات کبھی متنازعہ فی نہیں رہی، ایک کے بارے میں سنا اور دوسرے کو برتا ہے۔ پہلی شخصیت فقیہ الامت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی اعظم ہند اور مشہور زمانہ فتاویٰ دارالعلوم کے مصنف جو پوری دنیا میں نظیر اور حوالے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے اور جس کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق چھ لاکھ ہے۔ علمی عظمت کے علاوہ آپ کے بارے میں بھی سنا ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ حد تو یہ ہے کہ آپ کے والد محترم مولانا فضل الرحمٰن عثمانی تک آپ کی ولایت کے قائل تھے۔ دوسرے مولانا محمد اسماعیل عبدالحق مدنیؒ جو ابھی حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ مرحوم میرے ہم عمر اور خلیرے بھائی اور بہنوئی تھے، بچپن سے لے کر وفات تک آپ کی زندگی کا ادنیٰ سا بھی گوشہ ایسا نہیں تھا جس پر انگلی رکھی جا سکے، ایسے ہی لوگ واقعتاً فرشتہ صفت کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

نواز خاں دیوبندی بھی ایسے ہی نایاب انسان ہیں جن کے بارے میں کوئی ایسا بیان سننے میں نہیں آیا جو ان کی شخصیت کو مشکوک بناتا ہو، سب سے بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ وہ ہر دلعزیز ہے، بقول خود:

وہ اور ہوں گے جن کو وطن چھوڑنا پڑا
اپنے وطن میں رہ کے بھی عزت مجھے ملی

ملحوظ رہے کہ موصوف کی زندگی کا ایک ایک لمحہ تعلیم اور ملازمت سب وطن سے ہی وابستہ رہا ہے، بہت تیر مارا تو گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے سلسلہ میں مظفر نگر آتے جاتے رہے، وہ بھی صرف زیب داستان کے لئے لیکن دن میں چاہے کہیں رہے ہوں اٹھے ہمیشہ گھر کے ہی بستر سے (دیلی پینجر جو تھے) جنم بھومی سے لگاؤ کی انتہا تو یہ ہے کہ .PH.D کے لئے بھی موضوع ''دارالعلوم دیوبند کی صحافتی اور ادبی خدمات'' ایسا انتخاب کہ ''اپنی پیاری'' سے علیحدہ نہ ہونا پڑے، اس سے بڑا ثبوت اس کی بے داغ زندگی کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس کا پل پل جس سرزمین پر گزرا ہو وہ اپنے بدخواہوں کے لئے بھی طعنہ زنی کا کوئی پوائنٹ نہ چھوڑے، ایسے انسان کو وطن میں رہ کر بھی عزت ملے تو وہ اس کا جائز حق ہے۔ وسیم بریلوی نے سچ کہا ہے کہ ''نواز خوش قسمت ہیں کہ بھٹکنے کی عمر میں سنبھلنے اور بگڑنے کی عمر میں بننے کا شعور انھیں شروع سے ہی حاصل ہو گیا۔''

نواز خاں کھرے اور سولہ آنہ پٹھان ہیں، تن وتوش، قد اور وجاہت سے ہر طور سے کیا مجال کہ کسی کو ایک سکینڈ کو بھی شک ہو، خان صاحب جناب عبدالسبحان خاں کے فرزند ارجمند اور عمر دراز خاں مرحوم کے درازتر بھائی ہیں لیکن اپنے ممدوح کی خانیت یہیں آکر ختم ہو جاتی ہے، ان کے شب وروز کا اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ شیخ زادگان کے بیچ اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے گزرا ہے لیکن اس شخص نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ برا اثر ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ ''ہپ ہپ'' اور 'تھو، تھو' پر جتنا واثق ایمان اس کا ہے شاید ہی کسی اور دوسرے کا ہو، مثلاً شیوخ میں دن رات بیٹھنا ہے لیکن شیخی نام کو بھی نہیں بگھارتا پایا جائے گا (جب کہ جو اعزاز قدرت نے اسے بخشے ہیں اس پر شیخی کا مظاہرہ بے جا بھی نہیں ہوتا) لیکن وہ عجز وانکسار کا پتلا ہے، نواز سے زیادہ شیخی تو میرا عزیز حماد عثمانی بگھار لیتا ہے۔

عموماً پٹھانوں سے کچھ خصوصیات وابستہ ہیں، مثلاً جوش ملیح آبادی کے مطابق ''اصلی پٹھان اللہ میاں کی گالی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔'' (نعوذ باللہ) لیکن مردِ شریف نے یہ راہ نکالی کہ وہ کسی کو گالی دیتا ہی نہیں کہ کھانی پڑے (گو یہ خو بھی کسی خوخو کے لئے عموماً غیر فطری ہے)

دوسری خصلت خان صاحبان کے لئے یہ مخصوص بتائی جاتی ہے کہ وہ آتش گیر بلا کا ہوتا ہے۔ اپنے ایک دوست عبدالحق خاں ہیں، سابق پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ تو یہاں تک کہتے ہیں ''پٹھان اگر گالی نہ دے اور ذرا سی بات پر آپا نہ کھودے تو پٹھان نہیں'' ایک کسوٹی بھی کھرے کھوٹے پٹھان کے لئے بتاتے ہیں

کہ ''چوبارے پر کھڑے خاں صاحب کو نیچے کھڑے ہوکر اگر للکارا جائے تو حریف کومنہ توڑ جواب دینے کے لئے اصلی پٹھان کبھی زینے سے نہیں آئے گا بلکہ اوپر سے ہی چھلانگ لگادے گا۔ دروغ برگردن جوشؔ (عبدالحق خاں) لیکن نواز خاں اس قدر یخ بستہ خاں ہیں کہ سرگرمی کے معاملہ میں میرے دوسرے عزیز (قاضی انوار) بھی ان سے بازی لے جاتے ہیں، گویا شیخ زادگان میں رہ کر پٹھانی سے ہی ہاتھ دھوبیٹھا۔ (مراد اہلیہ سے ہرگز نہیں)

نواز خاں، خاں ضرور ہیں پر اپنے نام کے ساتھ خان کا پن چھلّا لگانا بھی ضروری نہیں سمجھتے، صرف ''نواز دیوبندی'' لکھنے پر ہی اکتفا کرجاتے ہیں۔ اصلی خان کی تو نام کے آگے پیچھے خان لگا کر بھی سیری نہیں ہوتی، بات دراصل یہ ہے کہ نواز نے 'دیوبندیت' کی اصل روح (روحانیت) استغناء اور فقر کو اپنے اندر اتارلیا ہے، ایسی استغناء صبر وشکر، انکسار اور للّٰہیت تو ان لوگوں میں بھی نہیں پائی جاتی جس کا دم دیوبندیت کے نام لیوا اٹھتے بیٹھتے بھرتے رہتے ہیں۔ نواز جب درج ذیل شعر میں اپنی قلندریت کا برملا اعلان کرتے ہیں تو اس میں تعلّی نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار اور انکساری کا اعتراف کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

میں قلندر ہوں بہرطور یہ سچ ہے لیکن
یہ تصور ہی قلندر نہیں ہونے دیتا

بلاشبہ نواز صاحب طرز اور مقبول شاعر ہیں، پر وہ ہوا باز قسم کے شاعر نہیں ہیں، وہ اپنے اردگرد سے آگاہ ہی نہیں بلکہ بقول راحت اندوری ''انھیں اپنے عہد کے تمام سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور شعری تقاضوں کا عرفان ہے۔'' ان کی سوچ میں وسعت اور فکر میں گہرائی ہے، ایسی ہی خصوصیات کا حامل اس قسم کا شعر کہہ سکتا ہے:

اس مہ جبیں کے نام نہ اس جل پری کے نام
جی چاہتا ہے گیت لکھوں زندگی کے نام
گنگناتا جارہا تھا اک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک
بھائی سے بھائی کے کچھ تقاضے بھی ہیں
صحن کے بیچ دیوار اپنی جگہ
ٹھہرے ہوئے قدموں سے سفر سر نہیں ہوتا
ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر نہیں ہوتا
خوابوں کے شوق میں کہیں آنکھیں گنوا نہ دیں
ہم سو رہے ہیں نیند نہ آنے کے باوجود
اسی کا مال تو بکتا ہے اس زمانے میں
جو اپنے نیم کے پتوں کو زعفران کہے

سچ تو یہ ہے کہ مجھے نواز دیوبندی کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا بھی نہیں، بھلا جو شاعر اپنی نادرالخیالی، منفرد ڈکشن اور قادرالبیانی کی وجہ سے منوّر رانا، پروفیسر راحت اندوؔری، پروفیسر وسیمؔ بریلوی، پروفیسر انور جلال پوؔری اور پروفیسر بشیر بدر جیسے مستند تخلیق کاروں کا پسندیدہ شاعر ہو اس پر مجھ جیسے 'ناشاعر' کا اظہار خیال چھوٹا منہ بڑی بات ہی کہلائے گی۔ چند شعر نقل بھی اس لئے کرنے پڑے کہ اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر جو دس ہزار منتخب اشعار چار کتابوں پر مشتمل ہے میری نظر میں اس کے کلام میں موزونیت، تنوع اور تخلیقی کیفیت ہے جو شاعر کو شاعر بناتی ہے۔

بقول انور جلال پوری، ''نواز دیوبندی کی شاعری میں انسانی فطرت کی کمزوریوں اور اس کے نفسیاتی گہرے مشاہدے کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔''

یوں تو درج بالا معتبر شاعروں نے نواز کی شاعری کو دل کھول کر سراہا ہے لیکن منوّر رانا کی رائے کو میں سب سے زیادہ وقیع گردانتا ہوں کیوں کہ وہ واحد حق گو شاعر ہے جو لگی لپٹی کہنے کا عادی نہیں۔ ان کے چند اقتباسات کے بعد ان کی شاعری سے متعلق بات کو ختم کروں گا۔

''اگر غزل میں سچ بولنا، اپنے عہد کی سفاک حقیقتوں کی مصوری کرنا، سیاسی گنگھروؤں کی جھنکار کو قلم بند کرنا، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو غزل بنا دینا، سماجی بے رحمیوں کا اظہار کرنا اور تعصبات کی لکھوریوں سے لپٹی ہوئی مٹی کو بزرگوں کی یادگار سمجھ کر چہرے پر ملنا مشکل کام ہے تو یقیناً نواز ایک اچھے، خوش نصیب اور سعادت مند شاعر ہیں۔ لہجے کی سادگی ان کا سرمایہ ہے، وہ اپنی تلخ یادوں کو غزل کی شیرینی سے الگ نہیں ہونے دیتے، زندگی کے کھردرے چہرے پر جب وہ اپنے نرم لہجے اور فن کاری کا روغن مل دیتے ہیں تو ان کی غزل جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔'' انہوں نے غمِ زمانہ کو یتیم خانے سے لائے ہوئے بچے کی طرح نہیں بلکہ اپنے بچے کی طرح پالا ہے، نواز قلم کو تلوار اور تلوار کو قلم بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔''

کامیاب اور حقیقت پسند شاعر

یہ حقیقت ہے کہ جیسا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ ''مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی تکلف یا تردد نہیں کہ مشاعرہ ہی میری شناخت ہے اور میری مقبولیت کا ذریعہ بھی۔'' لیکن میری رائے میں مشاعرہ ہی اس کی پہچان اور مقبولیت کا واحد ذریعہ نہیں، آپ اپنی چند صلاحیتوں کی بنیاد پر عظمت وشہرت کی بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں لیکن وہاں کے ٹکنے کے حقیقت پسندی، ذہنی سلامتی، عجز انکساری، ظرف (سمائی) اور صبر وشکر بھی انتہائی ضروری ہے۔ مالک دیتا ہے تو اپنے بندے کو تو اس کا شکر بھی لازم ہے، خاک کے پتلے کو خاکساری ہی زیب دیتی ہے ورنہ

جن میں ہوجاتے ہیں انداز خدائی پیدا
ہم نے دیکھا ہے وہ بت توڑ دیئے جاتے ہیں

خدائے سخن میر تقی میرؔ نے کہا تھا کہ

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آیا ہے دیواروں کے بیچ

حالیہ شعری پس منظر میں منفرد چہرے ایسے مل جائیں گے جن کا عروج کسی نوٹنکی، نعرے بازی، توڑ جوڑ اور گروہ بندی کا مرہون منت ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عزت اور ذلت سب اس مالک کے ہاتھ ہے، خالق کی مرضی کے بنا کیسے کیسے ناموروں کو اپنی زندگی میں ہی گمنا ہوتے دیکھا ہے، اس کی زندہ مثال بشیر بدر ہیں، یہ دنیا تو عبرت کی جا ہے، کبر تو اس کبیر ہی کو زیب دیتا ہے۔

شہاں! کہ کہلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
ان ہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

یہ نواز کی ذہنی تربیت اور دینی ماحول کا ہی نتیجہ ہے کہ اس نے عجز اور انکساری کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا، اس کے قول اور فعل میں کسی طرح کا تضاد نہیں، اس کے پہلے مجموعہ کلام ''پہلا آسمان'' کے ابتدائیہ حمدیہ ونعتیہ دو اشعار دراصل اس کی اصل زندگی کا آئینہ ہیں۔

بھرپور شکر میں ہی ادا کر نہیں سکا
اس نے نوازنے میں تو کوئی کمی نہ کی

اور

اُنؐ کے نقش قدم پہ چلنے سے
منزلیں ٹھوکروں میں رہتی ہیں

محمد نواز کو اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں خوب خوب نوازا ہے، اس ذات باری نے اس کی ابتدائی مشکلات، جدوجہد کو آج اپنے فضل وکرم سے راحتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اہالیان دیوبند کو بخوبی علم ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود اس مرد میدان نے مردانہ وار اپنے مستقبل کو سنوارنے کی کس طرح کوشش کی ہے اور لطف یہ بھی کہ اس نے کبھی ع

تھک کر کسی کاندھے پہ بھی سر نہیں رکھا

آج ماشاء اللہ اپنے بل بوتے پر کامیابی کے اس شکھر پر ہے جہاں فخر سے اپنے ماضی کو یاد کر کے پوچھ سکتا ہے کہ

یہ پھول کوئی مجھ کو وراثت میں ملے ہیں؟
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

مستقبل کی سب سے ٹھوس بنیاد

مشاعروں کی دنیا میں نواز کی دھماکہ خیز انٹری اور بین الاقوامی گھن گرج کے شورِ بے پناہ میں انجان لوگوں کی اس ان خصوصیات تک رسائی ہو ہی نہیں پاتی جسے اس کی دائمی شہرت کی بنیاد بننا ہے، گو آج نشر واشاعت کے تحریر سے کہیں زیادہ مؤثر وسائل ویڈیو ریکارڈنگ اور کیسٹ وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں لیکن جس لائن کو خاموشی کے ساتھ وہ بہت پہلے اختیار کر چکا ہے وہ ہے فروغ تعلیم، یہی وہ فیضان ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں، اس راستے پر نواز خاں پہلے ہی اچھا خاص لمبا سفر طے کر چکے ہیں، مسلم فنڈ کی زیر نگرانی مالیات کے علاوہ تعلیم کے سلسلہ میں اچھی خاصی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، کئی ادارے جو قوم کی خدمت میں مصروف ہیں (دیکھئے مولانا حبیب صدیقی صاحب کے بارے میں ان کی تعلیمی خدمات) ان ہی تعلیمی اداروں میں ایک بہت مفید ادارہ مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہے جس سے ہر سال 125 طلبہ فارغ ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ 181 میں قائم کیا گیا تھا۔ نواز خاں صاحب اس کے ڈائریکٹر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مولانا حبیب صدیقی کی تعلیمی سرفرازیوں میں نواز قدم قدم پر ان کے دست راست کے طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ نواب عظمت علی خاں ٹرسٹ کے تحت ایک چھوٹا موٹا گرلز اسکول مظفر نگر میں قائم تھا، 2003ء میں نواز خاں اس کے منیجر کیا بنے کہ اس کے دن ہی پھر گیے، نواز کی کامیابی اور اس کے رسوخ کا منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ انتہائی کم عرصے یعنی 2005ء سے یہ نیک نام گرلز ڈگری کالج بن گیا ہے، جس میں مختلف مضامین (Streams) ہیں، اسی ٹرسٹ کی آمدنی سے ایک Vocational Institute اور english Medium پرائمری گرلز بھی عوام کی سیوا میں پیش پیش ہے، مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ طالبات کی تعداد 5000 سے اوپر ہے۔

نواز نے اپنے خوابوں کی تعبیر کی خاطر خود اپنے ذاتی وسائل سے ایک نرسی اسکول دیوبند میں قائم کیا جو مختصر سے عرصہ میں نواز گرلز سکینڈری پبلک اسکول کی صورت میں قوم کی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کر رہا ہے، اس اسکول کی قطعی نادر حیثیت یہ ہے کہ C.B.S.E سے منظور شدہ ہے اور جلد ہی سینئر سکینڈری بھی بننے والا ہے، انشاء اللہ۔ کہتے ہیں کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، چنانچہ مختلف مقامات میں 22 اور دوسرے اسکول اور ادارے ہیں جو نواز خاں کے تجربوں، رہنمائی اور مفید مشوروں سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ شاعر کی طرح تعلیم داں کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے نواز دیوبندی یوپی اردو اکیڈمی کے چیئرمین ہیں، ان سے پہلے یہ اکیڈمی بس نام چارے کو ہی تھی، لیکن اکھلیش سرکار نے اس سمت دلچسپی دکھاتے ہوئے دو معروف اردو شعراء منور رانا اور نواز دیوبندی کو سربراہی کے طور پر انتخاب کیا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر رانا صاحب نے جلد ہی کنارہ کر لیا۔ آج نواز ہی اس کے چیئرمین ہیں اور اردو کے فروغ کے ہمہ وقت کوشاں ہیں، یہاں بھی ان کا خاص زور اردو زبان وادب کی توسیع پر ہے، حال ہی میں آپ نے ایک اردو اسٹڈی سرکل کی تشکیل کی ہے جو I.A.S. اور دوسرے مقابلہ جاتی امتحانوں کی تیاری کراتی ہے، شروع میں یہ اسکیم صرف یوپی کے باشندوں کے مخصوص تھی لیکن ان کی کوششوں سے ملکی پیمانے پر اب سارے اردو داں اس سے بہرہ وہ ہو سکتے ہیں۔ بورڈ کے امتحانات میں اردو طلباء کی حوصلہ افزائی کے امتیاز پانے والوں کو Award دیئے جانے کا بھی اکیڈمی نے بندوبست کیا ہے، اس میں ایک اور جدت یہ پیدا کی گئی ہے کہ اساتذہ کی بھی حوصلہ افزائی کے ایک اور انعام ''فخرِ تدریس'' کے نام سے اضافہ کیا گیا ہے۔ امید ہے نواز کی فعال رہنمائی میں اکیڈمی جلد ہی وہ مقام پالے گی جس مقصد کے ان اکیڈمیز کی تشکیل ہوئی تھی۔

نواز خاں کی ترقی، عروج اور حوصلہ مندی میں ان نامساعد حالات کا

بڑا ہاتھ ہے جو اسے ابتدا میں حصول تعلیم کے جھیلنی پڑیں، حوصلہ مند لوگوں کے شروع کی محرومیاں مہمیز بن جاتی ہیں، اسی طرح کی تابندہ مثال اپنے وطن کے ہی دیدہ ور شخصیت پروفیسر عتیق احمد صدیقی کی ہے جسے گھریلو حالات کی تنگی کے کارن گیارہویں جماعت سے تعلیم منقطع کر کے وطن اور اسکول کو خیر آباد کہنا پڑا تھا لیکن جو بلند ہمت سے مالی (Gardner) پروفیسر اور ڈین تک ترقی کی، مرحوم میرا گیارہ سال تک دوست اور ہم جماعت رہا (دیکھئے اسی کتاب میں شامل مضمون ''آخری صف بھی چراغوں کی بجھا چاہتی ہے'') اس مرحوم کا بھی فروغ تعلیم میں انہاک اس درجہ کا بھی کہ اس نے تو واقعتاً علم کی دیوی کے قدموں پر جان ہی نچھاور کردی، حق مغفرت کرے، وہ مرحوم بھی نواز ہی کی طرح نہایت راسخ العقیدہ، عاجز اور منکسر المزاج اور دین دار تھا، صحیح معنوں میں دیوبندیت کا سچا پیروکار، مرحوم حافظ تھا، کلام اللہ کو اپنے ذہن ودل میں اس طرح محفوظ رکھا کہ پروفیسر اور ڈین ہونے کے باوجود آخر تک تراویح سناتا رہا، میں خود شاہد ہوں کہ ملک بھر میں بطور تعلیم داں وہ کس قدر معروف تھا۔ یوپی رابطہ کمیٹی کا جنرل سکریٹری تھا، تعلیم ہی کے سلسلہ میں ایک ایکسیڈنٹ میں اس کا انتقال ہوا، اس کی موت پر سید حامد نے فرمایا تھا۔ ''اس کے نہ ہونے سے میرا تو داہنا بازو ہی ٹوٹ گیا۔''

مشاعروں کی دنیا میں نواز کی شہرت عالمگیر پیمانے پر ہے، دسیوں بیرونی ممالک میں وہ اپنی بلند وبالا شخصیت کا لوہا منوا چکا ہے، یقین ہے ملک کے تعلیمی افق پر بھی اس کا ستارہ اسی آب وتاب سے چمکے گا، انشاءاللہ۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے اور اس کے تعمیری عزائم اسی طرح فروغ پاتے رہیں، آمین۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

غزلیہ شاعری میں عصری مسائل

موجودہ صدی کے عالمی شہرت یافتہ شاعر اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری میں روایت کا رنگ غالب ہے تاہم وہ جدیدیت کی نئی آن بان کو بھی قبول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اضطراب انگیز زمانے کے نشیب وفراز رنگ وخوشبو کے ساتھ ملتے ہیں۔ ان میں جمالیاتی احساس اور عصر حاضر کی گداختگی کی گہرائی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے پاس تجربے کی وسعت ہے، اسی لئے ان کے کلام میں نئے پن کی چمک نئی پرتوں کو دریافت کرتی ہیں۔ ان کے ہاں لاشعور کی تاریک گہرائیاں ضرور ہیں لیکن شکستہ پیکر منور پر چھائیاں رکھتا ہے۔ یہ تشکیلی کارفرمائی دیدۂ باطن کو وا کرنے پر ہی ممکن ہے جس کے اندر سے فضا آفرینی کی حقیقت اُگتی ہے اور برقی جلوؤں کی تنزیل سامنے آتی ہے۔ نواز دیوبندی (اصل نام محمد نواز خاں) کا وطن دیوبند ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''پہلا آسمان'' اور ''پہلی بارش'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ''السلام، السلام'' اور غزلوں کا مجموعہ ''تیرے آنے کی جب خبر مہکے'' (اردو اور دیوناگری خطوط میں) زیرِ اشاعت ہیں۔ انھوں نے ''سوانح علمائے دیوبند'' جیسی وقیع کتاب دو جلدوں میں ترتیب دی ہے جو پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ تقریباً پچیس اسکول اور کالجز ان کی نگرانی میں کارکرد ہیں۔ یوپی اردو اکاڈمی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ اپنے دور میں آئی اے ایس کی کوچنگ کی ابتدا انھوں نے کی جس سے طلبا میں مسابقتی جذبہ بیدار ہوا۔ دنیا کے تقریباً انیس ممالک میں انھوں نے مشاعرے پڑھے ہیں۔ ان کی اصل شہرت مشاعرہ سے ہی ہے۔ عوام وخواص دونوں میں ان کی شاعری مقبول ہے۔ ان کی بعض غزلوں کو معروف غزل سنگر جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دی ہے۔ ان کے اشعار پارلیامنٹ میں سیاست دانوں کی تقریروں میں بھی حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ کریں۔

گاؤں کی تہذیب کی اب پاسداری چھوڑ دی
شہر میں رہنے کی خاطر خاکساری چھوڑ دی
اب بھی بہت غرور ہے اک ہاتھ پر اسے
اک ہاتھ حادثے میں گنوانے کے باوجود
رموزِ چشمِ گریاں سے جو شبنم کی ہوئے واقف
سحر ہونے سے پہلے وہ ستارے ڈوب جاتے ہیں

ڈاکٹر امام اعظم

شاعرِ فکر وفن

ڈاکٹر ایس وائی قریشی
(دہلی)

ہندوستان کی آزادی کے بعد دبستان دیوبند کی شادابی کو دوبالا کرنے کے لئے اردو شاعری کے افق پر ایک ایسا شاعر نمودار ہوا جس نے اپنی آفاقی شاعری سے دنیائے ادب پر انمٹ نقوش مرتب کئے ہیں۔اس صاحب بیان شاعر کو دنیا نواز دیوبندی کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔نواز دیوبندی اپنے منفرد لب ولہجہ اور مخصوص اندازِ بیان کے حوالے سے پوری اردو دنیا میں معروف ہیں۔

بلاشبہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ اور ہمارے قدیم سماجی اور معاشرتی اقدار کی بقاء اور تحفظ میں مشاعروں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے ذریعہ ہندوستانی اقدار کی پاسداری کرنے والے شعراء کی فہرست میں ایک اہم اور معتبر نام ڈاکٹر نواز دیوبندی کا ہے۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔وہ بڑے پرگو شاعر ہیں اور ان کے ادبی شغف اور شعری انہماک کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ قومی، بین الاقوامی اور عالمی مشاعروں نیز شعری نشستوں میں ان کا کلام بڑے ذوق وشوق سے سنا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ جس شاعر کی شعری زندگی کم وبیش چالیس سالوں پر محیط ہو اس کی کہنہ مشقی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

وہ بڑے پائے کے شاعر تو ہیں ہی ساتھ ہی وہ بڑی پرکشش اور نفیس طبیعت کے بھی مالک ہیں۔منکسر مزاج اور دین پسند اور مذہب پرست بھی ہیں۔جس کا پرتو ان کی شاعری میں جا بجا واضح طور پر نظر آتا ہے۔کسی بھی مشاعرے یا شعری نشست میں ان کی شرکت اس مشاعرے یا نشست کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ان کا کلام زبان زدِ خاص وعام ہے۔لوگ اکثر محفلوں اور تنہائیوں میں ان کے اشعار گنگناتے رہتے ہیں۔

نواز صاحب کی غزلوں میں ہمیں کئی رنگ ملتے ہیں جہاں ایک طرف ان کے یہاں چھوٹی بحر کی غزلیں زبان وبیان کے اعتبار سے سہل ممتنع کا اچھا نمونہ ہیں وہاں دوسری طرف بڑی بحر کی غزلوں میں موسیقیت اور خوش آہنگی کمال درجے کی پائی جاتی ہے۔فن اور فکر دونوں اعتبار سے ان کے یہاں بڑا رچاؤ اور پختگی پائی جاتی ہے۔ان غزلوں میں آپ کو قدیم روایت کا احترام بھی ملے گا اور عصر جدید کی برائیوں سے احتراز بھی۔ ان کی شاعری میں ان کی نظموں اور غزلوں میں انسانی جذبات و احساسات کی حساسیت بھی ہے خیالات کی پاکیزگی اور فکر کی تازگی بھی۔یہ اشعار پڑھئے اور لطف لیجئے:

فریب کھائے شریک سفر سے وہ ہم نے
کہ اپنے جسم کی پرچھائیوں سے ڈرتے ہیں
ہمارے دور کی نادانیاں تو مخلص ہیں
ہم اپنے دور کی دانائیوں سے ڈرتے ہیں

انھوں نے اپنی زندگی میں عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا،لیکن انھیں کامل سیاسی شعور حاصل ہے اور وہ ملک کے سیاسی نشیب وفراز سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں سیاسی رہنماؤں کی غلط حرکتوں پر شائستہ انداز میں نکتہ چینی کرتے ہوئے انھیں سچائیوں اور اچھائیوں کا آئینہ بھی دکھایا ہے۔

یہی نہیں ان میں کمال کی جرأت اور بے باکی بھی ہے وہ نہایت صداقت،سچائی،اور حق گوئی سے سیاسی مسائل کو آسان لفظوں میں نہایت پرکشش اور دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ملک وملت کے ذمہ داروں،منصفوں، قائدوں اور رہبروں کو ان کا فرضِ منصبی بھی یاد دلایا ہے۔وہ کہتے ہیں:

آج تک نہ جانے کس کشمکش میں ہیں منصف
بحث روز سنتے ہیں فیصلہ نہیں دیتے
موسموں کی سازش سے پیڑ پھل تو دیتے ہیں
نفرتوں کے پھل لیکن ذائقہ نہیں دیتے

ملاحظہ فرمائیں:

زخم کا مرہم درد کا اپنے درماں بیچ کے آئے ہیں
ہم لمحوں کا سودا کر کے صدیاں بیچ کے آئے ہیں
بکنے پر جب آ ہی گئے تھے اونچے مول تو بکتے ہم
ہم کو ہمارے رہبر لیکن ارزاں بیچ کے آئے ہیں

نواز دیوبندی صاحب مشاعروں کے بھی مقبول اور پسندیدہ شاعر ہیں۔انھیں قومی، بین الاقوامی اور عالمی مشاعروں میں بڑے چاؤ سے سنا جاتا ہے۔ملک وبیرون ملک کے بڑے بڑے عالمی مشاعروں میں اکثر مدعو کیا جاتا ہے۔وہ اپنے سامعین کو اپنے منفرد سادہ تصنع اور بناوٹ سے پاک انداز بیان، مترنم لب ولہجہ اور مخصوص طرزِ کلام سے محظوظ کرتے ہیں۔ان کی ہر دل عزیز مقبولیت نے انھیں عالمی شہرت عطا کی ہے۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی ہندوستانی تہذیب وثقافت کے نہ صرف پاسدار ہیں بلکہ اس کے زبردست علمبردار بھی ہیں۔وہ اسلامی اقدار اور اسلامی شعار کے بھی دلدادہ ہیں۔اس کی پامالی ان کی طبیعت کو گراں گزرتی ہے اور اس قدر شدید صدمہ پہنچتا ہے اس کی بازیابی کے لئے وہ بے قرار ہو کر تڑپنے لگتے ہیں،اور پھر وہی تڑپ، درد اور سوز وگداز شعری پیرائے میں ڈھل جاتے ہیں اور سامعین کے دلوں پر سیدھا اثر کرتے ہیں۔ان کے اشعار میں لوگوں کو اپنی آپ بیتی نظر آتی ہے۔

نواز صاحب ظاہری طور پر رند اور قلندر نظر آتے ہیں لیکن وہ نہ رند

ہیں اور نہ قلندر۔ مگر ان کے مزاج اور شخصیت میں رندی اور قلندری کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ جس کی نمایاں جھلک ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ ان ہی جیسے افراد کے بارے میں مولانا الطاف حسین حالؔی نے کہا تھا:

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا

نواز دیوبندی کی شاعری، رخ وگیسو، گل وبلبل، ہجر ووصال کا افسانہ نہیں ہے، بلکہ حالاتِ حاضرہ کا تازیانہ ہے۔ ان کی غزل میں موجودہ عہد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل کا تجزیہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ ان کا سیاسی، سماجی اور ملی شعور اس قدر پختہ ہے کہ اگر کوئی پارکھی چاہے تو ان کی شاعری سے اس عہد کی پوری عکاسی کرسکتا ہے۔ ان اشعار کی صداقت دیکھیں:

کہیں جب روٹیاں تقسیم ہوتی ہیں غریبوں میں
رئیسِ شہر بندر اور ترازو بھیج دیتا ہے
جسے میں پھول بھجواتا ہوں تحفے میں نوازؔ اکثر
وہ جانے کیوں مجھے بدلے میں چاقو بھیج دیتا ہے

انھوں نے اپنے عہد کے مسائل، اور اچھوتے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا جس میں شاعری کا پورا فنی حسن اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی شعر گوئی میں فنی تقاضوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ان کے اشعار نہایت بہترین پیرائے میں بیان کیے گیے ہیں۔ نواز دیوبندی نے عہدِ حاضر کی وحشت ناکیوں اور ستم ظریفیوں کو غزل کا پیکر عطا کرکے اردو شاعری کو پُر درد غزلوں کا ایک قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ ان کی تڑپ اور دل کی سوزش ان اشعار میں دیکھیں:

بس دل لگی کی بات تھی تم دل پہ لے گیے
شکوہ مری زبان پہ تھا دل میں کچھ نہ تھا
طوفاں میں اضطراب بھی تھا زندگی بھی تھی
موجوں میں کائنات تھی، ساحل میں کچھ نہ تھا
قاتل کی کج ادائی پہ قربان ہو گیے
ورنہ حضور ! بازوئے قاتل میں کچھ نہ تھا

ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری میں جہاں تمام فنی لطافت موجود ہے وہیں ان کی شاعری کی زبان نہایت ہی صاف ستھری اور روز مرہ کی عام فہم بول چال پر مشتمل ہے۔ ان کی اس سہل نگاری نے ان کی پوری شاعری کو سہل ممتنع کے حدود میں داخل کردیا ہے۔ محض الفاظ کے الٹ پھیر سے جو معنی خیز اشعار بنانے کا ہنر وکمال دکھایا ہے ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

اک ہم ہیں کہ غیروں کو بھی کہہ دیتے ہیں اپنا
اک تم ہو کہ اپنوں کو بھی اپنا نہیں کہتے
بن جائے اگر بات تو سب کہتے ہیں کیا کیا
اور بات بگڑ جائے تو کیا کیا نہیں کہتے

خیالات کی پاکیزگی، فن کی پختگی، زبان کی صفائی ستھرائی اور دردمندانہ انداز بیان نے ان کی شاعری کو سحر کی حد تک پر اثر بنا دیا ہے۔ ان کے بہت سارے اشعار ان کی زندگی میں ہی اس قدر مقبول ہوئے کہ ضرب المثل بن گیے اور زبان زد خاص وعام ہیں۔

وہ رلا کر ہنس نہ پایا دیر تک
رو کر مسکرایا دیر تک
بھوکے بچوں کی تسلی کے لئے
ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک
گنگناتا جا رہا تھا اک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک

وہ مذہب پسند، اسلام دوست، پیغمبر اسلام کے شیدائی، اہل بیت کے عاشق ہیں اور بزرگان دین سے سچی عقیدت رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ مذہبی عقیدت مندانہ جذبات سے پُر ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کلام اللہ جب سے پڑھ رہا ہوں
مری بینائی بڑھتی جا رہی ہے

یا یہ شعر دیکھیں:

گناہ گار تو ایسے تھے ہم کہ بس توبہ
خدا کریم نہ ہوتا تو مر گئے ہوتے

یا یہ اشعار:

نہ دولت نہ شہرت نہ گھر چاہتے ہیں
مدینے کا ہم تو سفر چاہتے ہیں
خدا سے نہ محشر میں شرمندگی ہو
غزل میں بھی ایسا ہنر چاہتے ہیں

انھیں انسانی عظمت کا شدید احساس ہے۔ وہ انسانوں کے مابین اتحاد واتفاق کی اہمیت کا سچا شعور رکھتے ہیں اور اس پر برابر زور بھی دیتے ہیں۔ عظمت انسان کا احساس اور اعترافِ آدمیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ستم گر وقت کا تیور بدل جائے تو کیا ہو گا
مرا سر اور ترا پتھر بدل جائے تو کیا ہو گا
امیرو! کچھ نہ دو طعنے تو مت دو ان فقیروں کو
ذرا سوچو اگر منظر بدل جائے تو کیا ہو گا

وہ ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ مشکل زمینوں اور کم مروج بحروں میں بے ساختہ اشعار کہنا ان کے لئے مشکل نہیں ہے۔ برجستگی، روانی اور بے تکلفی ان کے انداز بیان کے بنیادی اجزاء ہیں۔ چھوٹی بحروں کی جانب ان کا جھکاؤ زیادہ ہے۔ مگر طویل بحروں اور مشکل زمینوں میں بھی عمدہ اشعار کہے ہیں۔

باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ کیجیے

غزل اور اخلاقیات کا شاعر

ڈاکٹر رضوان انصاری
(لکھنؤ)

اردو شعروادب کا مزاج روز اول ہی سے سیکولر رہا ہے۔اس میں عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، اودھی، تلگو، پرتگالی، جاپانی اور پنجابی وغیرہ وغیرہ ملکی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ محاوات کے اثرات اور موضوعات سے استفادہ کی حقیقت کسی بھی صاحب علم ودانش سے مخفی نہیں، اس رواداری اور حقیقت پسندی سے ممالک غیر کی بہت سی زبانوں بالخصوص مغربی زبان وادب کے اثرات کو بھی اردو زبان وادب نے قبول کرنے میں دریغ نہیں کیا جس سے زبان کو بڑی مقبولیت اور وسعت حاصل ہوئی یہی سیکولر ذہنیت اور تخلیقی مزاج نے بیسویں صدی کے آٹھویں دہائی کے نسل نو کو خاص طور سے ادب کو نئے رخ کی جانب موڑنے کا شعور عطا کیا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آخری دوعشرے کے پروردہ شعراء میں ایک منفرد لب ولہجہ اور اخلاقیات کا شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی بھی ہے۔جس کی شاعری نے نئی نسل کو متاثر کیا اور عصری شعراء کو اخلاقیات پر فکر شعر کے لئے ذہن دیا ہے۔ان کا ادبی اور تخلیقی سرمایہ اردو زبان میں قابل قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی کا تعلق عالمی شہرت یافتہ دینی درسگاہ کے شہر دیوبند سے ہے ان کے والد عبدالسبحان نے قرآن حکیم اور ابتدائی تعلیم کے لئے مکتب اصغریہ میں داخلہ کرایا۔اس زمانے میں فیضان استاذ حاصل کرنے کے لئے کسی مولوی کے روبروز وانوئے ادب تہہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں نونہالان قوم وملت استاذ کی نظر عنایت اور ان شفقت وفیضان سے کنارہ کش ہوجانے سے والدین اور استاذ کے ساتھ عزیز واقارب کے مقام اور ادب سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں۔جس کا نتیجہ دینی فکر اور اخلاقی زوال آمادہ ہمارا معاشرہ ہے۔

مکتب کے استاذ نے اپنے شاگرد کے جبین سعادت کا بغور مطالعہ کیا اور ''می تابد ستارہ بلندی'' کو پیش نظر رکھ کر درس دینے کا سلسلہ شروع کیا۔اسے مکتب کی کرامت ہی کہئے کہ محمد نواز خان تعلیمی میدان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے رہے اردو میں تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی اور اردو دنیا میں ڈاکٹر نواز دیوبندی کے نام سے متعارف ہوگئے۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنی شاعری کا آغاز شہر دیوبند کی معروف علمی انجمن ''بزم گلزار ادب'' کے زیر اہتمام طرحی وغیر طرحی نشستوں سے کیا۔انہوں نے مشورۂ سخن اپنے برادر اکبر عمر دراز خان سے لیا۔کچھ ہی عرصہ میں ان کی شاعری نے پورے علمی وادبی حلقے میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی اپنے شہر کے اہل علم اور علم نواز دوستوں کی نوازنوازی کا اعتراف یوں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سب کا خلوص سب کی عنایت مجھے ملی
میں خوش نصیب ہوں کہ محبت مجھے ملی
وہ اور ہوں گے جن کو وطن چھوڑنا پڑا
اپنے وطن میں رہ کے بھی عزت مجھے ملی

ڈاکٹر نواز دیوبندی نے نثر اور نظم دونوں اصناف ادب میں اپنے قلم اور طبع کا جوہر دکھایا۔البتہ انہیں شہرت اور مقبولیت فکر شعر کی بدولت ملی۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی کا پہلا شعری مجموعہ ''پہلا آسمان'' 2002 میں طبع ہوکر منظر عام پر آیا۔جس میں حمد ونعت، قطعات، غزلیات، اور متفرقات شامل ہیں۔جب کہ ان کی نثری تصنیفات میں سوانح علمائے دیوبند کی دو جلدیں طبع ہوچکی ہیں اور دارالعلوم دیوبند کی صحافتی خدمات زیر طبع ہیں۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی کا دل زبان وادب کے ساتھ دینی وملی خدمات سے لبریز اور سرشار ہے۔وہ بہت حساس دل ودماغ بالغ فکر وشعور اور ادراک رکھتے ہیں۔ڈاکٹر نواز دیوبندی کا مطالعہ بہت وسیع ہے انہوں نے عصری ادب کلاسیکل شعراوادباء کے علمی وادبی سرمایہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ان کا تخیل بلند اور بلیغ ہے۔زبان وبیان پر مکمل قدرت حاصل ہے۔وہ غزلوں میں ثقیل الفاظ، نامانوس تراکیب اور دوراز کار تشبیہات سے یکسر گریز کرتے ہیں۔اظہار بیان رواں اور سلیس ہے ان کی غزلیں عام فہم اور سادازبان میں ہوتی ہیں۔غزل کے داخلی جذبات واحساسات کی ترجمان خوب کامیابی سے کرتے ہیں۔وہ اپنے تجربات ومشاہدات کو نظم کرنے کا عمدہ ہنر جانتے ہیں ان کی شاعری میں خلوص اور دردمندی کا جذبہ غالب ہے۔ڈاکٹر نواز اخلاقی مضامین کو بڑے دلکش اسلوب میں نظم کرتے ہیں۔اخلاقیات پر اظہار خیال کرنے میں ان کو بڑی قدرت حاصل ہے۔اس ضمن میں ان کے اشعار دل چھو لیتے ہیں۔وہ حق وصداقت کو شعر کا جامہ عطا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی کی غزلیہ شاعری دل کی شاعری ہے۔ان کی غزلوں کی زبان نہایت عام فہم اور شستہ ہے۔وہ وارادت قلبی کے اظہار میں منفرد وممتاز مقام کے حامل شاعر ہیں۔چھوٹی بحروں میں غزل کہنا ان کے فن کی معراج ہے۔بڑی بحروں میں اشعار کہتے ہیں مگر چھوٹی بحروں میں غزلیں آپ اپنی مثال ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے آنے کی جب خبر مہکے
تیری خوشبو سے سارا گھر مہکے

یہ شعر اس بحر میں تغزل کا آئینہ دار ہے ملاحظہ ہو

یاد آئے تو دل منور ہو
دید ہوجائے تو نظر مہکے

یہ اشعار اپنے اندر بہت معنویت اور بڑی گیرائی وگہرائی رکھتے ہیں، ان میں تصوف خلوص اور دردمندی بھی ہے۔ان کا کلام ذہن وفکر کو بالیدگی اور

حوصلہ عطا کرتا ہے۔وہ صداقتوں کے اظہار کے لئے بہت حسین اور پر اثر لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نواز نے لفظیات کے استعمال میں بڑی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔انہیں اپنے دور کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، ثقافتی اور شعری تقاضوں کا بھرپور عرفان حاصل ہے۔شعر دیکھئے

خدا سے نہ محشر میں شرمندگی ہو
غزل میں بھی ایسا ہنر چاہتے ہیں

ڈاکٹر نواز معاشرتی اور سماجی مسائل کو نہایت موزوں لفظوں میں شعری جامہ عطا کرنے کا اعلیٰ ہنر رکھتے ہیں۔ان کے لہجے میں انفرادیت ہے وہ معاشرے کے بکھرتے ہوئے رشتوں سے بہت متفکر رہتے ہیں۔انہیں بے حد غم ہے۔وہ عصر حاضر کے بکھرتے رشتوں پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

بھائی سے بھائی کے کچھ تقاضے بھی ہیں
صحن کے بیچ دیوار اپنی جگہ
میں اپنے گھر میں اک آنگن کا قائل
وہ دیواریں اٹھانا چاہتا ہے

ڈاکٹر نواز دیوبندی کا مطالعہ تاریخ ادب اور اسلامی تاریخ پر گہرا ہے وہ ایک بالغ فکر وشعور رکھتے ہیں۔ان کا دل ودماغ نہایت بیدار ہے تاریخ اسلام کے دور خلیفہ ثانی کے ایک واقعہ کو شعر کا جامہ عطا کرتے ہوئے یوں گویا ہیں۔

بھوکے بچوں کی تسلی کے لئے
ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک

وہ عصری حالات اور معاشرے میں پائی جانے والی حقیقت کو نظم کا پیکر اس طرح عطا کرتے ہیں:

ناخلف بیٹے تو درد سر بنے
بیٹیوں نے سر دبایا دیر تک

ڈاکٹر نواز دیوبندی قرآنی آیات کو مدنظر رکھ کر بھی شعر کہتے ہیں اخلاقیات پر ان کا یہ شعر یقیناً اپنی مثال آپ ہے شاعر کا یہ شعر منفرد لب ولہجے اور فکر وشعور کی نمایندگی کی اعلیٰ مثال ہے۔وہ اپنے مشاہدات وتجربات کو نظم کا جامہ عطا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ڈاکٹر نواز قرآن کی ایک آیت (تلک الایام نداولہا بین الناس) کا بڑا دلکش اسلوب میں بیان اور قلب کو متاثر کن لہجے میں ترجمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گنگناتا جارہا تھا اک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک

اسی ضمن میں ان کا ایک اعلیٰ فکر اور تخیل پر مبنی شعر اور بھی ہے جو نفس کو تقویٰ اور طہارت عطا کرتا ہے۔ان کا یہ شعر قلب ونظر کو پاکیزگی دیتا ہے،اردو شاعری میں ایسے اشعار نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔اخلاقیات کے موضوع پر ان کا یہ شعر شاعر کو حیات دوام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔

بدنظر اٹھنے ہی والی تھی کسی کی جانب
اپنی بیٹی کا خیال آیا تو دل کانپ گیا

چند اشعار بغیر کسی تشریح وتنقید کے دیکھئے جو عصری حالات وتقاضے کے ساتھ ساتھ تجربات پر مبنی ہیں۔ملاحظہ ہوں۔

میرے بچوں کی مسکراہٹ ہے
سارے دن کی تکان کا صدقہ

مشورہ ہے امیر زادوں کو
ہاتھ میں کچھ ہنر بھی رکھئے گا
چاہے رکنے کے سو ٹھکانے ہوں
لیکن اک اپنا گھر بھی رکھئے گا

اپنا سمجھا تو کہہ دیا ورنہ
غیر سے تو گلہ نہیں ہوتا

لاڈلے بیٹے کی بربادی کا ساماں ہوگیا
ماں نے بے جا حرکتوں پر ناگواری چھوڑ دی

غزل کا مکمل ایک شعر خاص طور سے ملاحظہ ہو

وہ اپنے گھر کے دریچوں سے جھانکتا کم ہے
تعلقات تو اب بھی ہیں رابطہ کم ہے

ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری حیات وکائنات کی علمبردار ہے۔وہ زندگی کے حقائق کو شعر کا جامہ عطا کرتے ہیں۔وہ غزل،قطعہ وغیرہ میں زندگی کے مسائل کو موضوع سخن بنانے کا اعلیٰ ہنر رکھتے ہیں۔چنانچہ اپنے ایک گیت کے شعر میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے۔

اس مہ جبیں کے نام نہ اس جل پری کے نام
جی چاہتا ہے گیت لکھوں زندگی کے نام

ڈاکٹر نواز دیوبندی کو اردو ہندی اور عام فہم زبان وبیان کے کلام میں استعمال کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔وہ غزل کی قدیم روایت کو بڑے سلیقہ سے اپنی شاعری میں برتنے کا شعور رکھتے ہیں۔وہ غزل کو بڑی جامعیت عطا کررہے ہیں۔وہ بزم شعرائے عصر حاضر میں ایک ایسی روشن شمع کی مانند ہیں جس کی ضیاء سے عصر حاضر اور مستقبل کی نئی نسل کے شعراء مستفیض ہوتے رہیں گے۔وہ غزل کے قالب میں اخلاقی اور انسانی اقدار کو سمونے میں بہت کامیاب شاعر ہیں۔ان کا کلام کلاسیکل شاعری کے زمرہ میں شامل ہوکر عنقریب تنویر ادب بنے گا اور ادب کے دامن کو وسعت دے کر عوام وخواص سے داد وتحسین حاصل کرے گا۔

شعری تقاضوں کا عرفان

ڈاکٹر راحت اندوری
(اندور)

روایتی شاعری، ترقی پسند شاعری، جدید شاعری اور نہ جانے کون کون سی شاعریوں پر کچھ لکھنا اب کارِ بے مصرف سا ہے، جتنی شاعری گزشتہ تین چار صدیوں میں نہیں لکھی گئی، اس سے کہیں زیادہ اس کے بارے میں لکھنے کی فرصتیں نکال لینا ہمارے ادیبوں اور نقادوں کا چٹکار ہی ہے۔ یہ کہنے میں مجھے ہچک محسوس نہیں ہوتی کہ میں چھپنے چھپانے کا زیادہ قائل نہیں رہا۔ میں نے کبھی مدیران کرام کے تلوے نہیں چاٹے۔ میں ان عظیم ادیبوں اور نقادوں سے بخوبی واقف ہوں جو میرؔ و غالبؔ سے لگا کر فیضؔ و فراقؔ کی شاعری کے منکر ہیں لیکن اگر کسی تیسرے چوتھے درجے کا شاعر کسی چوتھے درجے کے رسالے کا مدیر ہے تو اس کی شان میں ایسا قصیدہ لکھیں گے کہ سوداؔ کی روح دہائی پیٹے۔ ان بے چارے محرومیوں کے مارے ناقدوں کے پاس اپنی تحریروں کا وزن بڑھانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انہوں نے ایف ایل لیوکس، والیری، فان ٹیہم، کیلون، براؤن کیٹس، شیلی جیسے کئی فرانسیسی اور انگریزی ادیبوں اور نقادوں کے نام طوطے کی طرح رٹ رکھے ہیں۔ ہمارے یہ ادیب ان لوگوں کے بارے میں نام سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

کسی ایسے شاعر کے بارے میں لکھنا جو ہم عصر بھی ہو اور عزیز بھی سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ میں اس وقت جس شاعر کا ذکر کر رہا ہوں وہ ڈاکٹر نوازؔ دیوبندی ہے۔ میرے اور ان کے رشتوں کی بنیاد مشاعرہ ہے، مشاعرہ ایک ایسا تہذیبی اور تدریسی ادارہ ہے جس نے اردو زبان کی توسیع اور ترویج میں ایک اہم رول ادا کیا ہے، آج بھی جب کہ اس زبان کا رشتہ اپنے ہی مراتب سے گھٹتا جا رہا ہے صرف مشاعرہ ہے جو اردو کے لئے نئے جغرافیائی دائروں کو چھو رہا ہے۔

وہ لوگ جو مشاعرے کے نام پر ناک بھنویں چڑھاتے ہیں ان کے لئے عرض کروں کہ میں نے ان ہی مشاعروں میں لبھو رام جوشؔ، بال مکند عرشؔ ملسیانی، استاد رسا دہلوی، جوشؔ ملیح آبادی، فیض احمد فیضؔ، فراقؔ گورکھپوری، رئیسؔ امروہوی، محشرؔ بدایونی، ابرار حسنی گنوری جیسے ان گنت بزرگ اور محترم شعراء کا کلام سنا ہے اور اپنا سنایا ہے اور انھیں مشاعروں میں ان بزرگوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی ہے۔ آج بھی مشاعروں کے حوالے سے جو اشعار ہواؤں میں سفر کرتے ہیں انھیں ادبی کسوٹی پر کم نمبر دینا زیادتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، جون ایلیا، افتخار عارف، مظفر حنفی، ندا فاضلی، بشیر بدر، زبیر رضوی، وسیم بریلوی، والی آسی، منور رانا وغیرہ وغیرہ کئی نام ہیں جن کی ادبی قامت پر شک نہیں کیا جا سکتا، یہ وہی شعراء ہیں جن کا حوالہ کاغذ کے علاوہ مشاعرہ بھی ہے۔

حالانکہ مشاعروں کا ایک افسوسناک اور سیاہ ترین پہلو یہ بھی ہے کہ ان دنوں وہ لوگ بھی شاعر کی حیثیت سے شرکت کرتے ہیں جو کبھی نوٹنکی کیا کرتے تھے، مشینوں سے نکالے گیے، یہ متشاعر جو اردو میں اپنا نام بھی لکھنا نہیں جانتے اپنے گلے کی مرکیوں پر ایک تخلص چپکائے ساری دنیا میں مال بٹورتے پھر رہے ہیں۔

مشاعرہ اب ضابطے کا نہیں رابطے کا ''پیشہ'' بن چکا ہے، چھوڑیئے یہ قصہ طویل ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ان کھوٹوں کے چکر میں کھروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مشاعروں سے آنے والی چند آوازوں میں ڈاکٹر نواز دیوبندی نے جو مقام پیدا کیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ اتنا شریف ہونے کے باوجود کوئی اتنی ترقی نہیں کر سکتا ہے یہ ایک مثال ہے۔ میں نے ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کئی مقامات پر ڈاکٹر نواز دیوبندی کی شاعری اور ان کے پڑھنے کے خوبصورت انداز پر مشاعروں کی چھتوں کو کبوتر ہوتے دیکھا ہے۔ میں اعتراف کر چکا ہوں کہ مجھے تنقیدی فریم بنانے کا ہنر یاد نہیں، لہٰذا میں بہت شرافت سے اس شریف شاعر کے چند اشعار کی جانب قارئین کو متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ اس وقت نوازؔ کا صاف شفاف کرتا، پاجامہ ہے نہ شخصیت کی سادگی کا جادو، نہ کاندھے پر لدھیانے کی شال، نہ رومال نہ عینک، نہ گلا اور نہ ہی نوازؔ کی تازہ تازہ داڑھی صرف اشعار ہیں۔

شاعری حسن خیال اور لطافت اظہار کے امتزاج سے جب وجود میں آتی ہے تو وہ بڑی کارآمد بن جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے خیال کو اگر شعری لطافت کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو اس کے بے اثر ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی طرح محض شعری لطافت کے پیدا کرنے کی خاطر جو شاعری عالم وجود میں آتی ہے اسے بھی بڑی شاعری میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے شاعر کو کھلی نگاہ اور وسیع دماغ رکھتے ہوئے اپنے عہد کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا پڑتا ہے۔

نوازؔ دیوبندی نے اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے ہی سے سماجی مسائل کو کھلے دل و دماغ سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اسی لئے جب انہوں نے ابتدائی زمانہ کی شاعری میں ایسے اشعار اہل فکر و فن تک پہنچائے تو وہ بھی لفظیات کی جدّت، لہجے کی انفرادیت اور اظہار کی وجہ سے قابل قبول بن گیے، ملاحظہ کیجئے

میرے پیمانے میں کچھ ہے اس کے پیمانے میں کچھ
دیکھ ساقی ہو نہ جائے تیرے میخانے میں کچھ

ہمارے گاؤں سے ہو کر کئی ندیاں گزرتی ہیں
وہ یا تو خشک رہتی ہیں یا پھر سیلاب لاتی ہیں

جان کر گونگا ہوں اور بہرا ہوں میں
اس لئے اس شہر میں زندہ ہوں میں

اس نے رسماً جب بھی پوچھا میرا حال
میں نے طنزاً کہہ دیا اچھا ہوں میں

وہ شجر تنہا شجر چوپال کا
اس شجر کا آخری پتّا ہوں میں

نوازؔ دیوبندی کو رفتہ رفتہ شعر گوئی کا وہ سلیقہ آ گیا کہ جو کسی شاعر کو اس کے عصری تقاضوں کو بیان کرنے کی سمجھ دیتا ہے۔ اس کے لئے نوازؔ نے نہ صرف اپنے عہد کے شعری تقاضوں پر گہری نظر ہی رکھی بلکہ اس کی تکمیل کے لئے جرأت مندانہ اقدام بھی کئے۔ اسی لئے انہوں نے فکر و شعور کو وسیع تر بنانے میں اپنی پوری ذہانت کا ثبوت بھی دیا۔ اور اس طرح وہ ذہنی اور فکری تشکیک سے گزر کر اس راہ پر گامزن ہو گئے، جہاں ان کی منفرد فکری اور تجرباتی تشکیل نے عبوری پہلوؤں پر فتح حاصل کر لی۔

نوازؔ کو اپنے عہد کے تمام سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور شعری تقاضوں کا عرفان ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ ہے کہ ان کی اس حسیت کا جسے انہوں نے ایک سچے فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ سوچ کی وسعت اور احساس کی گہرائی کے تحت اپنے کھلے دل و دماغ اور روشن آنکھوں سے پرکھا اور دیکھا اسی لئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کتب بینی سے ملنے والے نتائج سے کہیں زیادہ سوچنے اور محسوس کرنے والی شاعری بن گئی ہے جیسے

وہ گزرے ہیں جس راہ سے ممکن ہی نہیں ہے
اس راہ سے ہو جائے گزر اور کسی کا
جب تک کہ مقید نہ ہو مٹھی میں یہ سورج
ہم پیڑ کے سائے پہ بھروسا نہیں کرتے
اجالوں نے دیا روشن ضمیری کا پتہ برسوں
بجھے بھی تو چراغوں سے دھواں اٹھتا رہا برسوں

نوازؔ کے درج بالا اشعار میں ان کا احتجاجی رویہ محض جذباتیت کا آئینہ دار نہیں ہے۔ انہوں نے حالات کی بے ترتیبی اور پیچیدگی سے ابھرنے والی صورتوں پر جس سلیقگی اور شائستگی کے ساتھ ضرب لگائی ہے اس میں نہ تو اصلاحی لہجہ نظر آتا ہے اور نہ خطیبانہ اور نہ بیانیہ صورتیں دکھائی دیتی ہیں بلکہ وہ بھرپور شعری لطافت کے ساتھ اکثر استعاراتی اور کنائی صورتوں کا سہارا لے کر اپنے احتجاج کو بھی جاذب نظر بنا دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس لئے ان کی آواز احتجاج میں کسی قسم کی ترشی یا بے کیفی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس میں شیرینی اور دل کشی کے ایسے عنصر شامل ہو جاتے ہیں جو اپنی تاثیر کے ذریعے سماج کی بے ترتیبی کی جانب لوگوں کو متوجہ کر دیتے ہیں۔

ان کا یہ احتجاجی رویہ بتدریج شگفتہ ہوتا گیا ہے۔ درج بالا اشعار ان کی غزلوں سے منتخب کئے گئے ہیں، مگر بعد میں ان کا یہی رویہ کس طرح مزید شگفتہ اور گہرا اور وسیع ہو جاتا ہے اس کا اندازہ ان کے درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

وہ مجھے اپنے برابر نہیں ہونے دیتا
ایک قطرے کو سمندر نہیں ہونے دیتا
میں قلندر ہوں بہرطور یہ سچ ہے لیکن
یہ تصور ہی قلندر نہیں ہونے دیتا
رنج دے کے آخر کیوں مسکرا نہیں دیتے
تم سزا تو دیتے ہو حوصلہ نہیں دیتے
موسموں کی سازش سے پیڑ پھل تو دیتے ہیں
نفرتوں کے پھل لیکن ذائقہ نہیں دیتے

نوازؔ نے اپنی شخصیت کو تجربات اور مشاہدات کی بھٹی میں خوب خوب تپایا ہے، حالات کی گرمی ان کے ذہن کو گرما دیتی ہے، زمانہ کی سختیوں کی آنچ ان کی طبیعت کو برما دیتی ہے اسی لئے انھیں گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا ہے، گفتگو بھی ایسی کہ جو بے حس دل کو متحرک کر دے، منجمد ذہن کو حرکت میں لے آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی شخصیت میں موجود یہ سلیقہ سخت ذہنی ریاضت اور وسعت کے بعد آیا ہے۔ ان کے چھپے فنکار نے انھیں زبان کھولنا سکھایا ہے، صداقتوں کی پرکھ ہر شخص کو نہیں آتی اس کے لئے حادثات و انقلابات کے چہروں پر نقابوں کو الٹنا پڑتا ہے۔ نوازؔ نے یہ سب کچھ کر دکھایا ہے، طنز و احتجاج کے تیر و کمان لے کر وہ اندھیروں میں اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتے، فکر کی کمانوں کے چلّے پر رکھ کر ان تیروں کو نشانے پر داغا ہے اس لئے یہ تیر بہت کم خطا ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ مقابل کے دل میں پیوست ہو کر اسے تڑپا دیتے ہیں، یہ وہ تڑپ ہے جو موجودہ عہد کے معاشرتی مسائل کے حل کی طرف ہمارے فنکاروں کو متوجہ کئے ہوئے ہے۔ وہ کام جو مسلح ملک، رہنمایان ملت کے لئے بعض مرتبہ مشکل نظر آتا ہے، نوازؔ اپنے احتجاج و طنز کے ذریعہ اسے آسان بنا دیتے ہیں۔

نوازؔ نے لفظیات کے استعمال کے سلسلہ میں بھی بڑی ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بعض جگہ اختراعی عمل سے کام لیتے ہیں، الفاظ کے امتزاج اور بعض صورتوں میں نادر تشبیہات و جدید استعارات کے استعمال سے اپنی شاعری کو مزین کرنے میں مہارت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

روکے ہم دوستوں سے کیا کہتے
اپنا غم پتھروں سے کیا کہتے
خود ہی خنجر چھپولیا دل میں
بے ہنر قاتلوں سے کیا کہتے
بری نظر سے پرندے کا پر نہ جل جائے
سفر سے پہلے متاع سفر نہ جل جائے
اسی خیال سے رکتا نہیں ہوں منزل پر
مرے سفر سے مرا ہم سفر نہ جل جائے

نوازؔ نے اردو غزل کی ایک قدیم روایت یعنی تذکرۂ حسن و عشق کو بھی بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی وہ بڑی بے باکی اور شگفتگی سے

کام لیتے ہیں وہ ''معشوقانہ تصورات'' کو کم ''دوستانہ فضا'' کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اسی لئے وہ تذکرۂ حسن کرتے وقت محض تخیلی تصورات میں گم نہیں ہوتے بلکہ ''ارضی حقائق'' کے پیش نظر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔اس سلسلہ میں ان کی ''انفرادی سوچ'' ان کا ساتھ دیتی ہے اور بہت کم مواقع ایسے آتے ہیں جہاں قاری کو محسوس ہو کہ وہ ''گفتگو برائے گفتگو'' میں گھو گیے ہیں، اسی لئے وہ اپنے دوست (معشوق نہیں) کے بارے میں جب لب کشا ہوتے ہیں تو حسن کی تمام تر عظیم روایات کی پاسداری کرتے ہیں اور کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اس کے حسن کا تذکرہ کرتے کرتے تصنع کی گمنام وادیوں میں کھو گئے ہیں۔

وہ صداقتوں کو ظاہر کرنے کے لئے حسین لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں، یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا تصور حسن ''حسن ذاتی'' کی تمام تر خوبیوں کے احاطے سے باہر نہیں جاتا۔وہ ''قبائے گل میں گل بوٹا'' تلاش کرنے کے قائل نہیں ہیں اسی لئے وہ حسن ذاتی کا بیان فطری لب ولہجہ میں کر دینے کی وجہ سے تصنع آمیزی کے مشکوک دائرے میں داخل نہیں ہوتے، ملاحظہ کیجئے۔

یہ ہے اعجاز ان کی گفتگو کا
مخاطب ہوں تو پتھر بولتا ہے
تبسم گل کھلانا چاہتا ہے
کوئی اب مسکرانا چاہتا ہے

رستہ ہے نہ منزل ہے کوئی تجھ سے بچھڑ کر
ہم پیڑ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ہیں
ویسے تو ہر اک خواب بھی سچا نہیں ہوتا
جس خواب میں وہ آئیں وہ جھوٹا نہیں ہوتا

نوازؔ دیوبندی ابھی تر و تازہ ہیں، ذہن کو بالیدہ بنائے ہوئے ہیں، حوصلہ مند دل سینے میں رکھتے ہیں۔امید کی جانی چاہیے کہ وہ آج جس ادبی و شعری مقام پر ہیں اس سے اور بھی آگے جائیں گے۔

اچھا شاعر، اچھا انسان

غزل اردو شاعری کی قدیم ترین اور مقبول ترین صنف سخن ہے۔وہ ہونٹوں سے بولی تو ضرور جاتی ہے لیکن آنکھوں کی زبان میں ہی سمجھی جا سکتی ہے۔میرے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ اشاروں اور کنایوں کی زبان ہے۔اگر چہ اس کی روایت تقریباً سات سو برسوں سے ہندوستان میں چلی آرہی ہے۔لیکن غزل اب وہ غزل نہیں ہے جو محبوب کی زلفوں کے پیچ وخم میں قید ہو یا جام و مینا ہاتھ میں لئے شراب خانے کے چکر لگا رہی ہو۔آج کی غزل ان سب سے الگ ہے۔آج کی سیاسی، سماجی، ثقافتی ناکامیوں اور تبدیلیوں کا کھلا دستاویز ہے۔

بھائی نواز دیوبندی نے جو غزلیں کہی ہیں وہ حالاتِ حاضرہ کا ایک بہت ہی دلکش آئینہ ہیں۔وہ اتنا ہی صاف ستھرا ہے جتنا ان کا دل۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سچے اور اچھے انسان بھی ہیں۔میرا تو یہ خیال ہے کہ جو ایک اچھا انسان نہیں ہے وہ اچھا شاعر بھی نہیں ہوسکتا۔دل کی معصومیت، بچوں جیسا بھولا پن جس کے پاس ہوتا ہے، غزل اسی کے دل پر اُترتی ہے۔ خدا کے پیغام بھی انھیں پر نازل ہوئے ہیں، جو بچوں جیسے بھولے اور معصوم تھے اور وہ ہی لوگ پیغمبر کہلائے۔اردو شاعری میں شاعر کو پیغمبر کے مساوی ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔کیوں کہ وہ غزل لکھتا نہیں، وہ اس پر اترتی ہے۔بھائی نواز دیوبندی نے جو شعر کہے ہیں وہ انھوں نے خود نہیں لکھے، کسی دور دیس سے آئے ہوئے بادلوں سے ان پر برسے ہیں۔ان شعروں کی برسات میں جو بھی دل بھیگ جاتا ہے، اس کی کیفیت مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے۔غزلیں تو ہزاروں لوگوں نے کہی ہیں لیکن کسی بھی کمزور دل کو بدل دینے کی جو قوت نواز بھائی کے شعروں میں ہیں، وہ بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ہندی رسمِ خط میں شائع شدہ ان کے مجموعے ''پہلی بارش'' کا میں تہِ دل سے استقبال کرتا ہوں۔غزل کے میدان میں یہ ایک اضافہ ہے اور اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

گوپال داس نیرج

شاعری اور اس کا تخلیقی رچاؤ

پروفیسر اختر الواسع
(جودھپور)

ڈاکٹر نواز دیوبندی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔کم وبیش چار دہائیوں سے مشاعروں کی دنیا میں وہ چھائے ہوئے ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ کلام 'پہلا آسمان' کافی عرصہ پہلے شائع ہوا تھا اور اہل علم وادب نے اس کی پذیرائی کی تھی۔اس وقت وہ مشاعروں کے توسط سے پوری ادبی دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں اور ہندستان سے باہر بھی اردو کی نوآبادیوں میں مدعو کئے جاتے ہیں۔پسندیدگی اور مقبولیت کے بہت سے ریکارڈ ایسے ہیں جو نواز صاحب نے خود قائم کئے ہیں۔

نواز دیوبندی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کے اشعار مثبت اور تعمیری رخ کے حامل ہیں۔غزل کی ریزہ خیالی سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مختلف مضامین باندھے ہیں مگر ان کا تہذیبی اور سماجی شعور بہت بلند ہے اور اسی لیے بالعموم ان کی شاعری میں یہ رخ نمایاں رہتا ہے۔ان کے وہ اشعار جو بہت زیادہ مشہور ہیں ان میں اس غزل کے کئی اشعار شامل ہیں جس کی ردیف 'دیر تک' ہے۔اس غزل کا شعر ہے۔

گنگناتا جارہا تھا اک فقیر
دھوپ رہتی ہے نہ سایہ دیر تک

بھوکے بچوں کی تسلی کے لیے
ماں نے پھر پانی پکایا دیر تک

اگر یہ کہا جائے تو نواز صاحب کو اس غزل کو عمومی طور پر اور مذکورہ دونوں اشعار سے خصوصی طور پر شہرت اور مقبولیت ملی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔پہلے شعر میں تاریخی شعور کی کارفرمائی ہے۔گردش لیل ونہار نے لوگوں کو کہاں سے کہاں پہنچادیا اور ایسا بھی ہوا کہ

ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگیے
کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگیے

ظفر گورکھپوری کا مشہور شعر ہے۔

یہ لوگ کیسے اچانک امیر بن بیٹھے
یہ سب تھے بھیک مرے ساتھ مانگنے والے

البتہ مذکورہ بالا شعر میں جو برجستگی ہے اور تاریخ سے جس طرح استفادہ کیا گیا ہے وہ بے مثال ہے۔دوسرے شعر میں تاریخ بھی ہے اور تہذیب بھی۔دور خلافت کے ایک مشہور واقعہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسے بہت سلیقے سے عصر حاضر سے مربوط کیا گیا ہے۔حالانکہ شعر کے بین السطور میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ اس وقت تو خلیفہ وقت نے فوراً اس کی تلافی کردی تھی مگر اس عہد میں اب کسی کو ماں کی فکر نہیں ہے۔اور نہ نوزائیدہ بچوں کے لئے ہماری ترقی یافتہ حکومتوں کے پاس کوئی ایسی پالیسی ہے کہ بچپن سے ہی ان کی مناسب نشوونما ہوسکے۔جو لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اردو شاعری میں عشق ومحبت کے علاوہ کیا ہے انھیں اس نوع کے اشعار پر غور کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ شعرا تاریخ و تہذیب سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں اور بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتے ہیں۔آج غربت وبدحالی کی جو عالمی سطح پر صورت حال ہے اس سے کون ہے جو واقف نہیں ہے۔مگر تہذیب وترقی ہونے کے باوجود ہم ایسا کوئی انتظام نہیں کرپارہے ہیں جس سے کہ غربت کا خاتمہ ہوسکے۔نواز صاحب کی شناخت کے لئے یہی دو شعر کافی ہیں مگر انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری سے سماج اور معاشرہ کو تقویت بخشتے رہے ہیں۔

نواز دیوبندی نے اپنی شناخت مشاعروں کے توسط سے قائم کی ہے مگر جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ ان کا شعری مجموعہ بہت پہلے منظر عام پر آچکا ہے۔اور اسی لئے انھوں نے زبان وبیان اور دیگر شاعرانہ فن کاریوں کو پیش نظر رکھا ہے۔براہ راست شعر بھی اسی وقت کارگر ہوتا ہے جب اس میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ہو کہ جو اپنا جواز رکھتا ہو۔نواز دیوبندی نے سادہ اور عام فہم اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا پہلو ضرور رکھا ہے جو قاری یا سامع کو چونکا دے۔سادگی یک رخی نہیں ہے اور بیان ایسا بھی نہیں کہ صرف ایک ہی معنی پر اکتفا کرنے کو جی چاہے۔اور جہاں معنی کی تہیں موجود نہیں ہیں وہاں پر سادگی اور لطف بیان کا پہلو متوجہ کرتا ہے۔اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اگر میں نے تجھے چاہا نہ ہوتا
تو اب جیسا ہے پھر ویسا نہ ہوتا

نہ ہم سفر نہ کوئی راہ بر ضروری ہے
سفر کے واسطے عزم سفر ضروری ہے

سارے قصے کہانیاں بیکار
رات کٹتی ہے نیند آنے سے

صرف اک تیری جستجو کرکے
پھر کسی کی بھی جستجو نہ رہی

ان اشعار میں کسی نوع کی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ بہت زیادہ فلسفیانہ مضمون ہے۔پہلے اور آخری شعر میں کچھ ضرور ہے مگر بات کہنے کا انداز سادہ اور آسان ہونے کی وجہ سے مضمون بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔خیال رہے کہ اس سادگی اور آسانی میں کہیں سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ شعر نہیں بلکہ ہم نثر پڑھ رہے ہیں۔شعری رسومیات سے مربوط رکھنا اور معنی کا کوئی نہ کوئی پہلو رکھنا ان اشعار کا یہی امتیاز ہے۔پہلا شعر غیر معمولی محبت کے جذبے کی نشان دہی کررہا ہے جب کہ دوسرے شعر میں اصل معاملہ عزم سفر کا ہے۔تیسرے شعر میں قصے کہانیوں

کی نفی نہیں کی گئی ہے لیکن یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ اصل چیز پر توجہ کی ضرورت ہے۔ قصے اور کہانی نیند کا بدل نہیں ہوسکتے۔ ہاں ان سے جی کو بہلایا جاسکتا ہے۔اور آخری شعر ہماری عشقیہ اور صوفیانہ دونوں روایتوں کا نمائندہ شعر ہے۔نواز دیوبندی کا ایک شعر ہے۔

دل کے نقصان میں انعام کی صورت نکلے
آپ تڑپائیں تو آرام کی صورت نکلے

اردو غزل کا ایک عام مضمون ہے کہ محبوب جب عاشق کو تڑپاتا ہے۔ اسے طرح طرح سے آزمائش میں ڈالتا ہے تو عاشق کو سکون ملتا ہے اور وہ اس آزمائش کو محبوب کا التفات سمجھتا ہے۔تڑپنا دراصل انعام ہے عاشق کے لیے۔شاد عظیم آبادی کا بہت مشہور شعر ہے۔

خموشی میں محبت اور بھی سنگین ہوتی ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

نواز صاحب کا ایک اور شعر ہے

غم فراق کے صدمے تو سہہ کے دیکھ لیے
شب وصال کی لذت سے آشنا کردے

عاشق کی قسمت میں شب وصال نہیں ہے بلکہ وہ پوری عمر غم فراق کے صدمے سہتا رہتا ہے البتہ شب وصال کی خواہش اس کے دل میں بار بار اٹھتی ہے اور وہ اس کی لذت سے آشنا ہونا چاہتا ہے مگر یہ منزل اسے نہیں ملتی۔اسی لئے اس شعر کے پہلے مصرعے میں غم فراق کے صدمے سہہ لینے کی بات کہی جارہی ہے مگر شب وصال کی لذت سے وہ آشنا ہونے کا آرزومند ہے۔یعنی ابھی وہ مرحلہ آیا ہی نہیں۔اردو غزل کا یہ پامال مضمون ہے مگر نواز دیوبندی نے اسے خوب نبھایا ہے۔

نواز دیوبندی نے اپنے بہت سے شعروں میں چراغ کا لفظ استعمال کیا ہے۔بالعموم ان کی جو شاعری ہے اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک لفظ کو اس کے مختلف انداز سے نبھائیں گے۔مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ ایک طرف شعر کے عمومی مزاج سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو دوسری طرف لفظ کی قوت کو بھی دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بجھا بجھا کے سجاتا ہے وہ منڈیروں پر
اسے چراغ نہیں روشنی سے نفرت ہے

گل نہ کیجئے گا ان چراغوں کو
شام غم کی سحر نہیں ہوتی
رونا پڑا کسی کو ہنسانے کے واسطے
ہم خود جلے چراغ جلانے کے واسطے
پھر سر پھری ہواؤں نے گل کردیے چراغ
ایسی ہوا چلا جو چراغوں کا ساتھ دے

ان اشعار میں چراغ امید کا استعارہ ہے۔چراغ روشنی سے عبارت ہے۔چراغ،شام اور سحر کے لفظ کا فن کارانہ استعمال قابل داد ہے۔یہاں بھی چراغ امید سے عبارت ہے اور اسی لئے اسے روشن رکھنے کی بات کہی جارہی ہے۔چراغ جلانے کے لیے خود جلنا یا چراغوں کا ساتھ دینے والی ہواؤں کو چلانا۔اپنے آپ میں زبردست معنویت کے حامل کہے جاسکتے ہیں۔ان اشعار کے توسط سے تخلیقیت اور فن کاری کو محسوس کیا جاسکتا ہے اور دیکھا جاسکتا ہے کہ آسان اور عام فہم انداز میں بھی شعر کو کس طرح معنویت عطا کی گئی ہے۔فن کار کا یہی کمال ہے۔عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے بھاری بھرکم الفاظ اور عربی و فارسی کی تراکیب سے ہی شاعری کے جوہر دکھائے جاسکتے ہیں مگر نواز صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سادہ اور عام فہم انداز میں بھی اپنی بات غزل کی روایت سے قریب ہوکر رکھی ہے اور بہتر انداز میں اسے پیش کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز دیوبندی کے ادبی سروکار میں سماجی سروکار اور مقصدیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ان کے یہاں حسن و عشق کی وہ کیفیت نہیں ملے گی جو ہمارے روایتی شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔اسی لئے ہم جب ان کی شاعری کو پڑھتے ہیں تو اس میں اپنا اور اپنے سماج کا چہرہ دیکھتے ہیں۔وہ سماج کی ان سچائیوں کو بھی آئینہ دکھاتے ہیں جس سے بسا اوقات آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔

نواز دیوبندی کو پڑھنے والا اس بات کا بھی معترف رہے گا کہ ان کے شعری بیان میں بات کہنے کا ایک خاص ہنر ہے،جس کو ان کی شاعری کا عام قاری اچھی طرح سمجھتا ہے۔ممکن ہے ایسا اس وجہ سے بھی ہوا کیوں کہ ان کی شاعری عام طور پر مشاعروں کے توسط سے عوام تک پہنچتی رہی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی غزلیں رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں اور انھیں پسند کیا جاتا رہا ہے۔موضوعات کے تنوع اور سادگی بیان کی وجہ سے ان کی شاعری کو دیر تک پڑھا جائے گا۔اور یہی چیز فن کار کے لئے بہت اہم اور قابل فخر ہے۔

احساس واضطراب کا شاعر

قدیم وجدید دونوں رنگ میں ڈوبی یہ غزل نواز دیوبندی کی مزاجی کیفیت کی بہترین غمازی کرتی ہے کہ وہ تہذیب قدیم سے الگ نہیں ہوتے ہیں لیکن جدید اسیری بھی انھیں پریشان کئے ہوئے ہے۔زندگی زنداں بن چکی ہے اور شاعر زندانی۔آج کی شاعری اس زنداں کی پیداوار ہے تو اس میں خارجیت ہوگی اور مزاحمت واحتجاج بھی،اس کا استقبال کرنا۔میں نواز دیوبندی کی ایسی شاعری کا استقبال کرتا ہوں اور انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

شاعری، نقاد اور نواز دیوبندی

پروفیسر یعقوب یاور
(بنارس)

ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں ادب کی کوئی حتمی تعریف کا وجود ہی نہیں رہ گیا ہے اور نام نہاد ناقدین ادب کی اتنی بہتات ہوگئی ہے کہ جس کے جی میں جو آرہا ہے بس کہے جارہا ہے۔ فی زمانہ ادب کے اصول وضوابط بری طرح شکست وریخت کا شکار ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو یہ ساری باتیں کرنے والا خود اس بات سے ناواقف ہے کہ ادب کے لوازم کیا ہیں یا وہ اپنے قول کے تئیں محتاط اور دیانت دار نہیں ہے۔ اب یہ عام بات ہوگئی ہے کہ ہمارے نقاد جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے پیش نظر مختلف نوع کے تعصبات ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ان تعصبات کی موجودگی میں دیانت داری اور غیر جانب داری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ شاید اسی کے طفیل یہ بیماری بھی در آئی ہے کہ ہم فرد کے ساتھ اس سے متعلق گروہ کے بارے میں بھی رائے دینے سے نہیں ہچکچاتے۔ جب کہ ادب میں اس طرح کے فیصلے کلی طور پر ممنوع ہیں۔ ہمارا نقاد اگر شاعروں پر قلم اٹھاتا ہے تو عادتاً اس کی نوک قلم سے نکل ہی جاتا ہے کہ مشاعروں کی شاعری بھی بھلا کوئی شاعری ہے۔ اور اگر کسی شاعر کا تعلق فلمی دنیا سے ہوا تو وہ اسے محض اس لئے لائق اعتنا نہیں گردانتا کہ وہ فلموں سے وابستہ ہوگیا ہے۔ اگر وہ نثری تخلیقات کا جائزہ لیتا ہے تو جاسوسی، سائنسی، تاریخی کہانیوں اور ناولوں کو بغیر انھیں پڑھے اور ادب کی کسوٹی پر کسے ادب ماننے سے انکار کر دیتا ہے کہ یہ تو عوام پسند تحریریں ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب موجودہ تنقید کی سہل پسندی اور تعصبات کے طفیل پیدا شدہ بندھے ٹکے مزاج کے نتائج ہیں جو اجتماعی طور پر یا اگر کچھ اور وضاحت سے کہیں تو اکثریت کو دیکھتے ہوئے وضع کر لئے گئے ہیں۔ ایسے لوگ بھلے ہی تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں بھی ادب کے سوتے پھوٹ سکتے ہیں۔ مشاعروں میں پڑھی جانے والی شاعری بھی اعلی درجے کی ہوسکتی ہے۔ وہاں بھی غلام ربانی تاباں، علی سردار جعفری، احمد فراز، مظفر حنفی اور وسیم بریلوی جیسے شاعروں کی موجودگی ممکن ہے۔ فلمی دنیا میں بھی شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی جیسے شاعر اپنی ادبی اہمیت کا لوہا منوا سکتے ہیں۔ اور جنہیں حقارت سے عوام پسند مصنفین میں شمار کیا جاتا ہے وہاں بھی کوئی اسرار ناروی عرف ابن صفی پیدا ہوسکتا ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ادب میں اجتماعی طور پر فیصلے صادر کرنا ایک غلط روایت ہے، جسے بند ہونا۔ یہاں سارے فیصلے انفرادی ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ادب موضوع میں نہیں انداز اظہار میں ہوتا ہے اور ادب میں موضوع کی کوئی قید بھی نہیں ہوتی۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اظہار کی اعلی جمالیات ان شاعروں اور ناول نگاروں کے یہاں بھی ممکن ہے جن کے بارے میں ہمارے نام نہاد نقاد مسلسل منفی رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔

آج جب مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں نواز دیوبندی کے بارے میں کچھ لکھ سکوں تو مجھ پر بھی اس غلط فہمی کے تاریک سائے محیط ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نواز دیوبندی ایک اچھے شاعر ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں مشاعروں میں شرکت سے کوئی پرہیز نہیں ہے۔ لیکن ذرا فضا میں پھیلی اس کثافت سے ہٹ کر ہم ان کی شاعری کا جائزہ لیں۔ اس بہانے ہم کم از کم یہ دیکھ سکیں گے کہ ان کے یہاں ادب کے لوازم کی پیروی کی گئی ہے یا نہیں اور اگر کی گئی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔

نواز دیوبندی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وقت اور مقام، شاعری کے لئے اتنے اہم نہیں ہیں جتنا تخلیق کا اپنا حسن۔ چنانچہ وہ مشاعروں میں شرکت بھی کرتے ہیں، عوام سے اپنا رشتہ بھی استوار کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں اپنے دل کی آواز کو فراموش بھی نہیں کرتے۔ بظاہر تو یہ کئی کشتیوں پر قدم رکھ کر سفر کرنے جیسا عمل لگتا ہے لیکن اصل میں ایسا ہے نہیں اور جس شاعر پر یہ راز منکشف ہو چکا ہوتا ہے اس کی شاعری کو خارجی عوامل سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ برائے نام ہی رہ جاتا ہے۔ وہ ہر حال میں اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ شاعری کے بنیادی منصب پر حرف نہ آئے اور اس طرح اس کی شاعری عوامی پسند کا ردعمل ہونے کے بجائے اس کے دل کی آواز ہی بنی رہتی ہے۔ آیئے ہم بغیر کسی انتخاب کے ان کے چند اشعار پر غور کرتے ہیں اور آس پاس کے ماحول سے ہٹ کر اپنے طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بڑی مشکل سے نکلے گی کوئی صورت تعلق کی
تمہیں رونا نہیں آتا، ہمیں ہنسنا نہیں آتا

جب تک کہ مقید نہ ہو مٹھی میں یہ سورج
ہم پیڑ کے سائے پہ بھروسا نہیں کرتے

ایسی ویسی باتوں سے تو اچھا ہے خاموش رہو
یا پھر ایسی بات کہو جو خاموشی سے اچھی ہو

اسی کا مال تو بکتا ہے اس زمانے میں
جو اپنے نیم کے پتوں کو زعفران کہے

لاکھ دام بڑھ جائیں خوشبوؤں کے پھولوں سے
خوشبوؤں پہ واجب ہے احترام پھولوں کا

زندگی تو ایک سفر ہے اور سفر بھی رات کا
زندگی کو جانے کیوں منزل سمجھ لیتے ہیں لوگ

تکرار کر رہا تھا جو کچھ مے کشوں کے ساتھ
کل رات میکدے میں وہ پیر مغاں نہ ہو

خوابوں کے شوق میں کہیں آنکھیں گنوا نہ دیں
ہم سو رہے ہیں نیند نہ آنے کے باوجود

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے ہم کو
سروں سے پہلے ہی دستار کی ضرورت ہے
یاد آئے تو دل منور ہو
دید ہو جائے تو نظر مہکے

جمالیات ادبی اظہار کی ایک لازمی شرط ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس کی مدد سے اظہار کو عمومی سے ادبی بنایا جاسکتا ہے۔ اس جمالیاتی اظہار کے لئے ہمارے علمائے ادب نے علم بیان کی مختلف قسمیں وضع کی ہیں، ان میں جو قدرے نمایاں ہیں ان میں تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کے نام جانے جاسکتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں جو اور اضافے ہوئے ہیں انہیں ہم محاوروں، علامتوں اور تمثیلوں کا نام دے سکتے ہیں۔ میں جب بھی نواز دیوبندی کی شاعری کو پڑھتا ہوں تو مجھے ان کے یہاں اظہار کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ وہ اکثر نام نہاد ادبی شاعروں کے یہاں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اب ان درج بالا اشعار ہی کو دیکھیں، جو مشتے نمونے از خروارے یہاں وہاں سے نکال لئے گئے ہیں، ان میں اظہار کا جو تنوع ہے اور جمالیات کی جو متحرک شکلیں ان میں استعمال کی گئی ہیں وہ اختصار کے ساتھ اپنی بات کو کہنے اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور جس شاعر کی شاعری میں ایسی رنگا رنگی ہو اس کے بارے میں میں اس طرح کے منفی تبصرے سننے کو بالکل تیار نہیں ہوں جو عام طور پر ہمارے نقاد کرتے رہتے ہیں۔

اب تو اس بات کو کلئے کے طور پر تسلیم کر لیا جانا چاہیے کہ ایک اچھا شاعر ہمیشہ دو دنیاؤں میں زندہ رہتا ہے۔ اس کی ایک دنیا وہ ہوتی ہے جو اپنی تمام تر رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے متحرک ہوتی ہے اور دوسری وہ جو اس نے اپنے اندر آباد کی ہوتی ہے اور جہاں تک کسی دوسرے کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ ایک اچھے شاعر کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ خارجی دنیا میں اپنے اندر کی اس مثالی دنیا کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور تمام عمر اس تگ و دو میں اس کی تخلیق کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ نواز دیوبندی کے یہاں بھی یہی معاملہ ہے۔ ان کی شاعری اس دنیا کو مثالی دنیا میں تبدیل کرنے کے لیے کوشاں ہیں، جو بالکل ویسی ہو جو انھوں نے اپنے نہاں خانے میں تخلیق کر رکھی ہے۔ یہ عین فطری ہے کہ وہ زندگی کی اس بھاگ دوڑ میں اپنے رویئے میں یکسانیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ اسے ہر شعر میں متوقع کامیابی نصیب ہو یہ ضروری نہیں ہوتا۔ کسی بھی شاعر کے یہاں موجود اشعار میں ان کی اکثریت کی بنیاد پر ہی ہم یہ طے کرتے ہیں کہ وہ کس معیار تک پہنچ سکا ہے۔ میں جب نواز دیوبندی کی شاعری کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر وہ تمام صفات ہیں جو شاعر کو اپنی متصورہ منزل تک لے جاسکتی ہیں۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ سنجیدہ نقاد کو نواز دیوبندی جیسے شاعروں پر اس زاویئے سے قلم اٹھانا چاہئے کہ بنیادی طور پر ان کی شاعری ادب کے تقاضوں کی تکمیل کر رہی ہے یا نہیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ادب کا اظہار یہ موجود ہے تو اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہونی کہ وہ اپنی شاعری کہاں اور کن لوگوں کے درمیان سنا تا یا پہنچاتا ہے۔ اور اگر مطالعے کے بعد کسی طور یہ ثابت ہو کہ وہ اس طرح کی شاعری کرتا ہے، جو اس وقت عوام کی پسند پر تو پوری اتر رہی ہے لیکن شاعر اس بات کا خیال نہیں رکھتا کہ ادب کے تقاضے پورے ہو بھی رہے ہیں یا نہیں، تو ایسی شاعری کو رد کر دیا جانا۔ کہ یہی ادبی تنقید کی ذمہ داری بھی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کیا ہمارے نقادوں کے پاس اتنا حوصلہ ہے کہ وہ نئے لوگوں پر کھل کر بات کر سکیں یا کیا وہ حق بات کہنے کا جوکھم لینے کی حالت میں ہے؟ لیکن جہاں تک میری اپنی رائے کا سوال ہے نواز دیوبندی کی شاعری اول الذکر خانے میں رکھے جانے کا استحقاق رکھتی ہے۔

- بقیہ -

براہِ راست

☆ عالمی سیاست اور موجودہ منظر نامہ 9/11 سے نیو ورلڈ آرڈر تک کس کس حوالے سے موضوعِ بحث لایا جاسکتا ہے بلخصوص امت مسلمہ اور کمزور اقوام کو کس طرح کی صف بندی اور معاملہ فہمی کو کام میں لانا چاہیے؟

☆☆ دو دہائیوں کے سخت ترین حالات اور آزمائشیں ملتِ اسلامیہ کے لیے مہمیز کا درجہ رکھتی ہیں اگر یہ کہہ دیا جائے تو بلاشبہ ایک مثبت نظریہ ہوگا۔ عالمی سطح پر قوم جس انداز میں کروٹ لے رہی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے بلکہ معاشرتی نفسیات داں اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ اس قدر سخت حالات کے باوجود مسلمانانِ عالم اپنا وجود اپنی شناخت قائم رکھے ہوئے ہیں جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں رجائیت پسند ہوں اور اس ظلمت اور تاریکی کو روشنی کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔

شاعرِ فطرت شناس

پروفیسر توقیر احمد خاں
(دہلی)

نواز دیوبندی صاحب نہایت شریف النفس اور منکسر المزاج انسان ہیں۔افسوس کہ ان سے میری ملاقات بہت دیر سے ہوئی لیکن پھر بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آل انڈیا مشاعرے کی صدارت کے دوران ان سے ملنا ہوا تو وہ ایک بڑے اچھے اور سچے انسان نکلے۔وہ ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر ہیں۔لوگ ان کا کلام سننے کے لئے دیر تک رکے رہتے ہیں یہ ان کے کلام اور پھر اندازِ تکلم کا اثر ہے۔

شخصی اعتبار سے وہ صرف جاذب نظر ہی نہیں پورے سماج میں بلاتفریق مذہب وملت مقبول ہیں۔لوگ ان کو پسند کرتے اور ان کی شان میں،ان کے اعزاز میں تہنیتی جلسہ منعقد کرتے ہیں۔ان کی شاعری پر مذاکرے اور سمپوزیم کا انعقاد کیا جاتا ہے ابھی چند دنوں کی بات ہے ہندوستان کے ایک مشہور ومعروف سنت مراری باپو نے نواز دیوبندی کا بہت بڑا اعزاز یہ پروگرام منعقد کیا جس میں ان کی شاعری کو سراہا گیا۔اور ان کی شاعری اور ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ہندوستان میں دور عصبیت کے زمانے میں اس طرح کی پذیرائی کم ہی لوگوں کی قسمت میں لکھی گئی۔یہ نواز دیوبندی کا حسنِ اخلاق اور ان کی شاعری کے مقبول ہونے کا ثبوت ہے۔

نواز دیوبندی کی شاعری کے بعض حصوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ وہ شاعری میں بھی ایسے ہی رمز شناس اور فطرت شناس نظر آتے ہیں جس طرح کی روزانہ زندگی میں۔انسانوں کی مزاج شناسی کا یہ ہنر ماہر نفسیات کا حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن نواز دیوبندی کے یہاں اس قسم کی انسان شناسی اور فطرت نگاری ان کی ذہنی طباعی اور انسان فہمی کا حصہ محسوس ہوتی ہے۔وہ خود شائستہ مذاق کے حامل ہیں انسانی عظمت کے مداح ہیں۔انسان کی دو خصلتیں عام ہیں۔اول یہ کہ وہ مغرور متکبر ہے دوسروں کو کم تر سمجھتا ہے وہ خود اس لائق ہو یا نہ ہو اس قسم کے لوگوں کو اخلاقی دنیا میں پسند نہیں کیا جاتا۔دوسرے یہ کہ انسان نہایت خلیق عاجز اور منکسر المزاج ہے وہ کتنا ہی لائق وفائق کیوں نہ ہو لیکن دوسروں کے سامنے عاجزانہ زندگی بسر کرتا ہے خود کو ان کے سامنے کم تر ظاہر کرتا ہے اور دوسروں کی عزت احترام اور قدر کرتا ہے اس قسم کے اصحاب خیر کو دنیا پسند کرتی ہے،قدر ومنزلت سے نوازتی ہے،انھیں اچھے الفاظ سے یاد کرتی ہے۔لیکن نواز دیوبندی کے یہاں باوجود انکسار اور عاجزی کے ایک اور صفت بھی ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص عاجزی اور انکساری کو خوشامد سمجھنے لگتا ہے شاعر اس کے ساتھ عاجزی اور انکساری کے بجائے غرور وتمکنت سے پیش آتا ہے اگرچہ غرور تمکنت ناپسندیدہ عمل ہے لیکن نواز دیوبندی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غرور وتمکنت پر بھی لوگوں سے داد اور واہ واہ حاصل کرلی۔یہ ان کا انداز تحریر اور پیرایۂ اظہار ہے جو لوگوں کے دلوں میں اترتا چلا جاتا ہے اس بات سے ایک اور نصیحت کا انداز ہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ ہماری عاجزی اور انکساری کو کمزوری نہ سمجھیں ہم جتنے عاجز ہیں نافہموں اور مغرور لوگوں کے لئے اتنے ہی مغرور بھی ہیں اور ان کے غرور وتکبر کے آگے جھکنے والے نہیں ہیں۔شوشل میڈیا پر آج کل نواز دیوبندی کا یہ شعر بے حد مقبول اور مشہور ہو رہا ہے۔

اس آدمی سے بڑی تمکنت سے ملتا ہوں
جو عاجزی کو خوشامد سمجھنے لگتا ہے

مفلسی،آلام ومصائب،آفات غم،صبر وگریہ وزاری وغیرہ مقدرات حیات ہیں۔اُردو شاعری میں ایسے نامساعد حالات آتے ہیں جن سے انسان کو ہرگز مفر نہیں اور وہ شاعر کے دشمن ہیں۔مثلاً ولی نے کہا تھا۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبا رکھوتی ہے

گویا مفلسی ایک حقارت آمیز شے ہے اور انسان کو تباہ کرنے والی ہے لیکن نواز دیوبندی اس آفت سے گھبرانے والے نہیں ہیں وہ تو مفلسی کو ایک صبر آزما قدر سمجھتے ہیں اور اسی میں مسرت اور خوشی کا موقع تلاش کرلیتے ہیں۔وہ مفلسی کو ایک گھٹاٹوپ اندھیرا اور اندوہناک تاریکی کے بجائے ایک چراغ رہ گزر اور روشنی دینے والی یعنی ہدایت دینے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں اور اسی میں خوشی خوشی زندگی کاٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مفلسی کا چراغ روشن تھا
زندگی کٹ گئی اجالے میں

اسی طرح سے زندگی کا ایک المیہ مضحکہ خیزی بھی ہے۔اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ لوگ اچھے خاصے لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔نواز دیوبندی نے اس تمسخر میں ایک نکتہ پیدا کیا کہ دنیا شریفوں اور نجیبوں پر قہقہے لگاتی ہے اگرچہ یہ اس کا عمل مستحسن نہیں ہے لیکن اس کو اس کے اِس عمل کی بنا پر کہ اس نے ہنسی کا اظہار کیا اسے قابلِ تشکر گردانتے ہیں۔

سنا یہ ہے کہ شریفوں پہ لوگ ہنستے ہیں
تو شکریہ کہ ہمیں مستند کیا تم نے

یعنی تم نے اگر ہماری ہنسی اڑائی تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم نے ہماری شرافت کو تسلیم کرلیا اور ہمارے شریف ہونے کی سند عطا کردی ہے۔

الزام تراشی اور تہمت لگانا بھی اس دنیا کا شیوہ ہے۔نواز دیوبندی اس بہتان طرازی سے دل برداشتہ نہیں بلکہ حریف مقابل کو چیلنج کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام تر تہمتیں بھی اگر تم ہمارے سر تھوپو گے پھر بھی ہم راستی اور صداقت سے ہٹنے والے نہیں ہیں کیوں کہ حق گوئی کا جو انجام ہوتا ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔

محبت کا جو ہونا ہے وہی انجام لکھ دیجے
جہاں کی تہمتیں ساری ہمارے نام لکھ دیجے

غالب نے کہا تھا۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

شاعر کہتا ہے کہ ہم بڑے وضع دار قسم کے انسان ہیں جو جبلتیں اور عادتیں ہمارے اندر ہیں وہ تمہارے اندر نہیں ہیں بلکہ اس کی مخالف عادتیں اور صورتیں موجود ہیں مثلاً تم نے کبھی غم دیکھا ہی نہیں اور ہم ہیں کہ ہم نے کبھی خوشی نہیں دیکھی تو پھر بتاؤ تمہارا اور ہمارا کیا ساتھ ہے۔یعنی ہم الگ اپنی ایک دنیا کے مالک ہیں۔نواز دیوبندی کا یہ خیال معاشرہ کے دو مخالف طبقوں کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک وہ طبقہ جو مصیبت زدہ ہے اور دوسرا وہ طبقہ جو عیش پرست ہے دونو ں میں بعد المشر قین ہے دونوں کے ایک ہونے کی کوئی صورت اس وقت تک نہیں نکل سکتی جب تک کہ ایک کی صفت دوسرے میں شامل نہ ہو جائے۔نواز دیوبندی کا یہ شعر عمرانی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔

بڑی مشکل سے نکلے گی کوئی صورت تعلق کی
تمہیں رونا نہیں آتا ہمیں ہنسنا نہیں آتا

غرض یہ کہ دخترانِ مادر ایام یا قیامت ہائے گردونی گویا تمام تر مصیبتوں اور پریشانیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود قطب تارے کی طرح اپنی جگہ کھڑی ہے اسے ہلانے اور متزلزل کرنے والی کوئی شے ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوئی وہ ایک ایسی قوم کی طرف بھی اشارہ ہے جو ساری دنیا کی دشمنی اور اتحادی لشکر کشی کے باوجود مٹ نہیں سکی اور یہ بے سرو پا زندگی اور سرسبزی وشادابی اس کی حق گوئی اور صداقت روی کو ثابت کرتی ہے مقصد یہ ہے کہ باطل لاکھ جتن کے باوجود حق کو پامال نہیں کر سکتا۔حق کی روشنی باطل کی تاریکی سے کبھی بھی مٹ نہیں سکتی۔نواز دیوبندی کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔

دو چار کیا ہیں سارے زمانے کے باوجود
ہم مٹ نہیں سکیں گے مٹانے کے باوجود
یہ راز کاش باد مخالف تو جان لے
کیوں جل رہے ہیں تیرے بجھانے کے باوجود

اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرار بولہبی

غرض نواز دیوبندی کی شاعری بڑی رجائیانہ اور حوصلہ افزا زندگی افروز ہے۔اور اپنی تمام تر رمزیت اور ایمائیت کے باوجود ایک واضح پیغام کی حامل ہے''بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی'' ہے۔

نواز دیوبندی کی شاعری کی ایک خاص صفت سادگی اور سہل پسندی ہے جس کو شاید عروضی اصطلاح میں سہل ممتنع کہتے ہیں۔بڑے سے بڑے خیال کو نہایت سادہ اور آسان زبان میں پیش کر دینا نواز دیوبندی کا کمال ہے کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ شعر ہے یا کوئی نثر پارہ۔شبلی نعمانی نے شیخ سعدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایسا شعر جس کی نثر نہ کی جا سکے شاعری کا عروج وکمال ہے ۔نواز دیوبندی انسانی فطرتوں کا نقشہ کھینچنے میں بے مثل ہیں اس لئے ہم انھیں شاعرِ فطرت شناس یعنی Poet of the nature محسوس کرتے ہیں۔

شاعر بڑے حساس دل کا مالک ہوتا ہے اس کی حیثیت پورے جسم میں آنکھ کی سی ہوتی ہے جو سارے زمانے کو دیکھتی ہے،دیکھتی تو ہے ہی لیکن پورے جسم کی نمائندہ بھی ہوتی ہے۔جسم کے کسی حصہ میں کانٹا چبھے وہ حصہ تو شاید نہیں کہے گا لیکن آنکھ اس کی تکلیف کو محسوس کرے گی اور ظاہر بھی کر دے گی اسی لئے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر محبوب سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

ڈاکٹر نواز دیوبندی بھی سماج میں آنکھ کی حیثیت رکھتے ہیں ،وہ مصائب وآلام اور تباہی وبربادی کو دیکھتے ہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں بیان کر دیتے ہیں شاعر کا کام صرف بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ اس کو آگاہ کر دینا اور رہنمائی کرنا بھی ہے؛ کیونکہ شاعر کا سیاسی شعور سب سے زیادہ بیدار ہوتا ہے۔ڈاکٹر نواز دیوبندی نے حالات حاضرہ کی سیاسی پول صرف ایک ہی شعر میں کھول کر رکھ دی ہے۔عدم آپسی انتشار اور عدم اتحاد کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ مصائب صرف تمہارے تماشائی بنے رہنے سے پیدا ہوئے ہیں۔اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ فلکِ ستم پیشہ نے اس مرتبہ ایسے مظالم ڈھائے ہیں جو پچھلے تمام مظالم سے بڑھ کر ہیں۔نواز دیوبندی کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے۔ہماری رائے ہے اگر انھوں نے زندگی میں صرف ایک یہ شعر ہی کہا ہوتا تو ان کو زندہ رکھنے کے لئے کافی تھا۔

اس کے قتل پہ میں بھی چپ تھا میرا اب نمبر آیا
میرے قتل پہ آپ بھی چپ ہیں اگلا نمبر آپ کا ہے

بقیہ : شاعرِ فکر وفن

پرانی تہذیب اور قدیم اقدار وروایات کی پامالی سے انھیں سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ان کے کلام پر اس تکلیف کے اثرات صاف محسوس کئے جا سکتے ہیں۔انہوں نے اپنے اشعار میں بڑی جاں سوزی سے اس کرب کا اظہار کیا ہے۔ساتھ ہی انہوں نے انسانوں کی بے حسی، بے رخی خود غرضی اور منفی رویوں پر سخت مگر دردمندانہ تبصرے بھی کئے ہیں۔ایسے موقعہ پر ان کے اشعار میں طنز کی وہ لہریں کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہو جاتی ہیں۔یہی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کا انداز ہے جو ان کی ایسی معرکتہ الآراء شناخت قائم کرتا ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ڈاکٹر نواز دیوبندی کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔اور اسے ایک مشن کے طور پر انجام دے رہے ہیں۔ان کی علمی ادبی اور تعلیمی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت اتر پردیش نے انھیں اردو اکادمی اتر پردیش کا چیئر مین نامزد کیا ہے۔وہ اس کے لئے بھی لائق مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر نواز دیوبندی اور حقائق زندگی

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم
(علی گڑھ)

گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی کے آغاز میں ایک جاذب نظر قدوقامت والے جوان نواز خاں نے دیوبند میں اسلامیہ اسکول کے قومی جلسوں، دیوبند کے دینی ومذہبی اجلاس میں اپنی خوبصورت آواز، سریلے لب ولہجہ، منفرد اندازِ ترنم اور اشعار پیش کرنے کے سلیقے سے عوام وخواص بالخصوص ادب نواز شخصیات کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا، یہ نواؔز صاحب کی نوجوانی کی ابتدائی منزل تھی۔ نواز بھائی میرے بڑے بھائی کے ہم عمر وہم کلاس ہونے کے باعث میرے لئے ہمیشہ ہی محترم ومکرم رہے۔ اس وقت اگرچہ ان سے دوستانہ مراسم نہیں تھے لیکن تعارف وشناسائی ضرور تھی، حدودِ دیوبند میں کوئی جلسہ یا مشاعرہ کسی بھی عنوان سے ہوتا تو اس میں راقم جیسے دسیوں جوان محض اس نشست کی رونق افزونی کے لئے موجود رہتے تو اسٹیج پر آنے والے ہر قسم کے حضرات سے شناسائی ہونا قدرتی بات تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تعارف وشناسائی بے تکلفی اور پھر دوستی ویاری میں تبدیل ہونے لگی۔ نواؔز صاحب سے ہزار بے تکلفی کے باوجود ان کے پُر رعب ووجیہہ شخصیت کے باعث کچھ حدود متعین رہیں جس میں وہ ہمیشہ محدود رہے اور یہ بات قسم کھا کر کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی رنگ میں کبھی بھی اس شخص کو حدود سے باہر جاتے نہیں دیکھا گیا۔ عاجزی وانکساری کے جس پیکر کو ان کے والدین نے باندازِ تربیت ان کی ردا بنا کر انہیں انسان بننے کی تلقین کی تھی اس سے انہوں نے کبھی بھی اپنے کو باہر نہیں نکلنے دیا۔ میری نظر میں نواز صاحب کا وہ زمانہ بھی ہے جب انہیں ان کے اساتذہ واکابرین 'نواز'' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ لمبی 'جی' کہہ کر سراپا ادب بن جاتے اور وہ زمانہ بھی جب بڑے سے بڑے حکمراں ان کے سامنے دست بستہ کھڑے رہنے کو اپنی سعادت سمجھتے، نواز بھائی نہ تو تب کبھی کسی خفت کا شکار ہوئے جب وہ چھوٹے سمجھے جاتے تھے اور نہ ہی اس وقت کسی بڑے پن کے احساس میں مبتلا ہوئے جب ''بڑے بڑے'' طرم خاں ان کے آگے پیچھے پھرنے کو اپنی خوش نصیبی سمجھتے۔

۱۶؍جولائی ۱۹۵۶ء کو دیوبند میں عبدالسبحان خاں صاحب کے گھر میں نواز صاحب نے آنکھیں کھولیں، عبدالسبحان خاں صاحب پرانی طرز کے غیور طبیعت از سرتا پا ایسے پٹھان تھے جنہیں ہر حالت میں اپنی نسلی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی رہائش کے لئے بھی دیوبند کے بالائی محلّہ قلعہ کے اس حصہ کو منتخب کیا جو دیوبند میں سب سے بلند وبالا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نوازا جس کا سلسلہ نواؔز پر آکر منتہا ہوا تو میرے خیال میں اس وقت ان کی یہ خواہش رب العزت کے حضور بہ شکلِ ''دعائے نیم شبی'' ضرور رہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس لختِ جگر کو بھی وہ مقام دے جو انکساری وعاجزی کو زیب تن کر کے انسانوں میں بلند مقام حاصل کرے۔ یہ وہ خصوصی وصف ہے، جس کو پیش نظر رکھ کر نواز دیوبندی کی شاعری کا جائزہ لینا۔

نواز صاحب نے جب شاعری شروع کی اس وقت دیوبند کے عوام وخواص اردو شعروادب کی چاشنی سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مختلف ناموں سے ادبی تنظیمیں وجود میں تھیں۔ کم وبیش ہر ہفتہ یا مہینہ میں کم از کم ایک بار کسی نہ کسی جگہ طرحی یا غیر طرحی نشستیں ہوتیں جن میں نوآموز شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا جاتا۔ ایسی نشستوں میں اپنے کلام کو معتبر بنانے کے لئے دیوبند کے بہت سے نوجوان طبع آزمائی کرتے جن میں نواز خاں اور ان کے برادرِ بزرگ عمر دراز خاں صاحب بھی شرکت کرتے۔ میری یادداشت میں وہ منظر تا ہنوز محفوظ ہے جب علامہ انور صابری اپنے داماد مولانا شمیم احمد صاحب کے گھر پر تشریف فرما تھے۔ نواز صاحب چند دوستوں کے ہمراہ صابری صاحب کے پاس تشریف لائے اور آکر یہ عرض داشت صابری صاحب کے سامنے پیش کی کہ آج ایک طرحی نشست میں غزل پڑھنی ہے جس کا مطلع نواز صاحب نے سنایا۔ وقت یہ پیش آرہی تھی کہ مقطع کا ایک مصرع موزوں ہو چکا تھا، دوسرا نہیں بن پا رہا تھا 'ردیف وقافیہ'' سنانی ہے'' سہانی ہے'' جیسے الفاظ تھے۔ صابری صاحب نے نواز صاحب سے پہلا مصرعہ سنا جو ''رونے سے نہیں حاصل ہنس ہنس کے دعا مانگو'' تھا۔ اس پر صابری صاحب نے برجستہ گرہ لگائی 'گولا کھ نواز اپنی پر درد کہانی ہے۔'' غزل مکمل ہوگئی۔

اس قسم کے ماحول میں نواز صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ نواز صاحب کی بلند وبالا آواز نے دیوبند کی حدود سے باہر قدم نکال کر سامعین کو ان کا گرویدہ بنایا تو روز بہ روز ارتقاء کا سفر کرتے ہوئے فی الحقیقت فضا کے دوش پر سوار ہو کر اس نے نواز صاحب کو بین الاقوامی شہرت کا حامل بنا دیا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اس شہرت نے ان کے نفس کو پھولنے کا موقع نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے منکسر المزاجی کے ان کے وصف کو بھی اس طرح تقویت عطا کی کہ وہ نہ تو اپنی شہرت پر اترائے اور نہ ہی انہوں نے نخوت وتکبر کا اظہار کیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ انہیں مزید نوازتا رہا اور انہوں نے بچپن میں جو خواب دیکھے تھے ان کی تکمیل اس کی شہرت کے ذریعہ کرتے رہے۔

باشندگان دیوبند کے بارے میں جب بات کی جاتی ہے تو کالو قلندر شاہ کے مزار پر آویزاں ایک قطعہ کے مصرعہ ''آئندگانِ رحمت، باشندگان زحمت'' کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ پر جب کسی کی عزت وشہرت کا تذکرہ ہوتا ہے تو کسی شاعر کے شعر

سر پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

کو پیش کیا جاتا ہے مگر نواز بھائی کا معاملہ ان دونوں کہاوتوں کے برعکس ان کی اپنی زبان میں

سب کا خلوص، سب کی عنایت مجھے ملی
میں خوش نصیب ہوں کہ محبت مجھے ملی

وہ اور ہوں گے جن کو وطن چھوڑنا پڑا
اپنے وطن میں رہ کے بھی عزت مجھے ملی

صد فیصد مبنی برحقیقت ہے۔

نواز صاحب نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دوسروں کی غم گساری سے ان کی زندگی کا سفر شروع ہوا۔نواز صاحب نے اس غم گساری کو اپنی زندگی کا جزوِلازم بنالیا۔ان کے والد معاشی طور پر زیادہ خوش حال نہیں تھے،نواز صاحب کو بچپن سے ہی یہ احساس شعوری طور پر حاصل تھا۔اس کا حل انہوں نے اس طریقہ پر نکالا کہ اپنی تعلیم کا سفر جاری رکھتے ہوئے دوسروں کی تعلیمی ترقیوں کی راہ تلاش کرتے رہے۔چھٹی کلاس کے طالب علم کو خود بھی پڑھنا اور اپنے ہم درسوں یا محلے کے بچوں کو پڑھا کر چند روپیوں کی شکل میں ماہانہ معاوضہ لے کر اللے تللے میں نہیں بلکہ اپنی تعلیمی ضروریات پوری کرنے میں صرف کرنا نواز دیوبندی صاحب کی طالب علمانہ زندگی کا مشغلہ رہا۔

نواز بھائی فطری طور پر ایک تخلیق کار تھے،اس کا ثبوت ان کے زمانہ طالب علمی کے ان دنوں میں اس وقت فراہم ہو چکا تھا جب وہ گیارہویں یا بارہویں کلاس کے طالب علم رہتے ہوئے ایک تصویری مقابلے میں شامل ہوکر صوبائی سطح پر گورنر اتر پردیش چنا ریڈی کے ہاتھوں اول انعام حاصل کر چکے تھے لیکن ان کا یہ انعام ہی ان کی زندگی میں ایسے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا جس نے بے حقیقت تصویروں کو حقیقی تصورات کا رنگ شعری تخلیق کی صورت میں دے دیا۔ہوا یہ کہ جب انہوں نے اپنے والد صاحب مرحوم کو اس انعام کی اطلاع دی اور یہ بتایا کہ مصوری میں انہیں یہ انعام ملا تو انہیں اپنے والد کی فکر آلود جبیں کا یہ پیغام شعوری طور پر پڑھنے میں دیر نہیں لگی کہ 'یہ کوئی قابل قدر کارنامہ نہیں''اس کے بعد انہوں نے اپنے تصویری ذوق سے توبہ کی اطلاع والد صاحب کو سنائی تو والد مرحوم کی ''دعائے سحر گاہی''ان کی زندگی کا رخت سفر بن گئی اور وہ اپنے اشعار کے ذریعہ تصوراتی شوق کی آبیاری میں مصروف ہوگئے جسے اللہ تعالیٰ نے قبولیت وشہرت سے خوب خوب نوازا۔

بنیادی طور پر غزل سے شاعری کے سفر کی ابتداء کرنے والے نواز صاحب نے اپنے آپ کو غزل کی چہار دیواری تک ہی محدود نہیں ہونے دیا،انہوں نے اپنی زندگی کا مشن ہر گام پر اپنے ہی تخلیق کردہ شعر

انجام اس کے ہاتھ ہے آغاز کرکے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں سے ہی پرواز کرکے دیکھ

کو بنایا،ان کے پیش نظر ہر صنف ادب میں بلکہ ہر تعمیری کام میں وہ عمل رہا جس سے ان کے دینی ذوق کی تسکین ہو سکے۔

خدا سے نہ محشر میں شرمندگی ہو
غزل میں بھی ایسا ہنر چاہتے ہیں

وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو واقعتاً اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہو کہ اسے ایک دن محشر میں رب ذوالجلال والاکرام کے حضور حاضر ہوکر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

نواز دیوبندی کی شاعری کا ایک وصف اپنے مسلک وعقائد کی سلامتی کے ساتھ مذہبی افکار کو بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ نظم کرنا بھی ہے۔نواز صاحب دیگر اصناف شاعری کے ساتھ ساتھ بہت عمدہ نعت گو بھی ہیں۔ان کے اشعار میں ان کے دلی جذبات کی ترجمانی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔وہ جہاں نعت نبی ﷺ میں سرشار ہوکر اپنی اس دلی تمنا کا اظہار

میں عشق ایسا کروں سرفراز ہوجاؤں
خدا کرے کہ محمد نواز ہوجاؤں

کی شکل میں ذومعنی انداز میں پیش کرتے ہیں وہیں ان کے سلام ''السلام،السلام،السلام''نے برصغیر ہندوپاک میں ایسی شہرت حاصل کی کہ وہ بلاتخصیص مسلک وملت بہت سے ان مدارس ومکاتب میں بھی بلاتکلف انتہائی عجز ونیاز کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جو نواز صاحب کے لاحقے کو اپنی مسلکی مجبوریوں کے سبب پسند نہیں کرتے۔نواز صاحب توحید ورسالت میں باہمی ارتباط کو بہت ہی سہل انداز میں جس خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے فرماتے ہیں

درِ کبریا پہ جھکاؤ سر،درِ مصطفیٰ سے لگاؤ دل
یہ جو سر ہے اس کو بناؤ سر یہ جو دل ہے اس کو بناؤ دل

نواز صاحب نے جہاں دل سے حمد باری تعالیٰ میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ:

بھرپور شکر میں ہی ادا کر نہیں سکا
اس نے نوازنے میں تو کوئی کمی نہ کی

وہیں ان کی دلی خواہش کا اظہار اس نعتیہ شعر سے لگایئے کہ

دل حزیں تو جو دنیا میں الجھا رہتا ہے
خدا کرے کہ تجھے عشق مصطفیٰ ہوجائے

نواز صاحب نے کم وبیش بیس برس قبل ایک نعت کہی جس کے درج ذیل شعر

دو آنسو بہیں جن سے عشق نبی میں
ان آنکھوں کی گاڑھی کمائی کے صدقے

ایک زمانے میں بہت مقبولیت حاصل کی۔اگرچہ نواز صاحب نے اپنی شاعری کو مذہب کی دیواروں میں حصار بند نہیں کیا لیکن اشعار کی طنابوں کو اتنا دراز بھی نہیں کیا کہ لامذہبیت یا مذہبی افکار سے متصادم کوئی فکر اس میں سما سکے۔زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا ادراک نواز صاحب کی شاعری میں ملتا ہے۔اب تو وہ عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جو تجربات کی بلندیوں اور زمانے کے اچھا برا سمجھنے کی معراج کہلاتی ہے۔لیکن اتنا احساس انہیں عمر کی چالیسویں منزل پر ہو چکا تھا کہ

وہ مجھے اپنے برابر نہیں ہونے دیتا
ایک قطرے کو سمندر نہیں ہونے دیتا

اسی کے ساتھ وہ اپنی اس انا اور غیرت کا اظہار کئے بنا بھی نہیں رہ سکے کہ

میں قلندر ہوں بہر طور یہ سچ ہے لیکن
یہ تصور ہی قلندر نہیں ہونے دیتا

سماج کی بہت سی حقیقتیں، زندگی کے بہت سے مسائل ومصائب اور روزمرہ کی تلخ وتند زندگی کو اشعار کا جامہ پہنانے میں بھی نواز صاحب نے فنکارانہ مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ موجودہ دور کی ہر گھر کی کہانی نے جس حقیقت کا روپ اختیار کرلیا ہے نواز صاحب نے اسے بہت ہی سادہ لفظوں میں پروکر پورے سماج کے درد کی عکاسی کی

خود کو کتنا چھوٹا کرنا پڑتا ہے
بیٹے سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے

جیسے بہت سے اشعار سے کی ہے۔

سیاست سے نواز صاحب کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن وہ ملکی وبین الاقوامی سیاسیات سے لاتعلق بھی نہیں۔ ۸۴ء میں اس وقت کی وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے قتل کے پس منظر میں نواز صاحب کے شعر

اب تو مان لیجئے گا وقت کا یہ فتویٰ ہے
حق طلب تو کرتے ہیں ہم دغا نہیں دیتے

نے پوری ملت کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ نہ خود شہرت حاصل کی بلکہ نواز صاحب کو بھی شہرت کی بلندیوں پر پہنچانے میں تعاون دیا۔

شاعری کے ساتھ ساتھ نواز صاحب کی اپنی نجی زندگی ایسے تعلیمی ورفاہی کاموں کے لئے وقف رہی جس نے ملت کو جہالت کے بھنور سے نکالنے کی راہیں تلاش کیں۔ طالب علمانہ زندگی میں ہی ان کے کچھ خواب تھے جن میں رنگ سازی کے لئے ان کی بے چین طبیعت نے مصوری کا سہارا لیا تھا۔ اس وقت انہیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ کاغذ پر رنگوں کی آمیزش کاغذ کو تو خوبصورت بنا سکتی ہے لیکن اس کے ذریعہ زندگی کے حقائق کا دھارا نہیں موڑا جاسکتا۔ غالباً اسی تصور کے پیش نظر نواز صاحب نے مصنوعی خاکوں میں رنگ سازی کے بجائے ملت کے نونہالوں کو پڑھائی کی راہ پر لگانے کی کوشش کی۔ ایک بہترین ٹیوٹر ہونے کی وجہ سے وہ صرف اپنوں میں ہی نہیں بلکہ غیروں میں بھی مقبول ہوئے۔ تعلیم اور شاعری کی دو پہیہ گاڑی کا سفر جب عملی شاہراہوں پر گامزن ہوا تو خوش نصیبی سے انہیں حسیب صدیقی صاحب جیسا سرپرست مہیا ہوگیا، جو مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کے منیجر کی حیثیت سے قصبہ کی اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے میں مسلسل کوشاں رہے ان کے سامنے نواز صاحب نے اپنے خوبصورت خوابوں کا پٹارا کھولا تو انہوں نے ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دھارنے کے لئے ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔

مسلم فنڈ کمرشیل انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں ملت کے نونہالوں کو ہنرمند بنانے کی دھن نے اسے منزل کا پہلا پڑاؤ بنایا۔ اس کے بعد مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ مسلم فنڈ کے تعاون سے، مدنی آئی ہسپتال اور پھر پبلک گرلز پبلک اسکول وہ مقامات تھے جہاں انہوں نے تھوڑا ٹھہراؤ کر کے علم کی شمعوں کو گھر گھر پہنچانے میں تعاون بھی دیا اور انہیں اداروں کے ذریعہ بہت سے جوانوں کو معاش سے بھی وابستہ کیا۔ شاعری کی طرح ان کے اس جذبہ خدمت کو شہرت بھی ملی۔ ان کے اس جذبہ سے متاثر ہوکر مظفرنگر میں نواب عظمت علی وقف کے ذریعہ قائم تعلیمی ادارے کے ذمہ داران نے اس ادارے کی بہتری ونیک نامی کے لئے اس کی باگ ڈور نواز صاحب کے ہاتھوں میں دی۔ نواز صاحب نے نواب عظمت علی گرلز اسکول کا منیجر بن کر اسے ہائی اسکول، انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج کی سطح تک نہایت معیاری انداز میں پہنچایا۔ ہزارہا بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے فن کار نواز دیوبندی کو اس کے بعد بہت سے ایسے ملّی اداروں کی سوغات ملی جو ملت کے بیسیوں ہزار سے زائد تشنگان علوم طلباء وطالبات کی سیرابی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں جن میں بیشتر ادارے معیار کے بلند مقام پر ہیں۔ ان سب پر مستزاد دیوبند میں نواز صاحب کا قائم کردہ ''نواز گرلز پبلک اسکول'' جس نے الحمدللہ کم عمری میں ہی شباب کی منزلیں طے کرنی شروع کردی ہیں۔ اس ادارے نے شہر کے تعلیمی معیار کو بھی بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور بچیوں کی تربیت کا بھی جداگانہ انداز اختیار کیا۔ علاوہ ازیں گذشتہ چند برسوں سے اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین کی شکل میں نواز صاحب نے اپنی شبانہ روز کوششوں سے اس کو ایک نئی سمت عطا کی۔

بہرحال نواز صاحب آج عمر کی ساٹھ منزل پار کررہے ہیں، جس میں ان کے وسیع ترین تجربات سے ملت کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ اللہ کرے وہ اپنے مشن میں مخلص رہیں اور للّٰہیت وخلوص کے ساتھ نیک کام پوری تندہی کے ساتھ انجام دیتے رہیں اور ان کے خیرخواہ ہر سال ۱۶ر جولائی کو انہیں

''تم جیو ہزاروں سال، سال کے دن ہوں پچاس ہزار''

کی دعاء سے نوازتے رہیں۔

ایک فعال محسن اردو

محترم ڈاکٹر نواز دیوبندی کے جوش وجذبے، کام کرنے کی صلاحیت وفعالیت اور بے لوث خدمت کے جذبے کو دیکھتے ہوئے ان کے لیے میر تقی میر کا یہ شعر مجھے بہت موزوں لگتا ہے اور میں اس شعر کے ساتھ ان کے علم وفن کی خدمات اور انسانی ہمدردی کے پُرخلوص ومخلصانہ جذبات کو ہمیشہ سلام کرتا رہوں گا۔ میں شعر کو ہلکی سی ترمیم کے ساتھ یوں پڑھنا چاہوں گا:

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی

غزل کے اجالے کا شاعر

ڈاکٹرعنبرین حسیب عنبؔر
(کراچی)

نواز دیوبندی صاحب کا شمار عصرِ حاضر میں بھارت کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ مشاعروں میں گاہے بگاہے نواز صاحب سے ہماری کئی ملاقاتیں رہی ہیں اور ہم نے انھیں وضع دار، بردبار اور کم گو انسان پایا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بقول نواز صاحب

ایسی ویسی باتوں سے تو اچھا ہے خاموش رہو
یا پھر ایسی بات کہو جو خاموشی سے اچھی ہو

لہٰذا وہ اس بات کا خیال رکھتے ہوئے شعر میں جو بات کرتے ہیں وہ خاموشی سے بہتر ہوتی ہے اسی لئے سامع یا قاری انھیں داد دئے بغیر نہیں رہ پاتا۔

نواز دیوبندی صاحب غزل گو شاعر ہیں اور غزل کو سب سے سخت جان صنف ادب کہا جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر زمانے کے تغیرات کو بیان کرنے کے لئے غالب کے اس مصرعے کو غزل مخالفت کا جواز بنالیا جاتا ہے کہ ع

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے

مگر اس وقت غزل کی تنگ دامنی کا گلہ کرنے والے غالب کے اس شعر کو بھول جاتے ہیں جس میں غالب نے غزل کے فن کو نہایت خلاقانہ انداز میں پیش کیا ہے

مقصد ہے ناز وغمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مگر نواز صاحب غزل کی اس خوبی سے واقف ہیں، لہٰذا ان کی شاعری میں ایک طرف غزل کے مخصوص مضامین فنائیت کے ساتھ دل کو لبھاتے ہیں تو دوسری جانب عصر حاضر کے مسائل اور انسان کے کرب کا اظہار تندی کے ساتھ دل کو لرزاتا ہے۔ گویا ان کی شاعری کا ایک نمایاں وصف روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے جو اُن کی غزل کو مقررہ موضوعات کا پابند بنانے کے بجائے آگے نکل کر غزل کے موضوعات کو وسعت دیتا ہے۔ اول الذکر میں مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے:

تیرے آنے کی جب خبر مہکے
تیری خوشبو سے سارا گھر مہکے
شام مہکے ترے تصور سے
شام کے بعد پھر سحر مہکے
اُن کو دیکھا تھا خواب میں اک دن
آج تک روشنی ہے آنکھوں میں
ادائے ناز تو دیکھو کہ جب کلام کیا
نظر کسی کی طرف کی مجھے سلام کیا
وہ موجود نہیں تھے پھر بھی ان سے بیٹھ کے باتیں کیں
شوقِ دید میں اکثر ہم نے آنکھوں کو حیران کیا
تیری یادوں سے کھیلتے کب تک
تھک کے تکیے پہ سوگئے آنسو

ان اشعار کو بار بار پڑھئے اور لطف لیجئے۔ ان اشعار میں تجربات اور احساسات کو شعری رچاؤ، لوچ، نغمگی اور لطافت کے ساتھ سلیقے سے بیان کیا گیا ہے جو پڑھنے والوں کو کیف میں مبتلا کردیتا ہے۔ تاہم نواز صاحب کے ایسے اشعار میں تغزل روایتی غزل کی معنوی اور لفظیاتی فضا سے ترتیب نہیں پایا بلکہ یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ غزل کے آداب اور اس کے روایتی مزاج کو خوب سمجھتے ہوئے جدید زبان میں خوب صورت شعر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ جب اس شاعری میں روحِ عصر شامل ہوتی ہے اور وہ عصر حاضر کے موضوعات اور مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں تو یہ نرم لہجہ تند ہوجاتا ہے اور غزل کے روایتی مزاج کی بدلی ہوئی صورت نمایاں ہوجاتی ہے وہ نئے موضوعات کی ترجمانی کے لئے نیا انداز اختیار کرلیتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں۔

مجھے اقبال کا لہجہ عطا کر
مرے اشعار کو آفاقیت دے

حقیقت یہ بھی ہے کہ بدامنی، خوف، دہشت، وحشت کے اس دور میں اگر کوئی شاعر اپنے عصری مسائل سے سروکار نہ رکھے تو اسے ذی ہوش سمجھنے میں تأمل ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آج اردو غزل جدید انسان کے دکھ سکھ، ثواب وعذاب، آلام ومسائل، خوف، محرومی، اجنبیت، تنہائی، بے اعتباری، افلاس، دہشت، عدم تحفظ اور دم توڑتی اقدار کے تمام رنگوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ن۔م۔ راشد کے ان الفاظ کی تائید کرتی نظر آتی ہے کہ

''ہم بلاشبہ غالبؔ اور اقبالؔ جیسے عظیم شاعر نہیں ہیں لیکن ہمیں اس کمی کا افسوس بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہمارے شاعر اس قابل ہیں کہ وہ ہر موضوع پر لکھیں۔''

نواز دیوبندی کے ہاں بھی ہمارے عہد کے تمام سماجی اور معاشرتی مسائل اشعار کے قالب میں ڈھلتے نظر آتے ہیں اور وہ اس اصول کے پابند محسوس ہوتے ہیں کہ

بُری ہے وہ خوشی غفلت ہو جس سے
وہ غم اچھا ہے جو بیدار کردے

آیئے عصرِ حاضر کو آئینہ دکھاتے ہوئے یہ اشعار پڑھتے ہیں جن میں ملال اور تأسف بھی ہے اور تبصرہ بھی۔ ان اشعار میں آدمیت سے تہی ہوتے معاشرے کے خط وخال دیکھئے۔

بھیڑ میں تو اضافہ ہوا
آدمی کی کمی ہوگئی
ہم کو تو قتل ہو کے بھی شرمندگی ہے دوست
اور تو ہے اپنے آپ کو قاتل بتا کے خوش

یہ میرا شہر ہے شہر سیاست
یہاں بیدار بھی سوئے ہوئے ہیں
اُف مرے شہر کے امیروں نے
بھیک بھی چھین لی گداؤں سے
رمق ہو ان میں کہیں زندگی کی کچھ باقی
ہر ایک لاش کو خنجر چُبھا کے دیکھا ہے

ان اشعار میں معاشرے کی شکست و ریخت، انسانیت کی تذلیل اپنی پوری سفاکی کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے اور یہ احساس دلاتی ہے کہ انسان سائنس اور ٹیکنالوجی میں بے شک ترقی کی راہ پر گامزن ہو مگر انسانیت کی راہ اُس کی تنزلی کا پتہ دے رہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان اشعار میں نواز صاحب اپنے معاشرے کو گرفت میں لیتے ہیں مگر مسلم معاشرہ اپنے اندر ایک بین الاقوامیت بھی رکھتا ہے لہٰذا ان اشعار کی فضا اور کرب مقامی یا غیر مانوس نہیں۔ اس کرب کو نواز صاحب کی نسل سب سے زیادہ محسوس کر رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ وہ آخری نسل ہے جس نے معاشرے کے بگاڑ کو جھیلا ہے اور اس کے اثرات اس نسل کی روح پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکے ہیں۔ اس کا کرب نواز صاحب سے ایسے شعر کہلواتا ہے:

وہ شجر، تنہا شجر چوپال کا
اس شجر کا آخری پتا ہوں میں

واقعی بھری پری چوپال کی رونق کا گواہ اس چوپال کے اجڑ جانے کے بعد سوکھے شجر کا آخری پتہ اس رونق اور اُجاڑ دنیا کے فرق کو سب سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اس نسل کے بعد کی نسل کے حصے میں صرف اُجڑی چوپالیں آئیں اور اب آنے والی نسلیں وہ بدقسمت نسلیں ہیں، جو سمجھیں گی کہ دنیا ہمیشہ سے اتنی ہی اُجاڑ، ویران اور بے رنگ و رونق تھی۔ مگر نواز صاحب کی نسل تہذیب و اقدار کی ٹوٹ پھوٹ سے جس طرح ریزہ ریزہ ہوتی جا رہی ہے یہ کرب کسی اور نسل کے حصے میں نہیں آیا اور اسی نواز صاحب اس ٹوٹ پھوٹ پر نوحہ کناں ہیں۔

بیٹی کی ضد کے آگے ماں چُپ ہو جاتی ہے لیکن
ننگے سر کی محرومی پر آنچل رونے لگتا ہے
بزرگوں کی کوئی سنتا نہیں ہے اس زمانے میں
بڑے چھوٹوں کے بارے میں زباں دینے سے ڈرتے ہیں
پرندوں کو اڑانے کے لئے وہ
درختوں کو جلانا چاہتا ہے
یہ دور سخت و تلخ کلامی کا دور ہے
لہجوں کی نرم طرز ادا کیا کرے گی آج

ظاہر ہے کہ یہ ٹوٹ پھوٹ اُس مایوس کن اجنبیت اور تنہائی کی طرف جاتی ہے جو جدید انسان کا مقدر بن چکی ہے۔ اپنے شہر، محلے یہاں تک کہ گھر میں بھی یہ تنہائی آسیب کی طرح سایہ فگن رہتی ہے۔

دیتا ہوں میں اپنے ہی دروازے پہ دستک
جب شہر میں کھلتا نہیں در اور کسی کا
فقط احساس دستک دے رہا ہے
ٹھہر اے دل ! ٹھہر کوئی نہیں ہے

یہی نہیں بلکہ نواز صاحب عالمی صورت حال سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ سپر پاور کی یکتائی، نائن الیون اور ہتھیاروں کی فروخت کا ایندھن بنانے کے لئے ہوئی سازشوں کا انھیں خوب ادراک ہے۔

آندھی نے روشنی کی حمایت تو کی بہت
لیکن کوئی چراغ جلانے نہیں دیا
راضی تھا میں بھی اور مرا دشمن بھی صلح پر
کچھ دوستوں نے ہاتھ ملانے نہیں دیا
تب کہیں جا کر ہوئی تسلیم میری رہبری
راستے میں قافلے سو بار لٹوانے پڑے

سچ یہی ہے کہ آج کے سفاک دور میں راہبر ہی رہزن ہیں اور اپنی بڑائی تسلیم کرانے کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں لہٰذا سرعام حمایت اور در پردہ تباہی، دشمنی کو بڑھاوا دیتے ہوئے نام نہاد دوست جس صورت حال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اُس سے ہم واقف ہیں۔ لیکن انسانی رویوں کی سفاکی، انسان کی مجموعی پستی اور ذلت، اقدار کی شکست و ریخت، مقامی اور عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں کے گہرے ادراک کے باوجود نواز صاحب کے ہاں قنوطیت یا مایوسی نہیں ملتی۔ ان کے ہاں عصر حاضر کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان کی ذات، نقطۂ نظر اور ردِعمل بھی ملتا ہے جو اعلیٰ اقدار حیات کی ترجمانی میں ڈھل جاتا ہے

ہے لاکھ تیرگی کا تسلط مگر نواز
تم شہر میں غزل کے اُجالے لئے پھرو
لاکھ دام بڑھ جائیں خوشبوؤں کے پھولوں سے
خوشبوؤں پہ واجب ہے احترام پھولوں کا
یوں تو مرنے کے سو طریقے ہیں
کوئی صورت بتاؤ جینے کی

ان اشعار کو پڑھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں کہ:

دراصل شاعری وہ ہے جو جینے میں اعتقاد پیدا کر دے، جینے کو سہل بلکہ خوش گوار بنائے، نیکی اور ترقی کے راستے کشادہ کرے، دوسرے انسانوں سے قربت پیدا کرے اور انسانی طبائع کی بے اعتدالیوں میں حسن اور توازن کی شان پیدا کرے، معاشرے پر تنقید کرے مگر اس تنقید میں دل سوزی اور ہمدردی شامل ہو۔

نواز دیوبندی صاحب کی شاعری میں یہ تمام وصف شعری محاسن کے ساتھ ہمیں ملتے ہیں اور نواز صاحب کے اس دعوے کی تائید کرتے نظر آتے ہیں کہ

گر اوروں کے آنسو مری آنکھوں میں نہ ہوتے
کچھ اور ہی ہوتا میں سخنور نہیں ہوتا

''علاجِ رنج وغم''

(ڈاکٹرنواز دیوبندی کے نظمیہ کلام سے بصد اختصار)

فاری شا (راولپنڈی)

''عید''

علاج رنج وغم ہوتو ہماری عید ہو جائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے

کسی گرتے ہوئے کو ہم سنبھالیں تو سکوں پائیں
کوئی گر جائے اور اس کو اٹھالیں تو سکوں پائیں
کسی کے پاؤں سے کانٹا نکالیں تو سکوں پائیں
کسی کے غم کو اپنا غم بنالیں تو سکوں پائیں

کسی کا دُورغم ہوتو ہماری عید ہو جائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے

بہت سوئے ہیں کانٹوں پر کبھی بستر تو مل جائے
سرہانے ہاتھ رکھتے ہیں کوئی پتھر تو مل جائے
جوفٹ پاتھوں پہ سوتے ہیں انہیں اک گھر تو مل جائے
نہ دے دستار لیکن اُن کو، مولا! سر تو مل جائے

ہجومِ دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے
علاج رنج وغم ہوتو ہماری عید ہو جائے

جو محروم تبسم ہیں تبسم ریز ہو جائیں
وفا اور پیار کے نغمے سحر انگیز ہو جائیں
محبت اور اخوت کی ہوائیں تیز ہو جائیں
جو ہم نے شعر لکھے ہیں وہ دستاویز ہو جائیں

نہ کوئی آنکھ نم ہوتو ہماری عید ہوجائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے

کسی کے سر پر غم کا اور بیماری کا سورج ہے
کسی کے سر پر ناداری کا، لاچاری کا سورج ہے
کسی کے سر پہ مشکل اور دشواری کا سورج ہے
کسی کے سر پہ غربت اور بے کاری کا سورج ہے

اگر یہ دھوپ کم ہوتو ہماری عید ہو جائے
علاجِ رنج وغم ہوتو ہماری عید ہو جائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے

اندھیرے جن چراغوں سے اُجالے چھین لیتے ہیں
لٹیرے جن کے کنگن اور بالے چھین لیتے ہیں
کبھی پانی کبھی جن کے پیالے چھین لیتے ہیں
ستم گر جن کے منہ کے بھی نوالے چھین لیتے ہیں

بلند ان کا علَم ہوتو ہماری عید ہو جائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہو جائے

یہ غم بھی ناز کرتے ہیں خوشی بھی ناز کرتی ہے
وہ جس کی مفلسی پر مفلسی بھی ناز کرتی ہے
وہ جس کے صبر پر دریا دلی بھی ناز کرتی ہے
شکم وہ جس پہ خود فاقہ کشی بھی ناز کرتی ہے

شکم وہ پُر شکم ہوتو ہماری عید ہو جائے
کسی کا دردکم ہوتو ہماری عید ہوجائے

پنجرے کادروازہ

مرے پاس ایک پنجرہ ہے
اوراس میں اک پرندہ ہے
مجھے بھی پیار ہے اس سے
اسے بھی پیار ہے مجھ سے
پرندے کو اجازت ہے
کہ اس کا جب جی چاہے وہ اڑ جائے
مرے پنجرے کادروازہ
کبھی بھی بند نہیں ہوتا
نہ پر کترے کبھی اس کے
نہ پر باندھے کبھی میں نے
وہ اڑتا ہے مگر وہ لوٹ کر
پنجرے میں آتا ہے
زمانے کو یہ حیرت ہے
کہ یہ اڑ کیوں نہیں جاتا
زمانے کو یہ بتلاؤ زمانے کو یہ سمجھاؤ
کہ میں نے اس کے پیروں میں محبت باندھ رکھی ہے

○

☆ ہندوستان کے مشہور اخبار'' دینک بھاسکر" نے عالمی شہرت یافتہ آرٹسٹ اوبجیت دتّ (کول کتہ) کی بنائی ہوئی تصویر پر ڈاکٹر نواز دیوبندی سے زیرِ نظر نظم لکھوا کر ہندی میں اہتمام سے شائع کی۔

☆

دوستو

دوستو گھر سے باہر نہ نکلیں
گھر میں رہ کر ہی آگے بڑھیں گے
ہار جائے گا ہم سے کورونا
سب اگر اس سے مل کر لڑیں گے

''گنتی''

سب سے پہلی گنتی ایک
کلمہ پڑھ اور بن جا نیک

دو کی گنتی نمبر دو
نام خدا کا لے کر سو

تین کی گنتی نمبر تین
سچّا قرآں سچا دین

تین کو لکھ کے چار نہ بھول
چار خلیفہ چار رسولؐ

پانچ سے چار کا گہرا میل
بچو کھیلو اچھے کھیل

چھ کی گنتی سات سے پہلے
سوچ سمجھ ہر بات سے پہلے

کہتی ہے تاریخ یہ صاحب
دنیا میں ہیں سات عجائب

اب ایسی کوشش کی جائے
آٹھواں نمبر تو کہلائے

نو کی ہے کچھ بات نرالی
جھوٹ نہ بولو نہ دو گالی

زیرو کا احسان بڑا ہے
دس میں ایک کا مان بڑا ہے

○

''یک مطلعٔ خورشید''

(عاشقِ رسولؐ سرسید احمد خان کی فارسی نعت)

- ترجمہ -

رؤف خیر

(حیدرآباد، دکن)

فلاطوں طفلکی باشد بہ یونانی کہ من دارم
مسیحا رشک می دارد بہ درمانی کہ من دارم

زِکفر من چہ می خواہی ، زِ ایمانم چہ می پُرسی
ھمان یک جلوۂ عشق است، ایمانی کہ من دارم

خدا درام ، دل بریاں زعشق مصطفٰے دارم
ندارد ہیچ کا فر سازو سامانی کہ من دارم

زِ جبریل امیں قرآں بہ پیغامی نمی خواہم
ھمم گفتارِ معشوق است، قرآنی کہ من دارم

فلک یک مطلع خورشید دارد باہمہ شوکت
ہزاران ایں چنیں دارد گریبانی کہ من دارم

زبرہاں تا بہ ایماں سنگ ہا دارد رہِ واعظ
ندارد ہیچ واعظ ھچو برہانی کہ من دارم

فلاطون اس میں بچہ ہے جو یوناں پاس ہے میرے
مسیحا رشک کرتا ہے وہ درماں پاس ہے میرے

تو میرے کفر یا ایمان کی اب پوچھتا کیا ہے
ہے وہ اک جلوۂ مستاں جو ایماں پاس ہے میرے

مرے دل میں خدا ہے اور گدازِ عشقِ آقا ہے
ملا کافر کو کب جو سازو ساماں پاس ہے میرے

بھلا کیا چاہوں میں جبریل سے پیغامِ قرآنی
ملا گفتارِ آقا سے جو قرآں پاس ہے میرے

فلک کی شان وشوکت ایک ہی سورج کے دم سے ہے
کئی سورج ہیں جس میں وہ گریباں پاس ہے میرے

رہِ ایماں ہوئی پتھریلی واعظ کی دلیلوں سے
جو واعظ کو نہیں حاصل وہ برہاں پاس ہے میرے

ظلمت کدے میں

''دستمبو کی روشنی میں''

شموئل احمد
(پٹنہ)

میں زور سے چلّایا۔

''یاخدا..کیا میں زمین پر گرے ہوئے پانی کی طرح ہوگیا کہ دوبارہ اٹھایا نہیں جاسکتا.....؟''

لیکن آواز دب کر رہ گئی۔لب مچھلی کے دہانے کی طرح کھلے اور بند ہوگئے۔اٹھنے کی کوشش کی تو ہاتھ دیواروں سے ٹکرائے اور انگلیاں کسی لس لسی چیز کے لمس سے بھیگ گئیں۔میں نے کراہیئت سی محسوس کی۔انگلیوں پر نظر ڈالی تو جانا کہ یہ کبوتر کا خون تھا جو دیواروں پر اب بھی تازہ تھا۔لب پھر کھلے اور بند ہوئے۔

'کس مقام پر ستارہ آکر رکا ہے کہ انسان واجب القتل قرار دیا گیا....؟ کیا برج سرطان میں مریخ اور زحل کا اتصال ہوا ہے....؟''

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر آیا۔سناٹا دور تک پسرا ہوا تھا۔زرد موسم کی آخری منزلوں سے گذرتا ہوا سورج مغربی کناروں پر پڑا ہانپ رہا تھا۔حسرت بھری نظر مکان پر ڈالی جو گرد سے اٹا ہوا تھا۔دیواروں پر کائی جمنے لگی تھی۔دہلیز پر ہی کھڑے کھڑے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔لب پھر ہلے۔

''کوئی ہے جو مجھے پکارے....

''مرزا تفتہ....؟''

''نارائن براہمن؟''

''مہیش داس...؟

''کوئی نہیں....؟'

سناٹا ہنسنے لگا۔

''میں اکیلے سانس لے رہا ہوں۔''

''..کہاں جاؤں....؟ میں آدھا مسلمان....؟''

یااللہ.....میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا....؟''

میں نہ ہوتا لیکن ۱۱ مئی کی وہ دوپہر تو ہوتی اور برج سرطان مین مریخ اور زحل کا اتصال تو ہوتا...شمس نے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی نظر ان پر ڈالی اور دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز گئیں۔میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔انگریزوں کے خون کے پیاسے....جہاں کسی انگریز افسر کو دیکھا قتل کیا مکان لوٹا۔افراتفری مچ گئی۔ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیئے گئے۔زمین ہر طرف گل اندام کے خون سے رنگین ہوگئی۔باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص گھر میں بیٹھ رہا۔

''میں بھی اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔سوار ہونا یا کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔کوئی میرے پاس آوے....کون ہے جو آوے....گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔''

ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔بے رحم قاتلوں نے شہر میں جگہ جگہ پڑاؤ ڈالا۔اندرون قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا۔اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ۔دور دور کے شہروں سے خبر آئی کہ باغیوں نے ہر چھاونی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے اور کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے۔گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار سب یک دل ہوگئے۔

جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے۔جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے۔کمین آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں جو صرف سکون آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہش مند ہیں۔

وہ کم رتبہ لوگ جو سارا دن مٹّی بیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے ان کو مٹّی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں آتش گل سے چراغ روشن رہتے تھے اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

دلّی شہر کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے۔انگریزی حکّام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔صرف شہر کے جانب مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔انگریزوں نے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنالیا ہے۔اس کے چاروں طرف کئی اژدہا صفت توپیں لگادی ہیں۔

پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے انگریزوں نے شان وشکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالے کی فوج کو بھاگتے ہی بنی۔دو تین دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدان جنگ بنے رہے۔غضب ناک شیروں نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروساماں لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔بے شمار مرد اور عورتوں کے گروہ تینوں دروازے سے باہر نکل گئے اور شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزیں ہوگئے۔

میں کوئی گناہ گار تو نہیں کہ سزا پاؤں۔میں کیوں خوف کھاؤں اور ادھر ادھر بھاگتا پھروں۔اب مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔اس تنہائی میں قلم میرا رفیق ہے۔آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم

سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں۔

میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنّی ان کے زد میں نہ آ جائے۔ میری زبان پر وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ تاریخ اٹھارہ ستمبر.... آفتاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں داخل ہوا اور ظلم و ستم کی آندھی چھا گئی۔ فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ باغی جان بچانے شہر سے بھاگنے لگے۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی آفت اس گلی تک آ گئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

۵ اکتوبر کو پیر کے دن دو پہر کے وقت اچانک سات آٹھ گورے دیوار پر چڑھ کر اس خاص کوچے میں اترے جہاں میں رہتا تھا۔ پچاس ساٹھ آدمیوں کی بستی ہوگی۔ سب کو گھیر لیا اور کرنل براؤن کے پاس سب کو لے چلے۔ راہ میں سارجنٹ بھی آ ملا۔

''تم مسلمان ہو؟''

''آدھا مسلمان۔''

''یعنی۔؟''

''شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔''

کرنل براؤن نے مجھ سے بہت نرمی اور انسانیت سے بات کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

میں.... آدھا مسلمان.... مجھ کو سوچنا چاہیے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو باز پرس کے لئے اٹھایا گیا ہے اور جزائے اعمال بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنویں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا۔ مجھ پر جو کچھ آج گذر رہی ہے اگر کل بھی یہی گزری تو کیا ہوگا۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قید میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بری ہے یہ گدائی اور وہ بھی اس بے سروپائی کے ساتھ۔

جس دن گورے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔ اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے۔ گلی اندر سے بند ہے۔ گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے۔ اس گلی کے زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں۔ عورتیں بچّوں کو چھاتی سے لگائے ہوئی تھیں اور مردوں کے سروں پر سامان کی گٹھریاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیئے۔ گلی سر بستہ تو تھی ہی در دستہ بھی ہو گئی۔ ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہو گیا۔

''پری چہرہ نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچے چاند کی طرح دمکتے تھے۔ حیف وہ بچے جنھوں نے دنیا کو ابھی اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر ڈوب گئے۔

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لئے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدّت بڑھتی ہے بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ دیکھیں کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیانہ کدھر ہے۔ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔ اصل صاحب فراش میں ہوں۔ بیس دن سے پاؤں پر ورم ہو گیا ہے۔ کف پا وہشت پا سے نوبت گذر کر پنڈلی تک آ پہنچی ہے۔ جوتے میں پاؤں سماتا نہیں۔ بول و براز کے واسطے اٹھنا دشوار۔ ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا ہوں۔''

''حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔ پھر میں کیوں جیتا ہوں؟ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ کوئی مجمع ـ پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت....! میں شعر و سخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب تک کہ آہ گرہ سے میرے دل پر ہزاروں آبلہ پڑ گئے ہیں۔ میرا دل بجھ چکا ہے اور قویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی۔'' میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ کیوں کہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔'' ''میں بالکل مفلس اور بے سروسامان ہوں۔ خداوند! کب تک یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر میری ہی کان کے ہیں۔''

ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں۔ میرے حصّے میں پنشن لکھی جا چکی تھی۔ سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہ دہلی نے مجھے بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں جس کے عوض ۶۰۰ روپیہ سالانا وظیفہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے استاد کا انتقال ہو گیا اور اصلاح شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔ میں گر چہ بوڑھا تھا لیکن قلعے کی ملازمت میں تھا۔ نیز گوشہ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بار خاطرِ حاضرین ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظریں جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تو کچھ دیر حاضر خدمت رہتا تھا ورنہ دیوان خاص میں بیٹھ کر چلا آتا تھا، اس مدت میں جتنا کام مکمّل ہو جاتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلّق اور میرا کام لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں محو تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتّب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسائش و فراغت کا کوئی حصّہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے

پاک تھا تباہ کردے۔

ان دنوں خوش تھا۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اوراسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آ گئی تھی اور توشک خانے میں سترہ بوتلیں بادۂ ناب موجود ہوتیں،۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتا اور رات بھر شراب پیا کرتا لیکن اب.....

اب بجلی چمکے تو دیکھوں کوزہ کہاں رکھا ہے؟ یہ آسمان کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغ بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے ملتی تھی اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں نکلا۔بستر اور کپڑے بیچ کر زندگی گزار رہا ہوں۔ گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں جب سب کپڑے کھالوں گا عالم برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔اب میرے چہرے پراس وقت تک آب ورنگ نہیں آتا جب تک کہ ہزار بار اشک خون سے چہرے کو تر نہ کروں۔ میرے جسم میں غم وافسوس جان و دل بن گئے ہیں۔اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے ہے۔

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ضعف.... سستی....کاہلی....گرانی....رکاب میں پاؤں ہے....باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔زادراہ موجود نہیں۔خالی ہاتھ جاتا ہوں۔اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر....اگر باز پرس ہوئی تو دوزخ جاوید ہے ہم ہیں....!

میرا درد بھرا حال تمہارے نزدیک ایک قصّہ ہے اور بس....لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشک خون جاری ہو جائیں گے۔

اے موسم بہار! بسمل کی طرح خاک وخون میں مل جا۔اے زمانے! اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا۔اے آفتاب! اپنے رخساروں کو نیلا کر لے اور اے چاند! زمانے کے دل کا داغ بن جا۔

یا خدا...کیسی گہری تاریکی ہے....کیسا عمیق سناٹا....نہ کہیں آدم ہے نہ بوئے آدم...!

ہر طرف گہری خامشی جو کسی دیوار کی طرح ٹھوس اور جامد ہے۔ میں اسے چھو کر محسوس کرتا ہوں۔ یہ ازل کی خامشی ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تو خامشی تھی۔اور خدا نے کہا کن.....خدا نے خامشی کے سینے پر پہلی ضرب کن کی لگائی اور کائنات وجود میں آئی۔کتنا عظیم ہے خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے۔

اس پُراسرار خامشی میں کس نے میرے شانے پر دست شفقت رکھا ہے....میں ایک عظیم ہاتھ کا لمس صاف محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کون ہے جو میرے اردگرد سرگوشیاں سی کر رہا ہے کہ جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش خدا کے تابع ہے تو آسمان جو کچھ دے رہا ہے اسے قبول کیوں نہیں کرتے؟

یہ دنیا کی بے حقیقت چیزیں جو فنا کے طاقتور تھپیڑوں کے سامنے ہیچ ہیں۔کیا ان کے لئے یہ بخشش کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔ پھر یہ گریہ زاری کیوں....؟ ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ہر ایک کو نوشتہ قسمت کے مطابق سروساماں عطا کیا گیا ہے۔مصیبتیں اور راحتیں اسی حکم ازل کا نتیجہ ہیں۔تمہارے لیے بہتر ہے کہ بے دلی کو چھوڑ و....میں حیران ہوں....اچانک سب کچھ بدل گیا ہے.....یہ کیسا انبساط ہے جس سے میں گزر رہا ہوں....؟

انبساط کی بے کراں ندی ہے اور میں ہوں اور سرگوشیاں ہیں ....سب کچھ خدا کے حکم سے ہے....سب کچھ خدا کے حکم سے ہے تو میں کیوں پریشاں ہوں۔....نہیں....اب میں پریشان نہیں ہوں......مجھے اب سکون مل گیا ہے...مشکلیں مجھ پر آساں ہو گئیں ہیں.....اب کوئی انتشار نہیں ہے۔اب سرگوشی نہیں ہے....صرف انبساط ہے....جس طرح بچّے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں، میں بھی ہر لحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت فزا نیرنگیوں کو خوشی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔اس کی رضا میں ہی میری نجات ہے......!!!

پیٹ کے روگ

فرض کرو ہم اہلِ وفا ہوں، فرض کرو دیوانے ہوں
فرض کرو یہ دونوں باتیں ، جھوٹی ہوں افسانے ہوں

فرض کرو یہ جی کی بپتا، جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی، آدھی ہم نے چھپائی ہو

فرض کرو تمہیں خوش کرنے کے ڈھونڈے ہم نے بہانے ہوں
فرض کرو یہ نین تمہارے سچ مچ کے میخانے ہوں

فرض کرو یہ روگ ہو جھوٹا، جھوٹی پیت ہماری ہو
فرض کرو اس پیت کے روگ میں سانس بھی ہم پہ بھاری ہو

فرض کرو یہ جوگ بجوگ کا ہم نے ڈھونگ رچایا ہو
فرض کرو بس یہی حقیقت باقی سب کچھ مایا ہو

ابنِ انشاء

(۱۹۲۷ء تا ۱۹۷۸ء)

چیچہ وطنی

رضیہ اسماعیل
(یوکے)

میرے ذہن کے کورے کاغذ پر پہلی کہانی یہی کوئی چھ سات برس کی عمر میں اتری ہوگی۔

آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ میرے ذہن کے پردوں سے یوں چپکا ہوا ہے جیسے زندگی ہمیشہ سے موت کی دسترس میں ہو اور اس سے فرار کسی طور بھی ممکن نہ ہو۔

میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ''چیچہ وطنی'' کو اپنے ذہن کی تختی سے نہیں مٹا سکی اس لیے آج کاغذ کے سپرد کرنے پر مجبور ہوں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اونچے شملے والا، خوبرو، گبھرو جوان چوہدری محمد خاں جب کلف لگے سفید براق کپڑے پہنے، کارتوس کی پیٹی اور دونالی بندوق کندھے پر سجائے، چرچراتے ہوئے چرمی جوتوں کے ساتھ پنڈ کی گلیوں میں سے گزرتا تھا تو کنواریاں تو ایک طرف، خصماں والیوں کے دل بھی سینے میں ایک بار ضرور زور سے دھڑک اٹھتے ہوں گے۔

آج سارا پنڈ حشرات الارض کی طرح کونوں کھدروں سے نکل نکل کر چوہدریوں کی حویلی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

حیران و پریشان انسانوں کے جم غفیر کو دیکھ کر ڈھور ڈنگر خوفزدہ ہو کر کھونٹوں سے رسے تڑا تڑا کر بھاگ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا اور ہر ایک کو میدانِ حشر میں پہنچنے کی جلدی ہو۔

''ہائے میرا اُچے شملیاں والا۔ میرا پردیسی شہزادہ، مینوں خبر نہ ہوئی۔۔۔ میں لٹی گئی جے لوکو۔''

سینے پر دو ہتڑ مار مار کر دردناک انداز میں بین کرتی ہوئی لحیم شحیم فاطمہ جٹی جسے سب فاطو جٹی کے نام سے پکارتے تھے آج بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ فاطو جٹی کی آہ و بکا سے ہر آنکھ پرنم تھی۔

شدید ذہنی صدمے کی کیفیت میں فاطو جٹی نے اپنے لمبے گھنگریالے بالوں کی چوٹی کھول دی تھی۔ سر سے ریشمی چادر اتار کر اس نے لیرو لیر کر دی تھی جس سے وہ چوہدری محمد خاں کے زخموں سے رستے ہوئے لہو کو پونچھ پونچھ کر اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملتے ہوئے بین کر رہی تھی۔

''چوہدری تیری جگہ میں ٹوٹے ہو جاندی۔ ظالماں میرا کلیجہ کڈھ لیا۔ ہائے میں اپنا قول ہار گئی۔۔۔ میں اپنے چوہدری دی حفاظت نہ کر سکی۔''

فاطو جٹی کے دل پسیج دینے والے ہاڑوں نے سارے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔

نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔

نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔

نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔

گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔

ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔

آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔

چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سر زمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔

پنڈ کے سارے آوارہ کتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطو جٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

دراصل اس پرامن پنڈ میں لرزہ خیز قتل کی یہ پہلی واردات تھی اور پھر قتل بھی ایسے بندے کا جس کی جی داری اور بہادری کے چرچے کئی کئی کوس تک پھیلے ہوئے تھے۔ آج چوہدریوں کی حویلی کے وسیع و عریض صحن اور چاروں طرف بنی ہوئی راہداریوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سارے پنڈ کو جیسے غم کا گھن لگ چکا تھا۔

چوہدری محمد خاں کا خون سے لت پت جوان جسم حویلی کے صحن کے درمیان، سفید نواڑی چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ زندگی کی حرارت سے محروم۔ دراز قد چوہدری کے پاؤں چارپائی کی حدیں پھلانگ پھلانگ کر باہر نکل رہے تھے۔ خون سے تربتر سفید لباس میں چارپائی پر لیٹا ہوا چوہدری محمد خان اس حالت میں بھی حسن و جمال کا پیکر لگ رہا تھا۔

فاطو جٹی اور چوہدری کے انوکھے ملاپ کے قصے پنڈ کے ہر بندے کی زبان پر تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں ہی دیومالائی کردار ہوں۔ اس دھرتی پہ رہنے والوں سے بہت مختلف، بہت الگ، وکھری ٹائپ کے۔۔۔

چوہدری محمد خان کون تھا؟ وہ اس پنڈ میں کہاں سے آیا تھا؟ سوائے فاطو جٹی کے یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ طرح طرح کے قصے پنڈ والوں میں مشہور تھے مگر بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ چوہدری محمد خان کا ساتھ والے پنڈ کے ملکوں سے بڑا یارانہ تھا اور وہ شکار کھیلنے کے لیے ان کی زمینوں پر سال میں ایک بار ضرور آیا کرتا تھا۔

ایک سال چوہدری شکار کھیلنے آیا تو خود ہی شکار ہو گیا۔

اپنے شکار کا پیچھا کرتے کرتے، ہرن کے تعاقب میں سبکتگین کی طرح گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے وہ اپنے شکاری کتوں کے ہمراہ باقی کی شکار پارٹی

سے بچھڑ کر بہت دور نکل آیا۔

جان بچانے کی تگ و دو میں بھاگتا ہوا ہرن فاطو جٹی کی زمینوں پر آ نکلا۔ اتفاق سے فاطو جٹی آج اپنی زمینوں کے دورے پر نکلی ہوئی تھی۔

شکاری کتوں کی معیت میں گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے چوہدری محمد خان بھی فاطو جٹی کی زمینوں پر کھڑی فصلوں کو روندنے لگا۔

اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوا دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ و سال بھی رک گئی۔۔۔

لمحے سراسمیہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار گرتے گرتے بچا۔ لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔

چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔ فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔

نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔

وقت کی ٹہنی سے ٹوٹ کر گرنے والے دو انمول لمحے ان دونوں کی جھولی میں آن گرے جنہیں انہوں نے بڑی احتیاط سے اٹھا کر اپنے دل کے کٹوروں میں بند کر لیا۔

اندھا کیوپڈ اپنا کام کر چکا تھا۔ آنکھوں والوں کو عشق کے ایک ہی وار نے تھیا تھیا کر کے نچا دیا تھا۔

ویسے تو چوہدری اتنا شاندار مرد تھا کہ کوئی بھی حسین سے حسین عورت اس پر ہزار جان سے مرمٹتی مگر یہاں لگتا تھا کہ چڑیا کی دُکی نے حکم کے اِکے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

مردانہ ڈیل ڈول، گہری سانولی رنگت اس پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، نہ ہار نہ سنگھار، نہ کنگھی نہ چوٹی، سر جھاڑ منہ پھاڑ۔ کھلے ہڈ پیروں کے اوپر ریشمی لاچا پہنے، لب و لہجے میں مردانہ کھنک رکھنے والی فاطو جٹی میں عورتوں والی نزاکت تو نام کو نہ تھی۔ اوپر سے مزاج کبھی تولہ تو کبھی ماشہ۔ لگتا تھا اسے بناتے وقت قدرت نے نمک اور مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کر دیا تھا۔

''مگر ایک بات ہے اس میں۔۔۔ عورت ہے بڑی جی دار۔ اچھوں اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔'' پنڈ کے مرد اکثر چوپال میں بیٹھ کر فاطو جٹی کے اعتماد اور تڑاک پھڑاک انداز گفتگو پر رشک کیا کرتے تھے۔

وہ مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس قدر رعب داب سے باتیں کرتی تھی کہ آخر مرد گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔

حویلی کے برآمدے میں بڑے سے رنگین پیڑھے پر بیٹھی ریشمی لاچا ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر حقہ گڑگڑاتی فاطو جٹی ملازموں کی فوج کو ان کی نالائقی پر اکثر لعن طعن کر رہی ہوتی تھی ایسے میں وہ کسی ظالم، جابر جاگیردار سے کم نظر نہ آتی تھی۔

پنڈ والے کبھی کبھی تو سوچتے کہ وڈے چوہدری کو اس طرح کی بیٹی قدرت نے کس گناہ کی پاداش میں دے دی تھی جو عورت سے زیادہ ایک مرد تھی۔

وہ پنڈ کے وڈے چوہدری حکم داد کی اکلوتی اولاد تھی۔ کئی مربعے زمین کی اکیلی وارث۔ چوہدری اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی اس کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات وڈے چوہدری کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ بچپن میں ہی فاطو کی ماں کے مر جانے کے بعد وڈے چوہدری نے اُسے ماں اور باپ دونوں ہی بن کر پالا تھا۔ اس قدر لاڈ پیار نے فاطو جٹی کے مزاج کو اور بھی پرلگا دیئے تھے۔

فاطو جٹی کی عمر کوئی پچیس برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ پنڈ میں اس کے جوڑ کا کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو اس شیرنی کے مقابل آتا۔

آس پاس کی زمینداریوں سے اس کے لیے شادی کے چند ایک پیغام ضرور آئے مگر فاطو جٹی کو اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور جانا منظور نہ تھا۔ اس کی شرط تھی کہ شادی کرنے والے کو گھر داماد بن کر رہنا پڑے گا جس کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ اس کشمکش میں وڈے چوہدری کا انتقال ہو گیا تو فاطو جٹی بالکل اکیلی رہ گئی۔

آج وقت اس پر مہربان تھا۔

چوہدری محمد خان سے طوفانی ملاقات کے بعد وہ یکسر بدل گئی تھی۔ لب و لہجے میں قدرے نرمی آ گئی تھی۔

کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش جسے اس نے دل کی تاریک کوٹھڑی میں کہیں دفن کر رکھا تھا آج زندہ ہو کر جیسے باہر آ گئی تھی۔

فاطو جٹی اور چوہدری کے دھواں دھار عشق اور دونوں کے عجیب و غریب جوڑ کو دیکھ کر پنڈ کی کنواریاں اکثر ہنسی مذاق کرتے ہوئے کہتیں:

''ہائے نی لگتا ہے جیسے جن پری پر عاشق ہو گیا ہے۔ کہاں چوہدری اور کہاں فاطو جٹی۔ بے چارہ چوہدری۔'' اتنا کہہ کر سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو

جاتیں مگران دونوں کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

جلد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وقت کا پہیہ بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ چوہدری اور فاطو جٹی کے ہاں اوپر تلے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہو گئے تو دونوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کی حویلی بھی خوشبوؤں سے معطر ہو گئی۔

جن نے پری کو یوں قابو کر لیا تھا کہ چوہدری اپنے گھر کا رستہ ہی بھول گیا۔ اس پنڈ میں اس نے مستقل ڈیرا ڈال لیا مگر سال میں ایک آدھ مرتبہ وہ اپنے آبائی علاقے میں ضرور جایا کرتا تھا لیکن کسی نے اس کے کسی رشتہ دار کو کبھی اس پنڈ میں آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

چوہدری اس پنڈ میں پردیسی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جدی پشتی پنڈ میں رہنے والوں نے اسے کبھی دل سے قبول نہیں کیا مگر فاطو جٹی کے ڈر سے کبھی کسی نے زبان نہیں کھولی تھی۔

چوہدری خود چودہ جماعتیں پاس تھا۔ باذوق آدمی تھا۔ ایسے میں پنڈ کے ڈاکٹر سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی جو اس پنڈ میں واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ادب، آرٹ، موسیقی، سیاست اور کھیل کود کے علاوہ حالات حاضرہ پر زور شور سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

دونوں ہی شکار کے شوقین تھے۔ ڈاکٹر نے بھی اعلیٰ نسل کے شکاری کتے پال رکھے تھے۔ ہفتے عشرے میں دونوں اپنے اپنے کتوں کو لے کر شکار کے لیے نکل جاتے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ان دونوں میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی۔ دونوں ہی اس پنڈ میں مہاجر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ چوہدری کی ہجرت اختیاری تھی جو اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی جبکہ ڈاکٹر کی ہجرت غیر اختیاری اور جبری تھی جو اسے ہندوستان کے بٹوارے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اختیار کرنا پڑی تھی۔

دونوں ہی پیچھے بہت کچھ چھوڑ آئے تھے مگر اس کے بارے میں وہ کبھی کھل کر آپس میں بات نہیں کیا کرتے تھے مگر اس ہجرت نے یقیناً انہیں دوستی کے ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا تھا۔

وقت سبک خرامی سے چلنا بھول کر ایک رات، ایک ہی جست میں بہت آگے نکل گیا۔

طوفانی رات، گھپ اندھیرا۔۔۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب خلق خدا بستروں میں دبکی پڑی تھی۔ ایسے میں کپڑے میں منہ چھپائے، ہاتھ میں ڈنگوری اور بہت نیچی لو کیے ہوئے لالٹین پکڑے، کوئی بہت آہستگی سے ڈاکٹر کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا مگر طوفانی ہوا کے تھپیڑوں سے ہلکی دستک کی آواز دبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اجنبی کو اب کی بار قدرے زور سے دوراز ہ کھٹکھٹانا پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈیوڑھی کا دروازہ کھل گیا۔ اجنبی ڈاکٹر کے ساتھ ڈیوڑھی کے اندر آ کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

ڈاکٹر بے حد فکر مند لہجے میں اجنبی سے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے جلدی سے کھونٹی سے اپنا اوور کوٹ اور مفلر اُتارا۔ ہاتھ میں ٹارچ سنبھالی اور اجنبی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ڈاکٹرنی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید کوئی بہت بیمار ہے جو طوفانی رات میں کچھ بتائے بغیر ہی ڈاکٹر گھر سے عجلت میں چلا گیا ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد دروازے کی چرچراہٹ دوبارہ سنائی دی تو پہلے سے جاگتی ہوئی ڈاکٹرنی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ آپ اتنی دیر تک کہاں تھے؟ کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے؟'' ڈاکٹرنی نے جلدی جلدی کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں'' ڈاکٹر نے نہایت آہستگی سے جواب دیا مگر پریشانی ڈاکٹر کے لہجے سے مترشح تھی۔

''آخر بات کیا ہے؟'' اتنی رات گئے باہر نکلنے کا اور کیا مقصد تھا؟''

ڈاکٹرنی کے اصرار پر ڈاکٹر کو بتانا ہی پڑا۔

''رنگڑوں کا مزارع آیا تھا، بڑی تشویش ناک بات بتا کر گیا ہے۔ اس لیے میں چوہدری محمد خان کو ملنے کے لیے اس کی زمینوں پر پنڈ سے باہر گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے رُک رُک کر کہا۔

''مگر پریشانی کیا ہے؟'' ڈاکٹرنی نے پھر پوچھا۔

''دراصل آج چوہدری اپنی زمینوں پر سو رہا ہے۔ کیونکہ پانی کی باری اس کی ہے۔ اس کا پانی اکثر چوری کر لیا جاتا ہے جس پر رنگڑوں سے چوہدری کی کئی مرتبہ گرمی سردی ہو چکی ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

''تو اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو زمین داروں کے روز کے قصے ہیں۔'' ڈاکٹرنی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

اب کی بار ڈاکٹر نے جواب دینے میں قدرے تاخیر کا مظاہرہ کیا تو ڈاکٹرنی پھر بول پڑی ''اس مزارع پر آپ کو اعتماد تھا؟ کہیں کچھ اور ہی چکر نہ ہو، مجھے تو یہ معاملہ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ عزیز اچھا آدمی ہے۔ حق سچ کی بات کرتا ہے۔ اسی لیے تو طوفانی رات میں جان پر کھیل کر وہ چلا آیا ہے۔ دراصل آج رنگڑوں نے چوہدری محمد خان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آج وہ خود زمینوں پر سو کر پانی کی نگرانی کرے گا۔''

وہ کہہ رہا تھا کہ آپ چوہدری کے بہت اچھے دوست ہیں اسے جا کر خبردار کر دیں کہ یا تو وہ آج وہ واپس گھر آ کر سوئے یا پھر کچھ اسلحہ اپنے پاس حفاظت کے لیے رکھ لے۔''

''تو پھر چوہدری نے آپ کی بات مانی ؟'' ڈاکٹرنی نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ بہت ضدی ہے وہ۔۔۔ نڈر آدمی ہے۔ کہتا ہے جو گولی مجھے لگی گی وہ ابھی تک بنی ہی نہیں۔''

اُسے اپنی دونالی بندوق پر بہت بھروسہ ہے۔ کہہ رہا تھا ''کس مائی کے لال میں جرأت ہے جو مجھے ہاتھ لگا جائے۔ میں اُسے نتھ نہ ڈال دوں گا۔''

ڈاکٹر کی تسلی تشفی کرا کے چوہدری نے اسے واپس تو بھیج دیا مگر اس طوفانی رات میں ڈاکٹر نے آنکھ تک نہیں جھپکی۔ دونوں میاں بیوی ساری رات جاگ کر کسی انہونی کا انتظار کرتے رہے۔

چوہدری کی کہی ہوئی باتیں ڈاکٹر کو یاد آ رہی تھیں ''اوئے ڈاکٹر ان رنگڑوں کا دوا دارو نہ کیا کر، کم ذات لوگ ہیں، ٹھیک ہو کر تجھے ہی ڈنگ ماریں گے۔''

ڈاکٹر چوہدری کی بات سن کر ہنس کر کہتا ''یار میں ڈاکٹر ہوں، بیمار کا علاج کرنا میرا فرض ہے۔''

''تو پھر کرتے رہو ان سانپوں کا علاج۔'' چوہدری بے زاری سے جواب دیتا۔

''جب یہ لوگ لٹے پٹے ہوئے ملک کے بٹوارے کے وقت بے سروسامانی کی حالت میں اس پنڈ میں آئے تھے تو ہم نے ان سب کی بہت مدد کی تھی لیکن جب انہیں اپنی زمینیں الاٹ ہوگئیں تو یہ ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے۔ بڑے ہی احسان فراموش لوگ ہیں۔ اب تو کھلم کھلا دشمنی پر اُتر آئے ہیں۔'' چوہدری گویا آج دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

''جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔ کیا خوبصورت بات کہی ہے حضرت علیؓ نے۔ یہ بات ان جیسے لوگوں پر ہی صادق آتی ہے۔'' چوہدری نے قدرے مایوسی سے کہا۔

طوفانی رات کے کسی پہر میں وقت کا پہیہ یک لخت سارے کا سارا ہی گھوم گیا۔۔۔ انہونی ہو کر رہی۔ سورج کی روپہلی کرنیں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح رو رہی تھیں۔

رات کی تاریکی میں ڈنڈوں، لاٹھیوں، کلہاڑیوں، برچھیوں اور پستولوں سے مسلح رنگڑوں کے ایک بڑے گروہ نے زمینوں پر سوئے ہوئے چوہدری کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرنے کی تو کسی میں ہمت نہیں تھی اس لیے انہوں نے چھپ چھپا کر چوروں کی طرح چوہدری کے سر پر لاٹھیوں سے ایسا کاری وار کیا کہ اُسے سرہانے پڑی دونالی بندوق اٹھانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔

دن چڑھتے ہی اس لرزہ خیز قتل کی خبر تیزی سے دور دور تک پھیل گئی۔ پھر وہی پولیس۔۔۔ آنیاں ۔۔۔ جانیاں۔۔۔ کاغذی کارروائیاں۔۔۔ تفتیش۔۔۔ جائے وقوعہ۔۔۔ گرفتاریاں۔۔۔ آلۂ قتل۔۔۔ ایف آئی آر۔۔۔ ثبوت۔۔۔ گواہ۔۔۔ شہادتیں۔۔۔ عدالتیں سب کچھ ہی موجود تھا سوائے چوہدری کے۔

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کے بعد چوہدری کی لاش واپس پنڈ میں آئی تو ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ دوپہر تک تدفین کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

اچانک یوں لگا جیسے پنڈ میں بھونچال آ گیا ہو۔ در و دیوار لرزنے لگے۔ زمین کانپ گئی۔ بہت سے لوگوں کے بری طرح رونے پیٹنے اور بین کرنے کی آوازوں نے سارے ماحول میں ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔

عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم سینہ کوبی کرتا ہوا حویلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک اور کربلا سجا دی گئی ہو اور حسینی قافلہ یزید کے دربار میں ماتم کرتا ہوا جا رہا ہو۔

کرفیوں کی طرح اس ماتم کناں ہجوم کا نظارہ کرنے کے لیے پنڈ والے گلیوں، بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر اُمڈ پڑے۔ سب حیران و ششدر تھے کہ یہ کون سے سگے سمبندھی ہیں جو اس انداز میں پنڈ میں وارد ہوئے ہیں۔

اس ماتمی جلوس میں سب سے آگے اونچی لمبی، لش لش کرتی، مکھنوں کی پلی، سلفے کی لاٹ ورگی، رج کے سوہنی جٹی، کالے کپڑے پہنے ہوئے بازو اٹھا اٹھا کر دہائیاں دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

یہ چوہدری کی خاندانی بیاہتا تھی جو صحیح معنوں میں چوہدری کا جوڑ تھی۔ جیسے دو سورجوں کی جوڑی ہو۔

چوہدرائن کو دیکھ کر بڑی بوڑھیوں نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔

''ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے چوہدری نے فاطو جٹی میں کیا دیکھا؟'' ایک نے حیرت سے کہا۔

''یہ سب نصیبوں کا چکر ہے۔ سنا نہیں سیانے کہہ گئے ہیں روپ رون تے کرم کھان'' دوسری نے جواب دیا۔

''عشق خوددار کی رسمیں بدلی نہیں جاتیں۔ عشق ظاہری شکل وشباہت نہیں بلکہ روحوں کی پہچان کا نام ہے۔۔۔ بس سمجھ لو کہ چھاپ تلک سب چھینی موسے نیناں ملائیکے'' وقت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی ہوئی جٹی نے حویلی کی دہلیز پر آ کر اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ لہولہان کلائیوں سے بال کھول کر سینے پر دوہتڑ مار کر اس حسن سوگوار نے بین کرنے شروع کر دیئے اور باقی سارے ہجوم نے بھی اس کی تقلید میں زور زور سے سر منہ پیٹنا اور رونا شروع کر دیا۔

حویلی کے صحن میں قدم رکھتے ہی آہ وفغاں کرتی ہوئی جٹی نے زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈال لی اور بری طرح روتے ہوئے آ کر صحن میں پڑے چوہدری کے بے جان وجود پر ڈھیر ہو گئی۔

کافی دیر تک وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی۔ پھر اچانک

وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہو کر اٹھی اور پاس کھڑی ہوئی فاطو جٹی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔

''تم میری دین دار ہو فاطو۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اپنے چوہدری کو تمہارے سپرد کیا تھا۔ کون سی منحوس گھڑی میں وہ اس پنڈ میں آیا تھا۔ تو ڈائن ہے تو نے میرے سر کے سائیں کو کھا لیا۔ تو نے میرے پردیسی کو مار ڈالا۔''

مشکل سے بے قابو ہوتی ہوئی چوہدرائن کو ہجوم نے فاطو جٹی سے الگ کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نئی بحث چھڑ گئی جو فاطو جٹی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

چوہدری کی خاندانی بیوی کا اصرار تھا کہ وہ اس کی میت واپس اس کے آبائی علاقے میں لے کر جائے گی جبکہ فاطو جٹی کہہ رہی تھی کہ چوہدری کی تدفین اسی پنڈ میں ہوگی۔ دونوں عورتیں اپنے اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

کسی کروٹ بھی اونٹ نہ بیٹھتے دیکھ کر پنڈ کے نمبردار نے فوری طور پر پنچایت اکٹھی کر لی۔ پنچایت نے دونوں پارٹیوں کے دلائل بڑے تحمل سے سنے۔ سلفے کی لاٹ کہہ رہی تھی ''ساری زندگی تو نے اسے اپنا قیدی بنا کر رکھا اب تو اُسے آزاد کر دے۔ زندگی میں تو وہ میرا نہ ہو سکا اب مٹی کی ڈھیری ہی مجھے دے دے۔ میں کم از کم اس کی قبر پر جا کر رو ہی لیا کروں گی۔''

فاطو جٹی کیا بتاتی کہ ''چوہدری کی جدائی سے تو وہ خود عمر بھر کے لیے غم کی قید میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ کسی اور کو کیا آزاد کرے گی؟''

مگر فاطو جٹی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بات کرنا ہی بھول گئی ہو یا پھر چوہدری جاتے جاتے اس کی گز بھر لمبی زبان بھی ساتھ لے گیا ہو۔

بالآخر پنچایت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ''چوہدری محمد خان اس پنڈ میں پردیسی تھا مگر وہ لاوارث نہیں تھا۔ زمینوں، جاگیروں اور حسب نسب والا تھا۔ اس کی میت اس کے اصل وارثوں کو ہی ملنی چاہیے تاکہ وہ اسے اس کے آبائی علاقے میں لے جا کر دفن کر سکیں۔ یہی اس علاقے کا دستور ہے۔''

پنچایت کا فیصلہ سن کر فاطو جٹی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی عمر قید کی سزا کو پھانسی میں تبدیل کر دیا ہو۔

پنچایت کا فیصلہ سننے کے بعد ہجوم نے بڑی تیزی سے چوہدری محمد خان کی میت کو شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک پر کھڑے ٹرک کی طرف لیجانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میت ٹرک کے قریب جا رہی تھی فاطو جٹی کو یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ اُسے بھی کھینچ کھینچ کر پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہوں۔

فاطو جٹی کی دگرگوں حالت دیکھ کر میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔

''اس وقت فاطو جٹی کی دلی کیفیت کا اندازہ اس کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ اس کا قیدی تو آزاد ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے وطن واپس جا رہا ہے مگر اب زندگی بھر کے لیے احساس جرم کی ٹکٹکی پر لٹکی رہے گی۔''

چوہدری یار باش آدمی تھا اس لیے اُسے الوداع کہنے کے لیے دور و نزدیک کے تعلقوں سے چوہدریوں، سرداروں، وڈیروں، ملکوں اور خانوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا تھا۔

ان سب سے پرے دور ایک کونے میں چوہدری کا جگری یار ڈاکٹر نہایت افسردگی سے کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اس کے قریب ہی کھڑی گم سم سی فاطو جٹی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں مگر کمال ضبط کے ساتھ اپنے چوہدری کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

دفعتہً ٹرک ڈرائیور کی کھردری آواز نے سب کی محویت کو توڑ دیا ''جلدی کریں جی۔ بارش شروع ہونے والی ہے اور پینڈا ابھی لمبا ہے۔'' صبح سے انتظار کرتے ہوئے ٹرک ڈرائیور نے بڑی بے صبری سے کہا۔

''مگر جانا کہاں ہے؟'' ٹرک ڈرائیور نے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر ایکسیلیٹر پر بڑے زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

''چیچہ وطنی، چیچہ وطنی، چیچہ وطنی۔''

اس کے ساتھ ہی لفظ ''چیچہ وطنی'' کی گونج فضا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

ٹرک کی گڑگڑاہٹ اور لوگوں کے بے پناہ شور کے درمیان میرے ذہن کے پردوں سے چپک جانے والے لفظ ''چیچہ وطنی'' کی بازگشت پھر مجھے زندگی بھر سنائی دیتی رہی۔

کرونا وائرس

خطا کار ہیں گنہ گار ہیں سیہ کار ہیں مگر اے خدا
ہمیں غلطیوں کا ہے اعتراف تو کر دے درگزر اے خدا
یہ رسول پاکؐ نے دی خبر کہ یہ خلق تیرا عیال * ہے
بڑی ہو چکی ہے سزا عیال کو اب معاف کر اے خدا

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

○

* حدیث پاک ہے ''اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہ''

(خلق اللہ کا کنبہ ہے)

قرنطینہ

آصف فرخی
(کراچی)

اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کے گرد لکیریں کھینچ دی جائیں جن کو وہ پھلانگ نہ سکے۔ آری ترچھی لکیریں اور دائرے۔ ایک کے بعد دوسری لکیر۔ اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہوتا جائے یہاں تک کہ اس کے پاس تھوڑی سی جگہ رہ جائے۔

صرف سانس لینے کے لیے جگہ۔

اور سانس لینا بھی مشکل۔

اسے لگا کہ لکیریں سانپ بن کر اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اس کے گرد چمٹ جائیں گی۔ جونک کی طرح اس کا خون چوس لیں گی۔ زنجیروں کی کڑی کی طرح اسے باندھ دیا ہے لکیروں کو پھر احساس ہوا کہ ان لکیروں کے اندر کوئی نہیں آ سکتا۔ سمٹتی ہوئی جگہ جتنی لکیر کے اندر باقی ہے وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ جو اندر نہیں آ سکتے وہ ساری دنیا کے لوگ ہیں۔ باقی لوگ ایک طرف، ان سے بڑھ کر وہ جو اس کو پیارے تھے۔ جن کو وہ اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بھی اب اس سے دور تھے۔ لکیر پھلانگ کر کوئی اندر نہیں داخل ہو سکتا تھا۔

اس کے چاروں طرف ابھی کھلی جگہ باقی تھی لیکن اس کے لیے سانس لینا دوبھر ہوتا جا رہا تھا۔

بازار میں سے گزرتے ہوئے اسے عین وہ جگہ ٹھیک ٹھیک یاد رہی جہاں اس نے پہلی بار ایک لڑکی کو دیکھا جو منہ پر ہرے رنگ کا ماسک باندھے ہوئی تھی۔ وہ ایک دکان کے اندر سے نکلی تھی اور چلتی ہوئی سڑک کی طرف آ گئی۔ اس کا لباس صاف ستھرا تھا لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ یاد رہ جائے۔ اس نے گلے میں دوپٹہ ڈال رکھا تھا اور دھوپ، بہت معمولی ہونے کے باوجود آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ دھوپ کی عینک کے ذرا نیچے، ناک کی پھننگ جس کے نیچے اس کے ہونٹ ہونے چاہیے تھے، اتنی جگہ کو ماسک نے ڈھک لیا تھا۔ چوکور کپڑے کے دونوں طرف سے لمبے دھاگے جو ماسک کو کانوں تک لے جا کر ٹکائے ہوئے تھے۔

اس ماسک کے پیچھے وہ متواتر سانس لے رہی تھی۔ سانس کا زیر و بم اس کے لباس سے نظر آ رہا تھا۔ ماسک اور پھولتی سانس کے باوجود وہ اس بازار میں بے جگہ نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ لوگ اسے مُڑ مُڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے۔ نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہرے رنگ کے ماسک کے علاوہ اس لڑکی میں کوئی اور بات نمایاں نہیں تھی کہ آتے جاتے لوگ اس کو دوبارہ دیکھیں۔ اپنے لباس، حلیے اور چال کے معمولی پن کے باوجود اس میں اعتماد تھا۔

وہ جس طرح چل رہی تھی، اس کے چلنے کے طریقے سے وہ لڑکی یاد آ گئی جس کو ذہن سے محو کرنے کی متواتر کوشش کے باوجود وہ اس کو بھلا نہ سکا۔ تب ایک اور لڑکی نظر آئی جس کے منہ پر ہرے رنگ کا ماسک بندھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا، اس کے بھی چہرے پر ماسک۔ پھر کئی لوگ ایسے نظر آنے لگے۔

ایک ایک کر کے اور بھی لوگ نظر آنے لگے۔ اکا دکا ہوں گے جو اس معمولی مگر صاف ستھرے لباس والی لڑکی کی طرح چاق چوبند تھے۔ بعض بالکل مریل، آہستہ آہستہ جھک کر چلتے ہوئے جیسے ابھی گر جائیں گے اور سڑک پر رینگنے لگیں گے۔ ادھیڑ عمر کے لوگ زیادہ تھے۔ چلنے سے سفید پوش اور بعض مفلوک الحال۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ کھانس رہے تھے یا ناک سُڑک رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی سڑک کی طرف منہ کر کے تھوک نہیں رہا تھا، جو اس شہر کے لوگوں کی عام عادت کے بالکل برخلاف بات تھی۔

تھوک کے بلبلے پٹاخ کی آواز سے نکلتے اور سڑک پر پھیل جاتے، ایسا کتنی بار ہوتا تھا۔ دن میں کئی بار دیکھنے میں آتا تھا۔ اکثر اس تھوک کا رنگ سرخ ہوتا کیونکہ اس میں پان کی پیک گھلی ہوتی۔ اس شہر کے لوگوں نے تھوکنا کیسے چھوڑ دیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارا تھوک مجھ پر انڈیلنے کے لیے جمع کر رہے ہیں، اپنے سینے اور حلق میں بھرے گھوم رہے ہیں۔ اس تھوک کی گیلی بجبجاہٹ کے تصوّر سے ہی وہ لرز اٹھا۔

اس نے پہلے تھوک پھر نزلے کا سوچا۔ تھوک کے برخلاف نزلہ بیماری سے منسلک تھا۔ معمولی سی بیماری جو اس قدر عام تھی کہ کوئی اسے بیماری نہ مانتا مگر بیماری تو تھی۔ جراثیم اور ان کی کارگزاری سے منسلک۔ چھینکنے اور ناک سُڑکنے کی آوازیں راہ چلتے عام تھیں۔ کبھی وہ سوچتا کہ خالی رکارڈ پلیئر شہر کی گلیوں، محلوں میں رکھ دیا جائے تو وہ ان آوازوں سے بھر جائے گا۔ کوئی تھوک رہا ہے، کوئی ناک صاف کر رہا ہے۔ ناک میں بیٹھے بٹھائے کھدبد ہونے ہونے لگتی، وہ سمجھ جاتا کہ نزلہ شروع ہونے کے آثار ہیں۔ جیسے مٹّی ناک میں چلی گئی ہو۔ بار بار چھینکیں آنے لگتی تھیں اور ناک بہنے لگتی۔ اس کو کپڑے یا کاغذ سے پونچھ نہ لیا جاتا تو پھر ٹپک پڑتی۔ مگر اس سے بھی پہلے اس کی طرف دیکھنے والوں کو ایسا لگتا اس کے مُنہ میں جا رہی ہے۔ بار بار ناک بہے جاتی، بدن ٹوٹنے لگتا جیسے کم زوری کی وجہ سے گرا جا رہا ہے، چہرہ سرخ ہو جاتا اور ماتھا تپنے لگتا۔۔۔ وہ اپنے زکام کو اس کی نشانیوں کی وجہ سے پہچانتا تھا۔

بچپن سے پہچانتا چلا آیا تھا۔ سارے بچپن میں ایک آواز جو گونجتی رہی تھی، وہ ابّو کی چھینکوں کی آواز تھی۔ ایک زوردار چھینک، پھر اس کے بعد دو چار۔ پھر مسلسل جن کے بیچ میں سانس بھی رکتا محسوس ہونے لگتا۔ اس کو یاد آیا، اس کی امّی کہتی تھیں ان کو سات چھینکیں آتی ہیں۔ ہمیشہ سات۔ پتہ نہیں کیوں۔ لیکن سات نہیں، سات کے بعد ایک اور چھوٹی سی چھینک۔ جیسے ہلکی سی بیغ۔ اپنی چھینکوں کی زوردار آواز پر وہ خود ہنس دیا کرتے تھے۔ چھینکوں سے یہ چراغ بجھایا

نہ جائے گا، وہ مسکرا کر کہتے۔اس حوالے سے سب ہنس دیا کرتے تھے۔وہ ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔

ان کے بعد کوئی ایسی باتیں کرنے والا بھی نہ رہا۔بس وہ خود ہی یاد کرتا رہتا تھا۔یادوں کی لکیریں اس کو اپنے گھیرے میں لے لیتی تھیں۔جال کی طرح بار بار اُبھر کر آتی تھیں اور وہ اس جال کو توڑ نہیں سکتا تھا۔بیماری سے زیادہ مشکل اس کا علاج تھا۔بیماری بظاہر بہت معمولی تھی، تھوڑی سی چھینکیں اور بہتی ہوئی ناک ہی تو ہے!

علاج تسلسل مانگتا تھا۔جانے کون سی جڑی بوٹیاں ___ اس کو دائمی نزلہ ہے۔رطوبت پھیپھڑوں میں جمع ہوجاتی ہے۔حکیم صاحب نے بتایا تھا جن کو بچپن میں دکھایا گیا تھا اور جن کی بتائی ہوئی دوا ہوالشافی کہہ کر کھائی جاتی تھی۔

''کچھ بھی نہیں ہے، الرجی ہے۔ٹیسٹ کروانے سے نہیں، اس دوا سے فائدہ ہوگا جو صبح کچھ کھانے سے پہلے تین قطرے زبان پر رکھ لیں، ہومیوپیتھک ڈاکٹر نے بتایا تھا۔امّی ان کی بہت قائل تھیں۔سردی کا موسم آنے سے پہلے فلو کا انجکشن لگوالیا کریں ___ ڈاکٹر نے معمول کے چیک اپ کے دوران رائے دی تھی۔وہ اس رائے پر غور کرنے لگا حالانکہ کسی شکایت کے بغیر ڈاکٹر کے پاس جان اپنے وقت کا زیاں لگتا تھا اور پیسے کا بھی۔لیکن وہ کتنے عرصے سے ایسی باتوں پر عمل کیے جارہا تھا جو دوسروں نے بتائی تھیں اور جن پر اسے کوئی خاص اعتقاد نہ تھا۔ایک دوا یہ بھی ہے۔

خاک کے ریزے ہوا کے ساتھ اُڑتے پھرتے۔شہر کا رنگ گدلا ہو جاتا اور یہ رنگ سڑکوں، گلیوں سے اٹھتا دکھائی دیتا۔خفیف سے غبار کی طرح عمارتوں کے کھڑکی دروازے اور باہر کے رُخ مٹّی میں اٹ جاتے، سڑک کے ساتھ مٹّی کے بھنوراڑتے، گھومتے نظر آتے۔پھر وہیں تھک ہار کے بیٹھ جاتے اور ان میں دھواں، پھٹے ہوئے کاغذ اور بے کار سمجھ کر پھینک دیے جانے والے سامان کے ٹکڑے بھی شامل ہوجاتے۔گرد وغبار پھیلنے لگتا تو شہر اس کھیت کی طرح معلوم ہوتا جو بھاگتے بھاگتے رُک گیا ہے اور زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔اس کے سانس لینے سے پیٹ اوپر نیچے ہورہا ہے جو زمین پر ٹکا ہوا ہے۔وہ چاروں پنجے پھیلائے بیٹھا ہے اور ہانپ رہا ہے۔

اس کے ہر طرف مٹیالا غبار پھیل رہا ہے۔آلودگی! اس شہر کی فضا رہنے کے قابل نہیں رہی۔۔۔شہر ان لوگوں کو چیختے ہوئے سُن رہا ہے۔گندگی! کثافت! وبائی امراض کا خطرہ۔۔۔شہر سر جھکائے سُن رہا ہے جیسے اس کے جرائم کی فہرست پڑھی جارہی ہے۔اس نے سچ کے سوا کچھ نہ بولنے کا حلف بھی نہیں اٹھایا۔کھانسی جو آگئی تھی عین وقت پر۔تھامتا سا ایک ذرّہ بے نشاں جو آنکھ سے نظر بھی نہیں آتا اور سینکڑوں، ہزاروں کو غارت کردینے کی طاقت سمیٹے ہوئے ہے۔۔۔وائرس!

کسی نے اس کو پہچان کر اس کا نام لے لیا۔یہ نام زور زور سے پکارا گیا اور چھینکوں کے بڑھتے ہوئے حجم کے اوپر جا کر سنائی دینے لگا۔

بدن کی پوروں میں چھپی ہوئی اپنی کمین گاہ میں اس نے دیکھا۔رگ وریشے کا ایک ہجوم نظر آیا جو اس کے لیے بے حد لذیذ تھا۔وہ گوشت کے اس پہاڑ میں کود پڑنے کے لیے تیار تھا۔پھر اس کے دانت ہوں گے اور وہ شہوت بھرا بدن! اس میں اُس کی بقا تھی، اس کا نشانہ بننے والے کے ساتھ جو ہوتا ہے، ہوا کرے۔اس کو تو اپنی بھوک سے بڑھ کر غذا ملنے والی تھی۔گھر آنگنی سے بادل اٹھا، گلی محلوں میں پھیلا، شہر کا شہر لپیٹ میں آگیا۔چھینکتے ہوئے لوگ، کھانسنے لگے۔کھانس کھانس کر بخار میں مبتلا ہوگئے۔پسلیوں کو دبائے پھرنے لگے جیسے پھٹ ہی تو جائیں گی۔گھر گھر کہرام مچ گیا۔لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔وائرس چپکے چپکے اپنا کام کررہا تھا اور ہنس رہا تھا۔اس کی ہنسی میں دنیا تلپٹ ہونے لگی۔ریلوے اسٹیشن ویران ہوگئے۔ایئرپورٹ بند اور فلائٹ منسوخ۔ملکوں کے درمیان چیک پوسٹ پر ہتھیار والوں کے ساتھ گیس ماسک والے نوجوان آگئے۔ابھی ایک ملک تو ٹی وی چینل پر دوسرے ملک سے وائرس پھیلنے کی خبر۔لیکن لاشیں کسی کو دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ایسا کیوں؟ لاشیں کہاں ہیں، پھر غائب کہاں ہوجاتی ہیں۔

شہر کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لاش برابر کے مکان سے، اگلی گلی سے، ادھر کے چوک سے اٹھی ہوگی۔اس طرح سمجھ رہا تھا وہ آدمی جو چھینک سے ڈر گیا تھا، اس لیے کہ اس کے ذہن میں شبہات بہت تھے۔جب بیماری کے اس ہلّے پر اس قدر شور مچ رہا ہے تو لامحالہ لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہوں گے۔اس طرح سوچ رہا تھا وہ آدمی اور اس بات پر تشویش نہیں تھی کہ لاشیں۔۔۔

گھر سے نکلنا اس نے بند کردیا تھا۔منہ پر ماسک لگا کر بھی نہیں۔موبائل فون کے اسکرین پر نظریں جمائے رکھتا اور لمحے لمحے کی خبر سامنے آجاتی کہ کہاں کیا ہورہا ہے۔اور جو نہیں ہورہا ہے، وہ بھی ہورہا ہے۔اب اسی طرح ہوتا ہے۔

لوگوں پر اور ٹیلی وژن، ٹیلی فون پر بیماری کی یلغار ہوتے وہ بھی دیکھ رہا تھا، وہ آدمی جو پہلے ہی اپنی ابتلا کا مارا ہوا تھا۔اس بار وہ خبر پر اعتبار کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ لوگ تو ٹیلی ویژن کے اسٹائل میں ایک میز کے گرد کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور کیمرے کی طرف دیکھ کر مائیک میں بات کررہے تھے لیکن نیچے چینی جاپانی حروف میں عبارت لکھی ہوئی آرہی تھی جس کی وجہ سے اس کا اعتبار پختہ ہورہا تھا۔ان میں سے ایک آدمی نے کلف لگے لہجے میں بولنا شروع کیا اور اسکرین پر کل رات کی ویڈیو چلنے لگی جن میں مُنھ بند، ہوا بند لباس میں دو لوگ اس طرح قدم اٹھا رہے تھے جیسے ہوا کی کمی کی وجہ سے ان کے لیے چلنا محال ہو۔کل رات اس آدمی نے اپنے اسکرین پر سنا کہ صرف چین میں، جہاں سے اس نئی بیماری کا آغاز ہوا ہے، اتنے اور اتنے ملین افراد میں وائرس کی موجودگی کی تصدیق ہوچکی ہے جب کہ

حکومت سر توڑ کوشش کر رہی ہے کہ یہ اعداد و شمار ملک سے باہر نہ جانے پائیں۔ اس لیے جس شہر سے یہ وبا پھوٹی ہے وہاں مُردہ خانے چوبیس گھنٹے کھلے ہوئے ہیں اور لاشوں کو تلف کرنے کا کام پوری تیزی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ جس گھر میں کسی ایک فرد پر بھی وائرس کی موجودگی کا شُبہ ہو جائے، اس گھر کے کھڑکی دروازوں پر پلاسٹک چڑھا کر سیل بند کر دیا گیا ہے۔ ان گھروں میں محصور لوگوں کو خوف ہے کہ وہ پانی اور کھانا نہ پہنچنے کی وجہ سے اپنی جان سے جائیں گے۔

اس آدمی نے سُنا کہ سنگاپور میں وائرس کی تصدیق ہونے کے بعد تمام اسکول، کالج، یونیورسٹیاں بند کر دیے گئے۔ ہانگ کانگ میں سرحدوں پر نگرانی اور چیکنگ کی نوعیت بدل گئی۔ شمالی کوریا میں فیصلہ کیا گیا کہ بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے جس کسی پر شُبہ ہوگا کہ اس کے جسم میں وائرس داخل ہو گیا ہے، اس کو گولی مار دی جائے گی۔ تب اس آدمی نے جو پہلے ہی شُبے میں تھا، ٹیلی فون پر نئی خبر میں blower-whistle کے بارے میں سُنا جس کے بارے میں کچھ اور نہیں پتہ تھا، سوائے اس کے کہ اس نے اپنے ملک کے بارے میں برملا کہہ دیا کہ اتنے اور اتنے ہزار بدن روزانہ تلف کیے جا رہے ہیں اور اصلی اعداد و شمار نہ بتانے کی وجہ سے اس ملک کی ذمہ داری ہوگی، اس لیے کہ یہ بیماری ایک سے دوسرے ملک میں اس تیزی سے پھیل رہی ہے کہ اگر روک تھام کا کوئی موثر طریقہ نہ ملا تو دنیا کی پوری آبادی کی بہت بڑی تعداد اس کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ اس نے واپس جا کر فلم کا اتنا حصّہ دوبارہ چلایا کہ اعداد سننے میں غلطی نہ کر دی ہو۔ مگر ٹیلی فون کی اسکرین پر یہ تعداد لکھی ہوئی نظر آنے لگی۔

اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے مرنے کا سُن کر اس کو تشویش ہونے لگی اور پھر ایک تسکین سی جو اپنی مجبوری کے آگے سر جھکا لینے سے ہوتی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، جو سب کے ساتھ ہوگا اس کے لیے مجھ کو بھی تیار رہنا چاہیئے، ماسک کے باوجود۔ اور پھر جیسے اس کی آنکھیں مُندنے لگیں۔

آنکھیں بند ہونے لگیں تو اس کو پہلے سے بھی زیادہ صاف دکھائی دیا۔ گلے کی خراش ایک سانپ کی طرح رینگتی ہوئی، لہراتی ہوئی اس کے حلق سے نکلنے لگی۔ سانپ کی دم اس کے سینے پر تازیانے کی طرح لہرا رہی تھی، زور زور سے چوٹ مار رہی تھی مگر سانپ اس کے منہ سے نکل رہا تھا اور نکل کر پھیلتا جا رہا تھا۔ دیو قامت ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ خود چھوٹا پڑ گیا اور اس کے مُنہ سے نکلنے والا سانپ اجگر بن گیا۔ ہیرے کی کنی جیسی آنکھیں جگر جگر کرتی تھیں اور دوشاخہ زباں منہ سے باہر آتی تو پھنکار کے ساتھ شعلے برآمد ہوتے۔ اس کے دونوں طرف سیاہ فام پنجے تھے جن سے وہ کسی بھی چیز کو اٹھا سکتا تھا اور بڑے بڑے پَر جن میں ہڈیوں کی ساخت زیادہ ابھر کر دکھائی دینے لگی جوں جوں وہ اجگر بڑا ہوتا گیا، اس کے پر پھیلتے گئے۔ اس نے اپنے بے شمار پنجوں میں نہ جانے کتنے آدمی دبائے ہوئے تھے اور پر مار کر پرواز کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے پنجوں میں دبے ہوئے آدمی چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے، گرے جا رہے تھے اور ان کی جگہ اجگر دوسرے لوگوں کو اٹھا لیتا۔ جو لوگ پنجے میں پہلے ہی گرفتار تھے، وہ کہاں گئے؟ کیا اجگر نے انہیں اپنے پیٹ میں اتار لیا؟ اس کا مُنھ ایک دیو قامت سیاہ فام گڑھے کی طرح کُھلا ہوا تھا۔ میرا گھر، میری جائے پناہ اس سیاہ گڑھے میں تبدیل تو نہیں ہو گیا؟

تب اس آدمی نے اجگر کی طرف دیکھا۔ اجگر کی آنکھیں اس کی جانب تک رہی تھیں اور رہ بہت مانوس لگیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں مخاصمت کی آگ بے پایاں نفرت میں ڈھل رہی تھی، بلکہ یہ آنکھیں اس لڑکی کے چہرے پر بھی دکھائی دی تھیں جسے اس شہر میں ماسک لگائے سب سے پہلے دیکھا تھا، اور اس لڑکی سے بھی پہلے یہ آنکھیں اس عورت کے چہرے پر سرد آگ میں بجھی ہوئی تھیں جس نے اس پر شک کیا تھا، پھر ناگن کی طرح اس کو ڈسنے کے لیے آگے بڑھی تھیں یہاں تک کہ اس کے گرد زنجیروں کی طرح لپٹ جائیں گی۔ سانپ نے اس کو ڈس لیا تھا، اس لیے اس کے اندر بیماری کے آثار پیدا ہونے لگے۔

مجھے ناگن نے ڈسا ہے، وائرس نے نہیں ___ اس آدمی نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بتانا چاہا لیکن اس کی بات کسی نے نہیں سُنی۔ اجگر نے بے شمار آدمیوں کو اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے پرواز کے لیے پر مارے اور بہت آرام سے نیلگوں کرّے کے شمالی حصّے پر اتر کر بیٹھ گیا۔ کرّہ اس کے بوجھ سے دبنے لگا اور نیلی نیلی رطوبت اس کے اندر سے پھوٹ کر بہنے لگی۔ کھانسی کے دوران اسے پتہ نہیں چلا کہ اسے کہاں لے جایا گیا اور کب۔

آنکھ کھلی تو سینے میں دھسک اٹھ رہی تھی اور وہ اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہاں بالکل خاموشی طاری تھی ___ موت کی سی خاموشی۔

آنکھیں بند کرتے ہی اسے اجگر کی آنکھیں دکھائی دینے لگتیں اور اجگر میں جس عورت کی آنکھیں تھیں اس عورت کی آنکھیں جن میں تباہی تھی، بہت تباہی۔

یہ کون سی جگہ ہے، میں کہاں ہوں؟ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ میری دنیا کیوں برباد ہو گئی؟ اس نے زور سے چیخنا چاہا مگر جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہیں تھا۔

ٹیلی فون پر سگنل کی گھنٹی سنائی دی مگر اس سے پہلے کہ وہ اٹھانے کے بارے میں سوچتا، بستر کے سامنے ٹیلی ویژن اسکرین پر آواز گونج اٹھی ___ ''بریکنگ نیوز۔ مُشتبہ شخص کو قرنطینہ میں داخل کر دیا گیا۔ پراسرار بیماری کے وائرس کا شہر پر نیا حملہ۔۔۔ ہوشیار رہیے اور احتیاط سے سانس لیجیے۔

ہمارے چینل کے نمائندے کے مطابق وہ شخص بار بار ہاتھ جوڑ رہا ہے اور چیخ رہا ہے۔۔۔ مجھے جانے دو، میں تو پہلے ہی قرنطینہ میں تھا، میری دنیا تباہ نہ کرو، میری دُنیا۔۔۔''

''ماربا''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

گاڑی پارک کر کے جیسے ہی وہ اترا اس نے دیکھا ماربا آرام کرسی پر نیم دراز ہے وہ تیزی سے لان کی طرف بڑھا اور ماربا کے نزدیک جا کر فکرمندی کے لہجے میں بولا۔

''ارے تم باہر آ کر کیوں بیٹھی ہو تھک جاؤ گی۔ ویسے بھی اس موسم میں شام کے وقت ہلکی سی خنکی ہو جاتی ہے۔ تمہارا بخار بھی بڑھ سکتا ہے۔''

ماربا نے گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی اور شاید ساڑھی کے رنگ نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی کو قدرے کم کر دیا تھا۔ اس کی نسائیت جلال کی غیر معمولی توجہ سے اندر ہی اندر اترانے لگی تھی۔ اٹھلا کر بولی۔

''بہت دن ہو گئے تھے آپ کا استقبال کرنا نصیب نہیں ہوا تھا سو میں نے سوچا آج باہر بیٹھ کر آپ کو ویلکم ہوم کہوں۔'' اس سے پہلے کہ جلال کوئی جواب دیتا ماربا نے چہک کر ایک سوال جلال کی جانب پھینک دیا۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں۔؟ آج میں نے بہت عرصے کے بعد ساڑھی پہنی ہے۔''

جلال نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا ماربا کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی، اس کے چہرے کی گلابی رنگت زردی مائل ہو چکی تھی، اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ بے حد دبلی اور کمزور ہو چکی تھی۔ جلال کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ ''کاش وہ ماربا کی صحت واپس لا سکتا۔''

''تم بہت حسین لگ رہی ہو۔'' جلال ماربا کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

''ایک تو تم ہو ہی بلا کی خوبصورت اور پھر اس پر تمہارا یہ ساڑھی باندھنے کا انداز۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جلال شعر ایک خاص انداز سے پڑھتا تھا کہ حرف حرف دل میں اتر جائے۔ ماربا اپنی تعریف سن کر شرما گئی۔ اسی دوران خرم اور سحر بھی بھاگے بھاگے آئے اور بابا بابا کہہ کر جلال سے لپٹ گئے۔ جلال نے دونوں بچوں کو لپٹا لیا اور بولا ''تمہارے دونوں معصوم فرشتے بابا پر حق جمانے آ گئے۔ کچھ دیر باپ اور بچوں کا رومان چلاتا آنکہ بچے اپنی کھلائی رشیدہ کے ساتھ گھر کے اندرونی جانب لوٹ گئے جو بچوں کے تعاقب میں ہانپتی کانپتی پہنچ گئی تھی۔

جلال نے رشیدہ کو تاکید کی تھی کہ وہ بچوں کی ذمہ داری سے ماربا کو سبکدوش رکھے۔ رشیدہ خاصی بڑی رقم پر ان بچوں کے گورنس کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اسی سبب جلال کے آگے اپنی مستعدی کی نمائش کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔

بچوں کے اندر چلے جانے کے بعد جلال نے ماربا کو آرام کرسی پر سے اٹھایا اور اس کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم کی طرف چلا۔ وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح مچل گئی ''نہیں میں بیڈ روم میں نہیں جاؤں گی۔ ڈائننگ روم میں چلو آج ہم ساتھ ہی چائے ناشتہ کریں گے اور آج ڈنر بھی ساتھ ہی کیا جائیگا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔۔۔ آپ کی اپنی ماربا کا۔''

''جو حکم سرکار۔'' جلال نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں چلتے ہوئے کھانے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔

''جلال مجھے بے حد دکھ ہے کہ میں نے تمہاری کبھی کوئی خدمت نہیں کی، کوئی آرام تمہیں نہیں پہنچایا، ہمیشہ تم سے اپنے ناز نخرے اٹھواتی رہی، اپنی باتیں منواتی رہی۔ مگر اب میری خواہش ہے کہ میں تمہاری خوب خوب خدمت کروں اپنے ہاتھوں سے تمہیں کھانا پکا کر کھلاؤں۔۔۔ لیکن شاید اب دیر ہو چکی ہے۔'' آخری جملہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی۔ جلال نے اس کا آخری فقرہ نہیں سنا۔ نقاہت نے ماربا کو زیادہ بولنے نہیں دیا۔ جلال نے اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ٹرے میں رکھا اور بولا۔

''تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ پھر میں تم سے خوب خدمت لوں گا۔ ڈاکٹر کے آنے کا وقت ہو گیا ہے، اب چل کر لیٹ جاؤ۔''

جلال نے سہارے سے ماربا کو اٹھایا اور خواب گاہ میں لے جا کر لٹایا۔ جیسے ہی وہ اس کو لٹا کر جانے کے لئے مڑا ماربا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''ایک بات کہوں!''

جلال اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور بہت محبت کے لہجے میں بولا

''ہاں بولو کیا بات ہے۔؟''

''کیوں نہ ہم کراچی چلیں میں کچھ دن آپ کے امی ابو کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

''تو اس میں کیا مشکل ہے۔ میں آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لے لیتا ہوں۔ پھر ہم سب کراچی چلیں گے ویسے بھی بہت دن ہو گئے ہیں ہم امی ابو کے پاس نہیں گئے ہیں۔ جلال نے کہا۔

جلال اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اسے ایک امریکن کمپنی میں ملازمت مل گئی مگر اس ملازمت کے لئے اسے اسلام آباد جانا پڑا۔ ملازمت ملتے ہی والدین نے شادی کرنے پر زور دیا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ماں کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ شادی کے لئے اس نے ہاں تو کر دی مگر اسے شادی سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کوئی خوشی۔ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔

شادی کے بعد جب اس نے پہلی مرتبہ ماربا کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اس سے پہلے اتنا حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ماربا پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں ایسی اتری کہ وہ اسے دل و جان سے چاہنے لگا۔

ماربا امیر ماں باپ کی لاڈلی بیٹی، بھائی بہن کی چہیتی، ساس سسر کی پیاری بہو اور اپنے شوہر کی دل و جان تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اتنی خوبصورت کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔۔ اپنے پرائے سب لوگوں نے اس کے حسن کی تعریف کر کر کے بچپن سے ہی اسے اسپوئل (Spoil) کر دیا تھا۔ محبت بھی اسے بہت ملی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائی سب اس سے بہت محبت کرتے، اس کی دلجوئی کرتے اس کی ہر خوشی، ہر ضد پوری کرتے۔ وہ نہ کسی کی خدمت کرتی اور نہ ہی کسی کی دلجوئی کرتی۔ وہ سوچتی ''سب اس کے لئے ہیں وہ کسی کے لئے نہیں ہے۔'' سب اس کی خوشامد کرتے رہیں، اس کی ہر بات مانتے رہیں یہی اس کی خواہش تھی۔ دوسروں کی خدمت کر کے، ان کے کام آ کر، جو خوشی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ اس سے واقف ہی نہ ہو سکی تھی۔

چھٹی ختم ہونے کے بعد جلال کو اسلام آباد جانا پڑا۔ وہ ماربا کو اپنے والدین کے پاس ہی چھوڑ گیا۔ وہ ان کی اکلوتی بہو جو تھی۔۔

جلال کے والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، انہوں نے اپنی بہو کے خوب ناز نخرے اٹھائے، وہ انہیں بہت عزیز تھی۔ ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بہو کو اپنے سے جدا کریں لیکن بیٹے کا بھی خیال تھا اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے کچھ دنوں کے بعد ماربا کو جلال کے پاس اسلام آباد بھیج دیا۔

جلال کو کمپنی نے اچھے عہدے کی وجہ سے بہت سہولیات دی تھیں، تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔ جلال نے ماربا کو بہت عیش و آرام سے رکھا ہوا تھا۔ وہ دن بھر ناولیں پڑھتی رہتی، ٹی وی دیکھتی رہتی، فون کرتی رہتی اعلیٰ طبقے کی خواتین اور ایک دو انگریز خواتین کے ساتھ پارٹیوں میں شرکت کرتی اور خود بھی پارٹیز کرتی اور شاپنگ کرنا، یہی اس کی مصروفیات تھیں۔ گھر کے کام کاج کے لئے نوکر تھے، گھر کا کوئی کام اسے نہیں کرنا پڑتا۔ شادی کے ایک سال بعد خرم پیدا ہو گیا جلال نے اس کے لئے بھی ایک آیا کا انتظام کر دیا۔ خرم کے دو سال بعد سحر پیدا ہو گئی رشیدہ جو خرم کی دیکھ بھال کرتی تھی اب دونوں بچوں کو سنبھالنے لگی۔ ماربا کی مصروفیات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن تمام مصروفیات کے باوجود وہ اپنے بچوں کو ضرور وقت دیتی، ان سے کھیلتی، ان سے باتیں کرتی، ان کے پسندیدہ کھلونے خرید کر انہیں دیتی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا ماربا کے چاروں اُور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، محبتیں ہی محبتیں تھیں۔

اچانک ماربا کو بہت تیز بخار ہوا، بخار کافی دنوں تک رہا۔ اس کے بعد سے اکثر یہ ہوتا کہ کچھ دنوں وہ ٹھیک رہتی پھر اسے بخار ہو جاتا، کبھی تیز اور کبھی ہلکا۔ جوب کی طرف سے جلال کو اعلیٰ طبی سہولیات حاصل تھیں، بہترین ڈاکٹرز اس کا علاج کر رہے تھے، اس کے ٹیسٹ کروائے جاتے، ڈاکٹرز اس کا چیک اپ کرتے ،مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ جلال نے ماربا کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یہاں تک کہ حکیم کو بھی دکھایا۔ ماربا حکیم کی دوائی بہت مشکل سے کھاتی تھی لیکن جلال نے سمجھا بجھا کر ایک مہینے تک حکیم کی دوائی بھی کھلائی مگر کوئی افاقہ نہیں دکھائی دیا۔

اب تو اس کو مستقل بخار رہنے لگا، کبھی کم اور کبھی زیادہ، وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی اس کا رنگ روپ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے بارے میں بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے۔

ماربا بہت بدل گئی تھی، اس کی خواہشیں کم ہو گئی تھیں اس کا غرور ختم ہو گیا تھا۔ رحم، مروت، محبت پہلے جن کے معنوں سے بھی وہ بظاہر نابلد تھی اب اس کی شخصیت میں جگہ پانے لگے تھے۔ اس نے اپنی بیماری سے بھی بیزار ہونا چھوڑ دیا تھا۔ خیریت پوچھنے والوں سے بھی وہ شکر گزاری کا اظہار کرتی اور خود بھی رب کا شکر کرتی رہتی۔

اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ شاید اب زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اسے والدین کی محبت، بھائی بہن کا پیار، ساس سسر کا بیٹی کی طرح سمجھنا اور اسے بے حد محبت دینا، جلال کی محبت، پیار، اس کی ہر فرمائش پوری کرنا، اس کے ناز نخرے اٹھانا سب یاد آنے لگا، پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ سب کے اتنے اچھے سلوک کے بدلے میں اس نے انہیں کیا دیا۔۔۔۔ وہ اپنے آپ کو گنہگار سمجھتی تھی اور سب سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ جلال سے بھی وہ بار بار معافی مانگتی۔

جلال ماربا کی اس تبدیلی سے خوش ہونے کے بجائے فکر مند تھا۔ ایک دن ماربا سے بولا ''تم مجھ سے فرمائشیں کیوں نہیں کرتیں۔؟ اور اپنی طبیعت کی خرابی کی بھی کوئی بات نہیں کرتی ہو۔''

''طبیعت کی خرابی کی تو میں عادی ہو گئی ہوں اور رہی فرمائش کی تو جب ضرورت ہو گی تو میں ضرور فرمائش کروں گی۔ ماربا نرم لہجے میں بولی۔

جلال اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے ماربا کو لپٹا لیا۔

جلال اور ماربا کے والدین ان لوگوں کے آنے سے بہت مطمئن تھے۔ کیوں کہ ماربا کی بیماری کی وجہ سے سب ہی بہت پریشان اور فکر مند تھے اور یہی چاہتے تھے کہ یہاں کے بہترین ڈاکٹرز سے اسکا علاج کرایا جائے۔ کراچی آ کر ماربا بھی بہت خوش تھی۔ وہ اپنے ساس سسر سے لپٹ کر بہت روئی، ان سے بہت معافیاں مانگیں کہ میں آپ لوگوں کی کوئی خدمت نہ کر سکی الٹا آپ لوگوں سے اپنے نخرے اٹھواتی رہی۔ اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے مل کر بھی بہت روئی ان سب سے بھی بہت معافی مانگی۔ مگر ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں ''اپنی سسرال میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔''

جلال آغا خان ہسپتال کے جس فزیشن سے اس کا علاج کروانا چاہتے تھے معلوم ہوا وہ لندن گئے ہوئے ہیں چار دن بعد لوٹیں گے جلال نے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''ماربا! کیوں نہ ہم کلفٹن چلیں وہاں کی فریش ہوا شاید تمہیں فائدہ کرے۔اور کیونکہ ویک ڈیز ہیں اس لئے زیادہ مجمع بھی نہیں ہوگا۔۔۔'' جلال نے ماربا سے کہا۔

وہ دونوں ہوٹل کے باہر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے سمندر صاف نظر آرہا تھا۔شام کا وقت تھا،سورج غروب ہونے پر تھا،ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری فضا کو سونے سے نہلا دیا گیا ہو۔جلال اور ماربا اس نظارے سے لطف اندوز ہورہے تھے اور گھونٹ گھونٹ کافی پی رہے تھے۔

''وہ دیکھو کتنا بڑا چاند نکلا ہے۔'' ماربا انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کرکے جلال سے مخاطب ہوئی۔

''اس کا مطلب چودھویں کا چاند ہے۔'' جلال چاند کی طرف دیکھ کر بولا۔دیکھتے ہی دیکھتے سنہری ماحول چاند کی ٹھنڈی فضا میں بدل گیا۔شام گہری ہونے کے ساتھ موجوں کا تلاطم بھی بڑھ گیا اور ٹھنڈک بھی بڑھ گئی۔ماربا نے کھانسنا شروع کردیا۔

''ہمیں اب گھر چلنا چاہئے۔تمہاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔'' جلال نے اٹھتے ہوئے کہا اور ماربا کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ماربا بہت خوش تھی بہت عرصے کے بعد وہ جلال کے ساتھ اس طرح تفریح کے لئے نکلی تھی۔

تھکن کی وجہ سے ماربا جلدی سوگئی۔جلال کو نیند نہیں آرہی تھی۔آدھی رات کے وقت ماربا کی آنکھ کھلی وہ بہت بے چین ہورہی تھی اچانک اس پر غفلت طاری ہونے لگی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا جلال اس کے پاس بیٹھا تھا جلال کو دیکھکر جیسے اسے ہوش آگیا۔اس نے جلال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا بڑی مشکل سے بولی۔''جلال! میں مرنا نہیں چاہتی، میں تم سب سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔'' اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

جلال پریشان سا ہوگیا اور بولا۔''تم ایسی باتیں کیوں کررہی ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا،میں تمہیں اپنے سے جدا نہیں ہونے دوں گا تم بہت جلد اچھی ہوجاؤ گی۔''

''کوئی مجھے اس خوبصورت زندگی سے دور لے جانا چاہتا ہے۔'' ماربا نے جلال کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

''ماربا! پلیز ایسی باتیں مت کرو تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کرسکتا۔'' جلال رورہا تھا۔

''چند لمحوں بعد ماربا نے آنکھیں کھول کر جلال کی طرف دیکھا اور بولی''اللہ حافظ۔۔۔''

جلال اسے چیخ چیخ کر آوازیں دے رہا تھا اور رورہا تھا۔۔۔گھر کے سب لوگ اکھٹے ہوگئے،فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ہر آنکھ اشکبار تھی۔اور جلال۔۔۔وہ ماربا کی جدائی کے صدمے سے بے حال تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے خرم اور سحر کی وجہ سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ماربا کی موت کا غم جلال کے والدین کو بھی بہت تھا۔وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح مانتے تھے۔لیکن خرم اور سحر کی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ جلال شادی کر لے۔لیکن جلال شادی کا نام تک سننے کو تیار نہیں تھا۔

ماربا کی موت کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا۔اس مرتبہ جلال کراچی اپنے کزن کی شادی میں آیا تھا۔جلال کو دیکھتے ہی خرم بھاگ کر اس کی گود میں چڑھ گیا۔جلال نے ادھر اُدھر دیکھا پھر پوچھنے لگا''امی سحر کہاں ہے۔؟''

اتنے میں سحر ایک نازک سی لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے آئی۔سحر جلال کو دیکھتے ہی اس لڑکی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بابا بابا کہتی ہوئی جلال سے لپٹ گئی۔

''امی! یہ لڑکی کون تھی۔؟'' کُسم کے جانے کے بعد جلال نے پوچھا۔

''یہ میری دوست کی بیٹی کسم ہے۔پہلے یہ پشاور میں رہتے تھے تقریباً ایک سال ہوا یہ لوگ کراچی شفٹ ہوگئے ہیں۔نزدیک ہی رہتے ہیں۔تم نے دیکھا دونوں بچے اس سے کسطرح مانوس ہوگئے ہیں۔''

جلال خاموش ہوگیا وہ ماں کا مطلب سمجھتا تھا۔ماں نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔

کُسم کو دیکھ کر ماربا کے ساتھ بتایا ہوا ہر ایک پل پلٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنی بند آنکھوں کے آگے کُسم کو موجود کرلیا۔کُسم کا چہرہ مہرہ ماربا سے بالکل مشابہہ نہ تھا اس کے باوجود وہ ماربا لگ رہی تھی۔کُسم کا سارا وجود، ظاہر، باطن ماربا کو وائبریٹ کررہا تھا۔جلال نے کسم کو اپنی بند آنکھوں سے دیکھنے اور اس کی جگہ ماربا کو محسوس کرنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔اپنے حواس مجتمع کئے،سر کو ایک دو مرتبہ دونوں جانب گھمایا اور اپنی حالت پر ہنسا۔''ماربا کی جدائی شاید مجھ سے برداشت نہیں کی جارہی ہے۔اس کا دنیا سے چلا جانا میرے دل، ذہن اور روح نے اب تک قبول نہیں کیا ہے اسی لئے کسم میں ماربا کا احساس ہو رہا ہے۔لیکن کسم ہی کیوں۔؟ ماربا کی عمر کی ہر قبول صورت عورت کے اندر ماربا کیوں نہیں محسوس ہوئی۔۔۔''

شادی کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد ایک دن ماں نے جلال کو اکیلے میں بٹھا کر بہت سمجھایا کہ''کُسم بہت اچھی لڑکی ہے میں اس کے پورے خاندان سے واقف ہوں۔تمہارے بابا کو بھی پسند ہے، بچے بھی اس سے بہت ہل گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔'' لیکن جلال نے شادی کرنے سے صاف انکار کردیا اور جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ماربا مستقل اس کے سامنے تھی اس کی ایک ایک بات اس کو یاد آرہی تھی۔ماربا کی یاد میں آنکھیں، رخسار اور تکیہ بھگوتے ہوئے اس نے دیکھا ماربا اس کے بیڈ کے سامنے کھڑی ہے۔ سفید ساری میں ملبوس وہ حسن کی زندہ تجسیم دکھائی دے رہی تھی۔

جلال نے اس کا نام لیا یا شاید اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ماربا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کردیا، وہ ہنسی اپنی مخصوص دلآویزی سے

باقی صفحہ ۷۴ پر ملاحظہ کیجیے

''داستانِ حیات''

اقبال عظیم

(۸۔جولائی ۱۹۱۳ء تا ۲۲۔دسمبر ۲۰۰۰ء)

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا، سر بزم رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی، مجھے رنج ہے یہ برا ہوا

میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی روشنی ابھی تیرگی، نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

مجھے جو بھی دشمن جاں ملا، وہی پختہ کار جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا

مجھے آپ کیوں نہ سمجھ سکے، کبھی اپنے دل سے بھی پوچھیے
میری داستان حیات کا تو ورق ورق ہے کھلا ہوا

جو نظر بچا کے گزر گئے میرے سامنے سے ابھی
یہ میرے ہی شہر کے لوگ تھے، میرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا

ہمیں اس کا کوئی بھی حق نہیں کہ شریک بزم خلوص ہوں
نہ ہمارے پاس نقاب ہے، نہ کچھ آستیں میں چھپا ہوا

میرے ایک گوشۂ فکر میں، میری زندگی سے عزیز تر
میرا اک ایسا بھی دوست ہے، جو کبھی ملا نہ جدا ہوا

مجھے اک گلی میں پڑا ہوا، کسی بدنصیب کا خط ملا
کہیں خونِ دل سے لکھا ہوا، کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

مجھے ہم سفر بھی ملا کوئی تو شکستہ حال میری طرح
کئی منزلوں کا تھکا ہوا، کہیں راستوں میں لٹا ہوا

ہمیں اپنے گھر سے چلے ہوئے، سرِ راہ عمر گزر گئی
کوئی جستجو کا صلہ ملا، نہ سفر کا حق ہی ادا ہوا

یونس شرر

(نیویارک)

اس کی نگاہ کیا اٹھی ہاتھوں میں جام رہ گیا
جیسے کنول کھلا ہوا پانی میں شام رہ گیا

بنجیے ادھیڑ ادھیڑ کر سیتا رہا میں رات بھر
مجھ کو فراق یار میں اب یہ ہی کام رہ گیا

میں اس کی چیخ سن کے پھر رات بھر رہا ملول
جو اک پرندہ شاخ پر زیر دام رہ گیا

لکھوں اگر تو کیا لکھوں بساط دل الٹ گئی
کہ لوح دل پہ نقش صرف تیرا ہی نام رہ گیا

رفاقتیں نہ قربتیں فضا میں زہر گھل گیا
ہوا چلی تو خوف سے دعا سلام رہ گیا

ہرے بھر شہر کی اب وہ رونقیں کہاں رہیں
مکیں رہے نہ بستیاں ویران بام رہ گیا

یہ ہجر کا عذاب اب ختم ہو نجانے کب
اے زندگی بتا مجھے کتنا قیام رہ گیا

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

اظہارِ مدعا پہ رہے گا ملال بھی
اس خوبرو سے کاش نہ کرتے سوال بھی

زندہ ہیں اس کے وعدۂ وفا پہ دوستو
آیا مگر نہ شیشے میں ہلکا سا بال بھی

وہ کم سخن کبھی تو بنے گا معینِ غم
حرفِ ہنر میں اس کے ہے عینِ کمال بھی

عہدِ شباب خواب کی صورت ہے ان دنوں
تقدیر میں تھا عمرِ رواں کا زوال بھی

وقتِ سحر جو اس سے ملاقات ہو گئی
دشتِ وفا میں گونجی اذانِ بلال بھی

ہم مہ رخوں سے آج بھی رکھتے ہیں دوستی
صنفِ غزل میں کر گئے ہم عرضِ حال بھی

ہم آفتاب سے نہ کرن مانگتے حسنؔ
آتا نہ کاش دل میں طلب کا خیال بھی

○

محمود شام

(کراچی)

شاہ کی ہے منافقت۔ عادت
اہلِ دانش کی مصلحت۔ عادت

حسن کو ہے سپردگی سے گریز
عشق کی ہے مصاحبت۔ عادت

اب خدائی ہے کچھ گھرانوں کی
باقیوں کی عبودیت۔ عادت

دن بہت کھردرے گزرتے ہیں
شام کی ہے ملائمت۔ عادت

حکمراں کچھ بھی بول دیتے ہیں
ترجمانوں کی معذرت۔ عادت

مستقل تو کہیں قیام نہیں
سانس کی ہے مسافرت۔ عادت

جسم ہتھیار ڈال دیتا ہے
سوچ کی ہے مزاحمت۔ عادت

ساتھ دیتا ہے صرف غم اپنا
سرخوشی کی مفارقت ۔عادت

شیر دل کاروبار کرتے ہیں
بزدلوں کی ملازمت ۔عادت

○

واصف حسین واصف
(نیویارک)

ان کہے لفظ کی تصویر بنانی آئی
دیر سے آئی مگر حاشیہ خوانی آئی

عشق سینے پہ لکھا، آنکھ میں پانی رکھا
اور پھر شعر لکھا، درد فشانی آئی

زخم سینے پہ قرینے سے لگے دیکھے تو
مجھ کو دیوار پہ تصویر سجانی آئی

دودِ اوہام نے آنکھوں سے لہو مانگ لیا
دے کے بینائی خداؤں سے نبھائی آئی

شہر میں رہتے ہوئے دشت نوردی سیکھی
اور پھر قیس کی روداد سنانی آئی

پھر سے سیلاب نے کشکول بھرا دریا کا
پھر سے خیرات ملی ہے تو روانی آئی

دشت اوڑھا نہ گیا، خاک بسر ہو نہ سکے
عشق کی رسم کہاں ہم کو نبھانی آئی

آسماں ہاتھ پہ رکھا تو کئی راز کھلے
اور ہواؤں میں ہمیں گرہ لگانی آئی

○

ہارون الرشید
(بالاکوٹ)

کٹ گئے دن تو ناگہاں آئی
اک خوشی آئی تو کہاں آئی

بند تھے سوتے میں میری آنکھوں کے
پانی آیا تو جاں میں جاں آئی

جانے کس زخم سے وہ نکلی تھی
اک صدا چھو کے آسماں آئی

میں کسی دشت سے گزر رہا تھا
کان میں فجر کی اذاں آئی

جب بھی جھگڑا ہوا کبھی گھر میں
بیچ آیا کوئی تو ماں آئی

جس نگر سے کبھی میں گزرا تھا
لے کے تقدیر پھر وہاں آئی

○

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں، کشمیر)

مجھ کو ایسے لگتا ہے گھر سے جب نکلتا ہوں
ہر کوئی مکمل ہے ایک میں ادھورا ہوں

اجنبی ہوں اپنوں میں بھیڑ میں اکیلا ہوں
میں کہ اک دریچہ ہوں اور بند رہتا ہوں

کوئی بوند پانی کی ریت میں نہیں ٹھہری
میں بھی کن زمینوں پر اَبر بن کے برسا ہوں

منتظر ازل سے ہوں میں کسی کولمبس کا
بیکراں سمندر میں بے نشاں جزیرہ ہوں

آئے گی کوئی آندھی بے نشان کر دے گی
ریگ زار پر لکھا میں کوئی نوشتہ ہوں

نام جس کا دنیا ہے میری قبر ہے دراصل
دیکھنے میں زندہ ہوں سوچئے تو مردہ ہوں

پر کہیں مرا بیتابؔ ہے کہیں مری پرواز
سرحدوں سے ناواقف بے وطن پرندہ ہوں

○

علی ارمان
(راولپنڈی)

کمرے میں تیس روز سے دیوانہ بند ہے
تم رو رہے ہو شہر کو، ویرانہ بند ہے

مکّے میں ہے طوافِ حرم بھی رُکا ہوا
اور میکدے میں گردشِ پیمانہ بند ہے

اک شمع جل رہی ہے اکیلی مزار پر
پروانگی حرام ہے پروانہ بند ہے

مشرک بھی دل شکستہ مسلماں بھی دل فگار
مسجد کی تعزیت میں صنم خانہ بند ہے

ممنوع ہے مکالمہ ساحل کی ریت سے
اپنے بدن کو دھوپ میں نہلانا بند ہے

رندوں کو روندنے کا مزہ بھی نہیں رہا
واعظ کو رنج یہ ہے کہ میخانہ بند ہے

ماتم یہ ہے کہ جرم ہے ماتم کی بھیڑ بھی
روتے ہیں سب اکیلے عزا خانہ بند ہے

وہ بام پر اکیلا ہے سنسان ہے گلی
چاروں طرف سے کوچہ جاناں بند ہے

ارمان پھر رہی ہے کھُلی موت شہر میں
اور زندگی کا نعرہ ِ مستانہ بند ہے

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

یہاں تو پیاس کے مارے زباں نکل آئے
پڑے ہیں سوچ میں یہ ہم کہاں نکل آئے

مسافتیں بھی تماشے عجب دکھاتی ہیں
چلو تو پاؤں میں آبِ رواں نکل آئے

ہم اختصار کو تفصیل کر رہے ہیں بہت
بس ایک حرف سے سارا جہاں نکل آئے

میں کس تماش کے وہم وگماں میں رہتا ہوں
بھری بہار کو دیکھوں خزاں نکل آئے

دعا تھی یار کی بستی میں امن قائم ہو
ذرا سی بات پہ تیر و کماں نکل آئے

غزل کی ایسی بلندی پہ ناز کرتا ہوں
زمیں کے شعر سے جب آسماں نکل آئے

غموں کو راز میں رکھنا محال ہے ثاقبؔ
جو زخم باندھ کے رکھوں دھواں نکل آئے

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

چاہے رُک جائے نمُو، ذوقِ نمُو جاری رہے
بانجھ موسم میں بھی ذکرِ رنگ وبُو جاری رہے

بوند بھر پانی میسّر میرے ہونٹوں کو نہ ہو!
پھر بھی یہ میری دُعا ہے، آبجُو جاری رہے

میکشوں کو یہ قرینہ آتے آتے آئے گا
میکدہ ہو بند تو بھی ہاؤ ہُو جاری رہے

جو بھی منظر سامنے ہے، وہ بدلنا ہے ضرور
کیا ضروری ہے کہ سب کچھ ہُو بہُو جاری رہے؟

مانگتے ہیں اب یہی وہ میرے ہونے کا ثبوت
دم نہ توڑوں، اور زخموں سے لہُو جاری رہے

ہاں، ہمیں منظور ہے تشنہ لبی اِس شرط پر
میدے میں گردشِ جام وسبُو جاری رہے

غم ہی کیا ہے، گر ذخیرہ آنسوؤں کا ختم ہے
گر نہیں آنسو تو آنکھوں سے لہو جاری رہے

حلقۂ احباب سے ترکِ تعلّق کیوں کریں
متّفق چاہے نہ ہوں ہم، گفتگُو جاری رہے

اپنے گھر کی چار دیواری میں ہم محصور ہیں
وحشتوں کا رقص چاہے چار سو جاری رہے

یہ عبادت ہی مرے نزدیک ہے افضل ترین
بس نمازِ عشق اپنی قبلہ رُو جاری رہے

ہاتھ میں تسبیح رکھیں، یہ ضروری تو نہیں!
دل کی دھڑکن میں نسیم اللہ ہُو جاری رہے

○

عرش صہبائی
(جموں)

ہو گئی مجھ سے کیا خطا کوئی
کس لیے ہے خفا خفا کوئی

ذرّے ذرّے میں ہے جھلک اُس کی
نور افشاں ہے جا بہ جا کوئی

زندگی ہے خطاؤں کا مرکز
کس سے ہوتی نہیں خطا کوئی

سینکڑوں فرض ہیں زمانے میں
پھر بھی ہوتا نہیں ادا کوئی

اختتام اس کا عین لازم ہے
جب ستم کی ہو ابتدا کوئی

جب گزرتا ہے وہ مرے دل سے
چھوڑ جاتا ہے نقشِ پا کوئی

میں نے ہر اک کو آزمایا ہے
لیکن اترا نہیں کھرا کوئی

اُس کو ہو گی نصیب کیا منزل
عرشؔ جب ہو شکستہ پا کوئی

○

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

میری خطاؤں کے قصے انہیں سناتے رہے
میری وفاؤں کا بدلہ وہ یوں چکاتے رہے

جو دور پیار کا گزرا ہمارے رشتوں کا
نہ تھا وہ آنکھ سے اوجھل مگر بھلاتے رہے

کبھی جو پیار سے نظریں جمائے رہتے تھے
جب آئے سامنے، نظروں کو وہ چراتے رہے

گورازداں تھے ہمارے وہ عمر بھر کے لیے
مگر وہ راز ہمارے انہیں بتاتے رہے

وہ چشمِ نم جو نظر آئیں میری صورت پر
پلٹ کے دیکھا مگر پھر بھی مسکراتے رہے

سنا ہے موم بھی بنتے ہیں سنگدل انساں
مگر وہ موم کو پتھر نما بناتے رہے

گلہ نہیں ہے مگر پھر بھی سوچتا ہوں کبھی
نہ جانے نقش ہمارے وہ کیوں مٹاتے رہے

ریاضؔ تم بھی بھلا دو کسی کی یادوں کو
ہزار جبر کیا پھر بھی یاد آتے رہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

زندگی یاد کے پہلو میں گزاری، ہوئی شام
تھکا ہارا ہُوا دن تھا، تھکی ہاری ہوئی شام

جیسے باندھا گیا ہو پاؤں سے پتھر کوئی !
ایسے ٹھہری ہوئی، بوجھل ہوئی، بھاری ہوئی شام

درِ مے خانہ پہ دیکھے ہیں اکٹھے تو نے!
کبھی ہارا ہُوا عاشق ، کبھی ہاری ہوئی شام

روز جاتی ہے ستاروں کا خزانہ لے کر
روز آ جاتی ہے افلاس کی ماری ہوئی شام

جانے کیا کیا نہ ستم ڈھائے گی آگے آگے!
صبح کے ساتھ ہی اعصاب پہ طاری ہوئی شام

اُڑتا پھرتا تھا مُنڈیروں پہ تو دن روشن تھا
جوں ہی ماری ہے پرندے نے اُڈاری ہُوئی شام

سانس لینا مجھے دشوار ہوا جاتا ہے !
پہلے کیا کم تھی ، جواب اور بھی بھاری ہوئی شام

کیا گھنی چھاؤں، گھنی رات میں ڈھل جاتی ہے؟
دھوپ کی شال درختوں نے اُتاری، ہوئی شام

جھیل تک آ گیا آفاق سے خوں بہتا ہُوا
دیکھتے دیکھتے سورج کی شکاری ہوئی شامل

○

نثار ترابی

(راولپنڈی)

سوگواری کی فضا لے کے چلی آئی ہے
یہ ہوا کیسی ہے کیا لے کے چلی آئی ہے

موت بیٹھی تھی مچانوں پہ نشانے لے کر
موقع پاتے ہی وبا لے کے چلی آئی ہے

کتنے برسوں سے رکی بیٹھی تھی ہلچل کوئی
جو کیا اُس کی سوا لے کے چلی آئی ہے

مجھ کو تو شہرِ خموشاں کا گماں ہونے لگا
جانے کس سمت ہوا لے کے چلی آئی ہے

رنج بھی اس کو ستاتا ہے ہری بیلوں کا
دکھ گلابوں کے صبا لے کے چلی آئی ہے

کوئی تو عرصۂ محشر کی گھڑی سے پوچھے
کس لیے آہ و بکا لے کے چلی آئی ہے

تھا یقیں مل کے کھلیں گے گلِ تازہ لیکن
رُت بچھڑنے کی ادا لے کے چلی آئی ہے

سر جھکائے ہوئے مولا میں کھڑا ہوں در پہ
بے بسی حرف دعا لے کے چلی آئی ہے

○

اینڈنتھنگ اِلس

مشتاق اعظمی

(آسنسول)

دیر سے رکی ہوئی ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا، جیسے دامن وفا کسی کے ہاتھ سے یکلخت چھوٹ جائے سعید کو سلیپر میں برتھ نہ مل سکی تھی۔ اس لئے وہ عام ڈبےّ میں چلا آیا تھا۔ وہاں اس نے اوپر کی ایک خالی بنک ڈھونڈ نکالی تھی۔ ہولڈال کھولتے ہوئے اس نے نیچے سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافروں پر ایک نظر ڈالی۔ ان میں کچھ جاگ رہے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے۔ غنودگی کی کیفیت میں ان کی گردنیں بار بار لڑھک کر کسی اور کے کندھے سے ٹک جاتی تھیں۔ پھر وہ چونکتے تھے اور سنبھل کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پتلی سی لکیر دوڑ گئی۔ کچھ دن پہلے تک ٹرین کے سفر میں اسے بھی اسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا تھا کہ اس کے سامنے اوپر کی بنک خالی پڑی ہوتی تھی۔ لیکن اس ڈر سے کہ سامان سے لدا پھندا کوئی مسافر آ کر اس سے بنک خالی کرنے کا مطالبہ نہ کرے اسے استعمال نہ کرتا تھا۔ لیکن اب۔۔۔ اب اس کے اندر بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا۔ اب وہ گاؤں سے پیدل چل کر شہر کے کالج جانے والا دبو اور شرمیلا طالب علم نہ تھا۔ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں ففتھ ایر میں پڑھنے والا ایک بے حد اسمارٹ اور ایکٹیو نوجوان تھا۔ فرینک اینڈ ایڈوانس۔۔۔ جسے اس کی بنک سے صبح کی پہلی کرن ہی اٹھا سکتی تھی۔ گاڑی تیز رفتار سے آہنی پٹریوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سردی سے بچنے کے لئے مسافروں نے کھڑکیوں کے شیشے نیچے گرا رکھے تھے۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ سگریٹ سلگا کر تین چار لمبے لمبے کش لیے تو دھواں چھت کے بلب کے آس پاس منڈلانے لگا۔ بلب کی مدھم روشنی دھند کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تکدر کی دھند بھی ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج اپنے چچا اور چچی سے جھگڑا کر کے چلا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے اس نے ان سے قطع تعلق ہی کر لیا تھا۔ وہ چچا جنہوں نے آج تک اس کی کفالت کی تھی، گریجویشن کرایا تھا اور پھر جب بزنس کے سلسلے میں انہیں کلکتہ میں رہنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے خیال سے اسے بھی کلکتہ بلا لیا تھا، اب ہمیشہ کے لئے چھوٹ چکے تھے۔ "میں کیا کر سکتا ہوں!" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ میں اپنی زندگی تو برباد نہیں کر سکتا۔ میں ان کے احسانات کی اتنی بھاری قیمت کیوں کر ادا کر سکتا ہوں۔ اس نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔ فیتے کھول کر جوتے سرہانے کونے میں ڈال دیے اور بستر پر دراز ہوتے ہوئے السٹریٹڈ ویکلی کا وہ شمارہ ہاتھ میں اٹھا لیا جو اس نے مغل سرائے کے اسٹیشن پر خریدا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے صفحے پلٹنے لگا۔ ہر صفحہ پر ایک آدھ منٹ نگاہیں ٹکاتا۔ اس کے بعد دوسرا صفحہ پلٹ دیتا۔ ایک صفحے پر اس کی نگاہیں دیر تک جمی رہ گئیں۔ اس کے چہرے پر خوشی، فخر، تعجب کئی قسم کے جذبوں کے رنگ جھلکنے لگے۔ یہ Matrimonial Page تھا۔ جس میں نئے شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں تھیں۔ بے پایاں مسرت کے تصور سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس نے پرچہ بند کر دیا اور کمبل کو گھٹنوں تک کھینچ لیا۔ "نسرین"! اس کے ذہن میں جگنو سے چمکنے لگے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ یونیورسٹی کمپاؤنڈ میں پہنچ کر جب اس نے ایک نوجوان سے انکوئری کا شعبہ معلوم کرنا چاہا تو نوجوان نے بنگلہ میں کہا "امی اونوتن، کائنڈلی اونو کاؤ کے ای جگیش کورون! (میں بھی نیا ہوں! براہ کرم کسی اور سے دریافت کریں) اتنے میں نزدیک کھڑی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی نے اس کی دقّت بھانپ لی۔ وہ فوراً مخاطب ہوئی۔ آپ کو انکوئری ڈیپارٹمنٹ چاہئے۔؟

"جی!" اس نے نگاہیں نیچی کر کے جواب دیا۔

میرے ساتھ آیئے۔ تھوڑی دور چل کر لڑکی نے انگلی کے اشارے سے بتایا۔ وہ دیکھئے۔ سامنے دروازہ دیکھ رہے ہیں نا بس وہی ہے انکوئری آفس! اور بالکل نزدیک پہنچ کر ہی اسے معلوم ہو سکا کہ وہ انکوئری نہیں باتھ روم تھا۔ واپس لوٹا تو اس لڑکی کے قہقہوں کی کھنک سنائی دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کانچ کے کئی برتن آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔

اس واقعہ کے ساتویں دن، وہ یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا ہوا ہاسٹل جانے کی سوچ رہا تھا کہ ایک سفید کار اس کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیو کرنے والی لڑکی کو اس نے آسانی سے پہچان لیا۔ یہ وہی پہلے دن والی لڑکی تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر گردن نکال کر پوچھا۔ "معاف کیجئے گا، کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟"

"جی شکریہ"! اس نے کچھ جھینپے اور کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں اب اپنی مدد آپ کرنے کا قائل ہو گیا ہوں!"

اس بے ساختہ طنز پر لڑکی ہنس دی۔ بولی "اس دن کے مذاق کا آپ بہت زیادہ برا مان گئے۔؟"

"مذاق!۔۔۔" اس نے جواب دیا۔ "مذاق تو بے تکلف دوستوں میں ہوتا ہے۔ یا پھر کچھ ایسے رشتے بھی ہوتے ہیں!"

لڑکی پھر ہنس دی۔ بولی "تو کیا آپ میرے دوست نہیں ہیں؟"

"میں تو آپ کو پہچانتا بھی نہیں"۔ اس نے کہا "اور پھر میں آپ کا دوست ہو بھی کیسے سکتا ہوں۔ میں لڑکی تو نہیں ہوں؟"

لڑکی اس کی سادہ لیکن دلچسپ گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھی۔ کیوں، کیا کسی لڑکی کا دوست کوئی لڑکا نہیں ہو سکتا ہے؟۔

"لڑکی کا دوست لڑکا!" وہ ہنس پڑا۔ "لڑکا لڑکی کا عاشق ہو سکتا ہے شوہر ہو سکتا ہے، بھائی ہو سکتا ہے یا پھر کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن لڑکا لڑکی کا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟"

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کہا، "آیئے

آپ کوآپ کے گھر تک چھوڑ دوں۔"

"شکریہ! رہنے دیجئے۔ مجھے ہاسٹل جانا ہے۔"

"آپ کس ہاسٹل میں ہیں؟"

"کارمائیکل میں!"

"گڈ! میرا راستہ وہی ہے۔ میں کیشب چندر سین اسٹریٹ جاؤں گی۔ آپ کو ہاسٹل کے گیٹ پر ڈراپ کردوں گی۔"

"نہیں، نہیں آپ کیوں تکلیف کریں گی۔"

"پلیز بی فرینگ! تکلف نہ کیجئے۔" اس نے درخواست کے لہجے میں کہا میں" آپ کو صحیح منزل تک پہنچادوں گی"۔ اس نے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ وہ کار کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھا تو لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔" آپ کی جگہ یہاں ہے پیچھے نہیں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی نوجوان لڑکی کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ پکڑ لینے اور اسٹیرنگ گھماتے ہوئے بار ہا کہنی اور کندھا چھو جانے سے اسے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لڑکی سے اتنی دیر تک گفتگو کی تھی تو یہ اس روز کے واقعہ کا ردعمل تھا۔ ورنہ اس بے باکی کے ساتھ کسی لڑکی کے ساتھ بحث کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

وہ گم سُم بیٹھا بغیر پلکیں چھپکائے، سامنے دیکھ رہا تھا۔ ٹریفک سگنل ملنے پر لڑکی نے کار مہاتما گاندھی روڈ پر موڑ دی۔" یہ آپ یکا یک چپ کیوں ہو گئے۔ کچھ بولیے"۔ لڑکی نے بے خیالی میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"جی میں۔۔۔ بات یہ ہے۔۔۔" وہ کچھ بھی نہ بول سکا۔ لڑکی اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوئی بولی۔

"آپ بے حد شرمیلے ہیں مسٹر سعید!"

اس نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ سکا کہ اسے اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا؟

"آپ کا نام مجھے حاضری رجسٹر سے مل گیا۔ آپ کا رول نمبر ۳۵ ہے نا؟"

سعید نے ایک بار پھر اسے گردن گھما کر دیکھا۔

"میں نسرین ہوں۔ آپ کی ہم جماعت!"

سعید اسی طرح خاموش رہا۔

"آپ ہیں تو بھولے بھالے۔ لیکن باتیں بہت دلچسپ کرتے ہیں"۔ سعید اب بھی کچھ نہ بولا۔ ذرا روٹین تو دیکھئے۔ کلاس کل کتنے بجے سے ہے؟

"ساڑھے بارہ سے!" سعید کو پہلی بار کچھ بولنے کی جرات ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل یونیورسٹی جاتے وقت آپ کو پک آپ کرلوں گی۔"

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ بوکھلا سا گیا۔

"آخر اس میں ہرج کی کیا بات ہے۔ گاڑی تو بہر حال میں لے کر جاؤں گی۔"

سعید کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔ نسرین نے کار بیٹھک خانہ روڈ کی طرف موڑ دی۔

"آپ کا روم نمبر کیا ہے؟"

"گیارہ۔۔۔!" دوسرے ہی منٹ اس نے ہاسٹل کے دروازے پر کار روک دی۔ سعید کو اتار کر اس نے ٹاٹا اور See you again کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔

سہسرام اسٹیشن پر کچھ دیر رکنے کے بعد گاڑی پھر اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔ سعید نے سگریٹ سلگائی اور حسب عادت لمبے لمبے کش لینے لگا۔

دوسرے دن نسرین ٹھیک بارہ بجے گاڑی لے کر آ گئی۔ ہاسٹل کے گیٹ پر وہ دیر تک ہارن بجاتی رہی۔ لیکن سعید نہیں آیا۔ تب اس نے ہاسٹل کے دربان کو بلا کر سعید کو اطلاع دینے کے لئے کہا۔ کچھ دیر بعد سعید تیار ہو کر آ گیا۔ وہ خود ہی دروازہ کھول کر نسرین کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے نسرین نے مسکرا کر پوچھا۔" آج آپ نے پیچھے بیٹھنے کی کوشش نہیں کی؟"

سعید پہلے شرما گیا۔ پھر ہنس کر بولا۔ "اب آپ پر کچھ کچھ بھروسہ ہو چلا ہے۔" اور اگر کسی دن میں آپ کے بھروسہ پر پوری نہ اتری تو؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو میں کار کا دروازہ کھول کر باہر کود جاؤں گا!" سعید نے جواب دیا۔ دونوں ہنسنے لگے اور پھر سعید کو لانا، لے جانا نسرین کا معمول بن گیا۔ اور ایک دن یونیورسٹی کینٹین میں چائے پیتے ہوئے نسرین نے کہا۔" سعید! تمہیں یاد ہے نا، اگلے ہفتہ میری سالگرہ ہے؟"

"یاد تو ہے۔ لیکن میں اس میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔"

"کیوں؟" نسرین چونک پڑی۔ شریک نہ ہونے کی وجہ؟

"تمہارے ڈیڈی اس پارٹی میں شہر کے معززین کو مدعو کریں گے۔ زرق برق ملبوسات کی اس محفل میں میرا معمولی کپڑوں میں شریک ہونا مناسب بات نہیں ہوگی۔ تم تو جانتی ہو، میرے پاس ڈھنگ کا کوئی سوٹ بھی نہیں ہے"۔ نسرین فکرمند ہوگئی۔

دوسرے دن شام کے وقت وکٹوریہ میموریل کے وسیع وعریض لان میں جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے نسرین نے کہا، سعید! میری ایک بات مانو گے۔

"کیا پوچھنا ضروری ہے؟"

"میں نے تمہارے لیے سوٹ کا کپڑا اپنی پسند سے خرید لیا ہے اور اسٹار اینڈ اسٹائل ٹیلرس میں دے آئی ہوں۔"

سعید ایک دم ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری تھی۔

"مجھے یقین ہے تم مجھے غلط نہیں سمجھو گے! نسرین کے لہجے میں

درخواست تھی۔"

" تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا نسرین! تم نے ایک بار مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پلیز سعید! میری خوشی اسی میں ہے۔تم برا مان کر میری خوشیوں کو غارت تو نہ کرو۔اس نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا سر سعید کے کندھے سے ٹکا دیا۔"

وکٹوریہ میموریل سے واپسی کے وقت اس نے ناپ دینے کے لیے کارکارخ اسٹرانیڈ اسٹائل ٹیلرس کی طرف موڑ دیا۔

اور پھر ایک دن فرپوز میں دی گئی ایک پارٹی میں ڈنر کے بعد جب رومان انگیز روشنیوں میں آرکسٹرا کی دھنیں کیف و مستی بکھیرنے لگیں، اور پاؤں تھرکنے لگے۔ ریشمیں بالوں سے خوشبو بکھرنے لگی۔ سانسوں کا توازن بگڑنے لگا۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک اڑنے لگی۔ اور خون دل کی سرخی آنکھوں میں امنڈ آئی تو نسرین نے مخمور نگاہوں سے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ڈیر! کیف و مستی کے ان لمحات پر ہمارا بھی تو حق ہے۔آؤ ہم اپنا حصہ لے لیں۔!"

"لیکن مجھے ڈانس جو نہیں آتا۔"

"میں بتا دوں گی آؤ"۔ وہ اسے کھینچ کر ڈانسنگ فلور پر لے گئی۔ نسرین نے اپنا دایاں ہاتھ سعید کے کندھے پر رکھا اور بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔تم تھوڑا قریب آجاؤ۔ذرا اور قریب۔بس۔۔۔اب تم دایاں ہاتھ میری کمر میں ڈال دو۔"اس طرح۔۔۔"

اور پھر بانہوں کا حلقہ بتدریج کم ہوتا گیا۔وہ سرور و کیف کی سبک رد لہروں پر رواں ہولے ہولے بہت دور چلا گیا۔فرسودہ اور بے جان ماحول سے دور، اپنے گھر کی بے کیفی اور بے رونقی سے دور۔ان سویلائز ڈ عزیزوں اور رشتہ داروں سے دور۔رشیدہ کا وجود اسے کمہار کے بنائے ہوئے بے روح کھلونے کی طرح معلوم ہونے لگا۔جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی، کوئی حرارت نہ تھی۔وہ بے خبری کے طلسم میں کھو گیا۔اسے نیند آ گئی۔آنکھ کھلی تو طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شبنم میں نہائی ہوئی کرنیں کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانک رہی تھیں۔

گاڑی بار بار پٹری بدل رہی تھی۔ہوڑہ اسٹیشن کا یارڈ شروع ہو چکا تھا وہ ٹوتھ برش اور تولیہ لے کر ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہاسٹل پہنچ کر اس نے غسل کیا، کپڑے بدلے، اس کے بعد یونیورسٹی چلا گیا۔نسرین کلاس روم سے ملحق سیڑھی کے پاس چپ چاپ اور اداس اداس سی کھڑی تھی۔سعید کو آتے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔سعید نے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔"بہت زیادہ خفا نظر آتی ہو۔تمہارے منانے کے لئے ندی نارے جاؤں یا پیاں پڑوں؟"

نسرین بمشکل ہنسی ضبط کر سکی۔مصنوعی غصہ سے بولی I don't talk you " تم چار دنوں سے کہاں غائب تھے؟"

"اپنے قید و بند سے بھرپور ماضی کو الوادع کہنے گیا تھا"۔سعید نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔پھر بولا۔ابھی تو کلاس شروع ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں، تب تک کیوں نہ ہم کافی پی لیں۔"

وہ کالج اسٹریٹ کراس کر کے نسرین کو پریسیڈنسی کالج کے پاس کیفے میں لے گیا۔بیرے کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد نسرین سے مخاطب ہوا۔

"سنڈے کی شام کو تم سے رخصت ہو کر ہاسٹل پہنچا تو چچا کو اپنا منتظر پایا۔ان کے ہاتھ میں ٹرین کے دو ریزروشدہ ٹکٹ تھے دراصل چچی کی طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی تھی۔مجھے اسی رات چچا کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہونا پڑا۔یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میں تمہیں فون پر بتا بھی نہ سکا۔بیرے نے کافی لا کر میز پر رکھ دی۔" گھر پہنچ کر میں نے چچی کو اچھی بھلی پایا۔"

" کیا۔۔۔؟ کیا وہ بیمار نہیں تھیں۔؟ "نسرین چونک اٹھی۔

"نہیں !سعید نے کہا "سیریس حالت کی خبر دے کر مجھے فوراً بلوانا مقصود تھا۔انہیں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ میں اب ہاتھ سے بے ہاتھ ہوا جا رہا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا۔؟"نسرین نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

اس کے بعد ہمیشہ کی طرح مجھے بتایا گیا کہ میری والدہ نے زندگی کے آخری لمحوں میں خواہش کی تھی کہ بڑا ہونے پر چچا کی لڑکی رشیدہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔اگر والدہ نے ایسا کہا بھی تھا تو میں ان کے آخری الفاظ کی لاج رکھنے کے لیے اپنی زندگی تو برباد نہیں کر سکتا۔نسرین! میری راہیں جدا ہیں، میری منزل الگ ہے۔رشیدہ میرے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی۔اس کا میرے ساتھ کوئی میل ہی نہیں۔"نسرین مسکرا رہی تھی۔"میں نے چچا اور چچی سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا رشیدہ کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا اور اگر آپ لوگ اس رشتے کے لیے بضد ہیں تو سمجھ لیجئے میرا اور آپ کا ناتہ ٹوٹ چکا۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد میں تمہارے پاس چلا آیا۔"

"اور اب کیا خیال ہے۔"

نسرین کے اس سوال پر سعید کے چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی۔کتنی ہی پر کیف اور رنگین شاموں کا سرور اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔اس نے نسرین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ڈارلنگ! تم ابھی خواب و خیال کی باتیں کر رہی ہو اور میں تمہیں اپنی منزل بنا چکا ہوں۔یہ ہاتھ۔۔،اس نے نسرین کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔"یہ، ملائم اور خوبصورت ہاتھ میں ہمیشہ کے لیے اپنے۔۔۔"

"فول۔۔۔ "نسرین نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔"میری میرج تو بہت پہلے طے ہو چکی ہے۔میرے وڈبی کے ساتھ، جو ہائر اسٹڈی کے لیے لندن گیا ہوا ہے۔تم سے تو میری دوستی ہے۔فرینڈ شپ، اینڈ تھنگ الس !!"

واپسی

قمر جمالی
(حیدرآباد، دکن)

شام کے سائے آہستہ آہستہ سنہری زمین پر اداسی پھیلا رہے تھے یکا یک۔۔۔

بادل اُمنڈ آئے اور ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ ہواؤں کے مزاج میں وجد کی کیفیت پیدا ہوئی اور سائیں سائیں کی چنگھاڑ نے سارے عالم کو بہرہ کر دیا۔ گرج کی توپوں نے بادلوں کا سینہ چاک کر دیا۔

پھر۔۔۔

جو آنسوؤں کی قطار ٹوٹ کر بہہ نکلی تو زمین لت پت ہوگئی۔

زمین کا بھی کیا مقدر۔۔۔!

محض ایک تماشائی۔

سورج کا غصہ آیا۔۔۔ پسینہ پسینہ ہوگئی۔

ہواؤں کو وجد آیا۔۔۔ اپنے سینے میں پیوست جڑوں کو تک گھبرا کے چھوڑ دیا۔ اور۔۔۔ جو بادلوں نے پھٹکار کی۔۔۔ اتنا سلسلا گئی کہ خود اپنی ہی ذات سے کراہیت محسوس ہوئی۔

اور۔۔۔

جو کبھی اپنے اندر کا غبار سنبھال نہ سکی۔۔۔ تمازت اور حدّت اتنی بڑھی کہ جگہ جگہ سے تڑخ گئی۔ اپنے ہی سینے میں دراڑیں ڈال لیں۔ قیامت برپا ہوگئی۔

بھاگو۔۔۔ دوڑو۔۔۔

وہ گھن گرج کہ آسمان بھی تکتا رہ گیا۔ واللہ جسے بے زبان سمجھا، دبایا، تپایا اور خوفناک جھکڑوں سے پرت در پرت بے لباس کیا، آج وہ خود غضبناک ہے تو قیامت بھی کیا اتنی قیامت خیز رہی ہوگی۔۔۔!

ہر طرف شور، ماتم، واویلا، چیخ و پکار۔

خون، بھگدڑ، زلزلہ۔۔۔ لاوا۔۔۔ آتش فشاں۔

مگر۔۔۔ اس کا انت، ختم۔۔۔ کچھ تو ہو۔۔۔!!

نہیں تو۔۔۔؟؟

آسمان کے ستم سہنے کے لیے کوئی بچے گا نہیں۔

''کوئی ہے۔۔۔؟ ارے کوئی ہے جو اسے قابو میں لا سکے۔ اس کی طنابیں کھینچ سکے۔''

''بھاگو۔۔۔ زمین کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں۔''

''مگر۔۔۔ کیسے بھاگوں۔۔۔؟''

''کیوں۔۔۔ تمہارے پاؤں ساتھ نہیں دیتے کیا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ وہ بات نہیں۔ یہ دیکھو۔''

''افوہ۔۔۔! مگر یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ تم سمجھو۔''

''کوئی ہے۔۔۔ ارے کوئی ہے؟؟ یہ گھن گرج۔۔۔ یہ دہشت۔۔۔! کیا یہی وہ ''صحیحہ واحدہ'' ہے۔۔۔؟''

کتنا خون بہا۔ کتنے گھر ڈھے گئے اور۔۔۔ کتنوں کو زمین نگل گئی۔! جگہ جگہ شگاف، دراڑیں، خون کے دھبے، لاشیں، سالم، آدھی۔ پاؤں۔۔۔ کوئی آدھا باہر، کوئی پاؤں کسی سر کا نہیں صرف بال باہر رہ گئے۔ سالم نگل گئی زمین۔

''ارے کوئی ہے۔۔۔؟ میری مدد کرو۔''

افوہ۔۔۔! اتنا خون۔۔۔! بنی نوع انسان کا خون۔۔۔!!

نہیں۔ طیش میں بھی خرد کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر اس سے ہو گا بھی کیا! مزید گندگی۔۔۔ آلودگی۔

انسان زندہ بھی کچرا۔۔۔ مر کر بھی کچرا۔

پھر اسی میں تو سمائے گا۔ یہ گندگی، یہ سڑاند پھر زمین کے سینے میں ہی تو دفن ہوں گے۔ نہیں اب اسے روکنا چاہیے۔ توبہ! کیا آہ و بکاہ۔۔۔! کیا فریادیں۔۔۔!!

''ارے کوئی ہے۔۔۔؟ اس طوفان کو تھامو۔۔۔''

ہاں ہے۔۔۔ ایک کردار۔۔۔ سناتن۔ وہی اس طوفان کو روک سکتا ہے۔ ابھی بلاتی ہوں۔

''سناتن۔۔۔ او سناتن۔۔۔!''

''نگوڑی! جنم جلی! آخر پھر بیٹھ گئی تو اپنا قلم لے کر۔ کہانی لکھے بغیر تجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا کیا۔۔۔؟ کب سے چلا رہی ہوں۔۔۔! سنائی نہیں دیتا کیا؟ بڑی چلی کہانی کار بننے۔ پہلے ایک بھلی ماں تو بن لے۔

''نا ہنجار۔۔۔! چیخ چیخ کر میرا حلق سوکھ گیا۔ ننھے کو شدید بخار چڑھ گیا ہے''

''ننھے کو بخار چڑھ گیا ہے۔۔۔؟ کہاں ہے ننھا؟''

''بند کر یہ ٹسوے بہانے۔ جیسے تو جانتی نہیں کہ اس وقت تک اسکول سے آچکا ہوتا ہے۔''

ایک بار پھر۔۔۔

زمین کے اندر لاوا پگھلنے لگا۔ گھن گرج کے آثار پیدا ہوئے۔ آسمان میں نہیں۔ زمین میں، ساتوں طبق دہل گئے۔

پھر دراڑیں پڑنے کو ہیں۔

طوفان کی آمد ہے۔

زلزلہ آنے کو ہے۔

خوف۔۔۔ دہشت۔۔۔ اضطراب۔ دل کی زمین پرت در پرت اکھڑنے کو ہے۔ اس نے دل کی نہیں سنی۔ خرد کا دامن تھام لیا۔

اور۔۔۔

قلم نیچے رکھ دیا۔

دن، ہفتے، مہینے۔۔۔فنکار اندر ہی اندر مرتا رہا، تڑپتا رہا۔تخلیق کی اینچ اٹھا اٹھ کر سانسوں میں اٹکتی رہی۔

حلق میں پھانس۔۔۔سانسوں میں گھٹن۔۔۔سینے میں درد۔۔۔

وجود کا کرب۔۔۔مگر کب تک۔۔۔آخر کب تک۔۔۔؟!!

پھر ایک دن۔۔۔

اس نے پھر سے قلم اٹھالیا۔

کہاں چھوڑا تھا کہانی کو۔۔۔؟

کہاں رکھ دیا تھا قلم۔۔۔؟؟

ہاں۔۔۔زلزلہ تھا، زمین کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔اطراف میں خون تھا، لاشیں تھیں۔

اتنی دیر میں تو سب کچھ سڑ گیا ہوگا۔فضا متعفن ہوگئی ہوگی۔زمین رہنے کے قابل کہاں رہی ہوگی۔۔۔!

''ارے کوئی ہے۔۔۔؟میری مدد کرو۔۔۔''

افوہ۔۔۔! اب تک وہ بائی وہیں، اُس ٹکڑ پر زمین کی دراڑ میں ٹانگ پھنسائے بیٹھی ہے۔۔۔! کمال ہے۔۔۔! مر نہیں گئی۔۔۔!!

''ارے کوئی سنو۔۔۔میری مدد کرو۔۔۔''

''ہاں ہاں ہے۔ایک کردار ہے سناتن۔بلایا تو تھا اسے وہ آ بھی گیا تھا۔ میں تمہاری مدد کر دیتی بائی! میں نے بلایا تھا سناتن کو۔یہیں کھڑا تھا وہ تمہارے پاس۔اُس نے تمہیں نکالا کیوں نہیں۔۔۔؟!

ہاں۔۔۔یہ بھی سچ ہے۔وہ تمہیں کیسے نکالتا۔میں نے ہی قلم کو جنبش نہیں دی نا۔۔۔رکھ دیا تھا قلم۔میری ساس آ گئی تھیں۔اللہ واسطے کا بیر ہے انہیں میری تخلیقات سے۔ٹھہرو۔ابھی بلاتی ہوں ڈرو نہیں۔میں نے پھر سے قلم تھام لیا ہے۔ابھی بلاتی ہوں۔''

''سناتن۔۔۔او سناتن۔۔۔!''

صبح سے شام ہوئی۔

دن، ہفتے، مہینے۔۔۔

کہاں کہاں ڈھونڈا اسے۔۔۔کتنی آوازیں دیں۔گھر سے بے گھر ہوگئی۔خود زخمی، بدحواس۔

''بھائی صاحب! آپ نے دیکھا ہے اُسے؟''

''کسے۔۔۔؟''

''سناتن کو۔۔۔''

''سناتن۔۔۔کون سناتن؟''

''میرا کردار۔۔۔میری کہانی کا ہیرو۔''

''ہنہ! پاگل لگتی ہے۔''

''پاگل۔۔۔میں؟ میں پاگل۔۔۔! ٹھہرو بتاتی ہوں۔''

''مگر۔۔۔وہ تو جا چکا۔اب کہاں ڈھونڈوں؟''

رات بھیگ چکی۔

بازار خاموش

سڑکیں تماشائی

اب وہ تھی تنہا راہرو۔

''شاید یہاں ہو۔'' وہ خود سے گویا ہوئی۔

نان بائی کے بجھتے تندور کی چنگاریوں کو دیکھ کر وہ وہاں پہنچی۔ چبوترے پر سرتاپا میلی گدڑی تانے کوئی سو رہا تھا۔وہ اُس مرد کو جھنجھوڑنے لگی۔

''بھائی صاحب! بھا۔۔۔بھ۔۔۔بھوت!!''

''بھوت۔۔۔میں تمہیں بھوت لگتا ہوں؟''

پھر کیا ہو تم؟ چہرے پر ناک غائب، کان جھڑا ہوا، آنکھیں ابلی ہوئیں لال لال۔کیا ایسا ہوتا ہے انسان۔۔۔؟!

''ہاں۔۔۔میں شاید انسان بھی نہیں ہوں بہن۔۔۔!''

''بہن۔۔۔تم نے مجھے بہن کہا۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔اگرچہ میں نہ تو انسان رہا اور نہ بھوت بن سکا۔''

''تم بھوت بننا چاہتے ہو۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔بھوت بننے کے اپنے فائدے ہیں۔پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل جو جی میں آیا کرو۔''

''ارے ہاں۔۔۔تم نے خوب کہی مگر۔۔۔کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

''کسے۔۔۔؟''

''سناتن کو۔''

''سناتن۔۔۔کون سناتن؟''

''وہی۔۔۔میرا کردار۔میری کہانی کا ہیرو۔۔۔دیکھو نا زمین سڑ گئی ہے۔زندگی سرد پڑ گئی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

ہاں۔۔۔تم نہیں سمجھو گے۔جہاں سے میرا سناتن غائب ہوا تھا وہاں ایک قیامت خیز آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ہر طرف خون تھا۔لاشیں تھیں، گری ہوئی عمارتوں کے ملبے تھے۔زمین کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔انہیں کھینچنا ہے، ملبوں کو ہٹانا ہے۔ورنہ یہ زمین اپنے لائق کہاں رہے گی! اور سنا تم نے وہ بائی ابھی تک آدھی زمین میں دھنسی بیٹھی ہے۔زمین کی دراڑ میں اس کی ٹانگ پھنس گئی ہے۔اسے باہر نکالنا ہے۔یہ سب تو ایک ہیرو ہی کر سکتا ہے نا؟ سناتن۔۔۔ میری کہانی کا کردار۔

توبہ! یہ تو خراٹے بھر رہا ہے۔کب کا سو گیا۔۔۔اب کیا کیا

جائے۔۔۔!!

کیوں نہ کہانی کو فنطاسیہ میں داخل کیا جائے۔۔۔!یعنی فینٹسی۔۔۔ جہاں سب کچھ ممکن ہے۔کردار تخیل کی پرواز پر آسمانوں میں اڑسکتا ہے۔''زوں'' کے ساتھ قاری کو اپنے پروں پر لادے دور جہانوں کی سیر کرواسکتا ہے۔

ہاں۔۔۔یہ ٹھیک ہے۔

کیوں نہ اس کوڑھی کو ہی ہیرو بنا دیا جائے۔اچھا لگے گا۔آدھا انسان آدھا بھوت۔چہرے کے نام پر صرف چہرے، آوٹ لائن۔ناک ندارد، آدھا کان غائب، آنکھیں ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی جیسے وجود کا سارا کرب آنکھوں نے سمولیا ہو۔چاہو تو اس کے پر بھی لگا دو۔کوئی مافوق الفطرت شے لگے گا۔

مگر نہیں۔۔۔

اس کی انگلیاں تک جھڑ گئی ہیں۔یہ زمین کا بوجھ نہیں سہار سکے گا۔

میری کہانی کو تو سناتن کی ضرورت ہے جو قدیم سے چلا آ رہا ہے۔

جس کا سن بھی پکا۔۔۔تن بھی پکا۔

نہیں نہیں۔۔۔فنطاسیہ میں تو کہانی گم ہو جائے گی۔پھر اسے ڈھونڈتے قرن لگے جائیں گے۔کہانی کو کرداروں کے بیچ ہی رہنا چاہیے ورنہ تو صرف اساطیر تخلیق ہوں گے اور اساطیر کبھی کبھی قاری کو بھٹکا دیتے ہیں۔میں تو چاہتی ہوں کہ میرا قاری، کردار کی انگلی پکڑ کر چلتا رہے اور اس کے نقشِ قدم ایک جال سا بنتے رہیں جس میں قاری بھٹک کر بھی گمراہ نہ ہو۔وہ گھومتی رہی۔۔۔ ڈھونڈتی رہی۔

گلی۔۔۔کوچے۔۔۔محلے۔۔۔مگر۔۔۔وہ نہ ملا۔

''تُو۔۔۔تُو یہاں بیٹھی ہے۔۔۔! کاش تیری جگہ تیری موت کی اطلاع ملی ہوتی۔۔۔! جانے کون منحوس گھڑی میرے بیٹے نے تجھ سے بیاہ کیا تھا۔۔۔!مفت خور کہیں کی۔۔۔!!بتا کیا کر رہی تھی یہاں؟''

''اماں!وہ سناتن۔اسی کو ڈھونڈتے یہاں تک پہنچ گئی۔''

''کون سناتن؟''

''تم سناتن کو نہیں جانتیں؟ہاں۔۔۔اسے کون نہیں جانتا۔تب ہی تو میں چاہتی ہوں کہ اسے سارے عالم میں پیش کروں۔''

''تیری آنکھ کا پانی مر گیا ہے۔کتنے دھڑلے سے غیر مرد کا نام لیتی ہے؟!''

''اماں!وہ غیر کہاں ہے!''

''پھر کون ہے؟''

''میرا اپنا ہے۔میرے وجود کا حصہ۔میری اپنی تخلیق۔''

''اب اس تخلیق کا کیا کرے گی۔۔۔؟''

''کون۔۔۔؟''

''یہ میرا جنا۔۔۔''

''ماں۔۔۔میں۔۔۔''

''تُو۔۔۔تُو سناتن۔۔۔!''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔زمین کی دراڑیں بھر گئی تھیں اور۔۔۔وہ بائی۔۔۔؟اوپر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

- بقیہ -

ماربا

اور پھر سفید ساری میں ملبوس وجود، گلابی رنگ کے شلوار قمیص پہنے کسم کے وجود میں بدل گیا۔''جلال مجھ میں اور کسم میں کوئی فرق نہیں ہم دونوں ایک ہیں۔کسم جو ماربا بھی ہے اور ماربا جو کسم بھی ہے۔۔تمہاری، بچوں کی، ماں باپ اور ساس سسر کی خدمت کی حسرت لے کر میں اس دنیا سے چلی گئی تھی۔میری یہ حسرت اس قدر شدید اور سچی تھی کہ کسم کے وجود میں گھل مل کر ایک ہو کر لوٹ آئی ہوں۔'' الفاظ کے جلال کی سماعت میں داخل ہونے کے فوراً بعد نیند نے اس پر غلبہ پالیا اور وہ سو گیا۔اچانک اس کی آنکھ کھلی، وہ جنوری کی سردی کے باوجود پسینے سے شرابور تھا، اس نے گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے یہ وہی وقت تھا جب ماربا کی روح اسکے بدن سے جدا ہوئی تھی۔فجر کی اذان کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''آؤ نماز کی جانب''۔۔۔''آؤ فلاح کی جانب''

جلال نے بستر چھوڑ دیا۔چوکیدار سے گیٹ بند کروا کے وہ قریبی مسجد کی طرف دوڑ پڑا۔مسجد سے واپسی پر اس نے ایک بار پھر ماربا کو دیکھا جو پلک جھپکنے میں کسم بن گئی اور پھر فضا میں تحلیل ہوگئی۔

گیٹ سے جلال سیدھا میڈیٹیشن روم کے اندر چلا گیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں اس کی امی اور دوسرے کونے میں ابوذکرِ ربی میں مصروف تھے۔جلال خاموشی سے امی کی چوکی کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

''کیا بات ہے جلال! کچھ کہنا ہے۔؟''

''جی امی جان۔''

''اچھا تو پھر کہو۔''

''امی۔۔آپ کسم والوں سے بات کرلیں۔۔۔یہی کہنا ہے۔''

یہ سن کر جلال کی والدہ سجدے میں گر گئیں۔سجدے سے سر اٹھا کر انہوں نے جلال کو لپٹا لیا۔

سب لوگ حیران تھے کہ جلال اچانک شادی کے لئے کیسے تیار ہو گیا۔اور خوش بھی تھے کہ جلال کی سونی زندگی میں ایک مرتبہ پھر خوشیوں کا ڈیرا ہوگا۔

ہریا کی حیرانیاں

ڈاکٹر ذاکر فیضی
(دہلی)

مداری سڑک کے کنارے مناسب مقام دیکھ کر تماشے کی تیاری کر رہا تھا۔ جمورا اس کی مدد میں لگا تھا۔ مداری نے ایک پوٹلی کھولی، اس میں سے کالی چادر نکال کر زمین پر بچھادی۔ پھر وہ پوٹلی سے دوسرا سامان نکال کر جمورے کو دینے لگا۔ جمورا استاد کے بتائے مقام پر اس کو رکھتا جا رہا تھا۔ بڑے دانوں کی رنگ برنگی مالائیں، ٹیڑی میڑی عجیب سی دکھنے والی لکڑی، پلاسٹک سے بنی انسانی کھوپڑی، کالا کانسہ، المونیم کی بدرنگ سی پلیٹ اور ہاتھ سے بُنی گئیں دو ٹوکریاں۔

تماشے کی تیاری مکمّل ہو چکی تھی۔ مداری نے اپنا سب سے اہم اوزار ڈگڈگی نکالا اور شروع ہو گیا۔

''ڈگڈگ ڈگڈگ۔۔۔ڈگ ڈوگ ۔۔۔'' ڈگڈی کی آواز کے ساتھ ہی مداری کی زبان سے رٹے ہوئے جملے اپنے مخصوص انداز میں نکلنے لگے۔

''دکھائے گا۔۔۔دکھائے گا۔ یہ جمورا طرح طرح کے کرتب دکھائے گا۔

'' ڈگ ڈگڈگ۔۔۔ڈگ۔۔۔'' ڈگڈگی بجاتے ہوئے مداری نے جمورے کو اپنے سامنے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔

'' صاحبان۔۔۔آپ ہیں قدردان اور مہربان۔۔۔آیئے آیئے جمورے کا تماشہ دیکھتے جایئے۔۔۔یہ جمورا کتّا بنے گا، گدھا بنے گا۔۔اور شاہ رخ خان بنے گا۔۔۔اور حضور آپ جو کہیں گے، یہ وہ بنے گا۔۔۔آیئے، آج اس البیلے جمورے کا تماشہ دیکھتے جایئے۔۔۔ایسا تماشہ جو آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔۔۔ڈگڈگ۔۔۔ڈگ ڈگ۔۔۔''

ڈگڈگی کی تیز آواز اور مداری کے لہجے کا اثر ہوا، قریب کھیل رہے چند بچّے مداری اور جمورے کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔

''ڈگ ڈگ ڈگڈگ۔۔۔'' مداری جمورے سے مخاطب ہوا۔۔۔'' بول جمورے! آج کیا تماشہ دکھائے گا۔''

''جو آپ کہو گے استاد'' جمورے نے اپنی ترنگ پکڑ لی تھی۔ اس نے استاد لفظ ہونٹوں کو خم دے کر زور سے کہا۔

مداری نے غور کیا مجمع جمنے لگا ہے۔۔۔ایک ایک دو دو کر کے لوگ تماشے میں اُگنے لگے ہیں۔ آس پاس کے آوارہ نوجوان، چائے خانوں میں بیٹھے گپ لڑاتے لوگ، راہ چلتے مسافر تماشے کا حصّہ بنتے جا رہے تھے۔

''بول جمورے بندر بنے گا۔۔۔''

''بنوں گا استاد۔۔۔'' جمورا مشینی انداز میں دہرایا۔

''کتّا بنے گا۔۔۔؟'' مداری نے بڑھتی پبلک کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ضرور بنوں گا استاد۔۔۔'' جمورے نے کتّے کی طرح آواز نکالی۔ اپنے جسم کو کتّے میں ڈھال کر اپنی دم ہلانے لگا اور زبان باہر لٹکا دی۔

'' دیکھا آپ نے صاحبان، مہربان، قدردان۔۔۔آپ کا یہ جمورا ابھی بنا کتّو کا پہلوان'' مداری مجمع کو باندھے ہوئے تھا۔

'' اچھا یہ بتا۔۔۔ڈگڈگ ڈگ۔۔۔'' مداری نے بڑے حکیمانہ انداز میں دریافت کیا۔ ''تو اور کیا کیا بن سکتا ہے۔''

''حکم کرو استاد۔۔۔جو کہو گے، وہی بنوں گا استاد۔۔۔'' جمورے نے پہلوان کی طرح ٹہلتے ہوئے کہا۔۔۔پبلک ہنسنے لگی۔

''گدھا بنے گا۔'' مداری چیخا۔

''جی بنوں گا استاد۔''

''مرغا بنے گا۔''

''جی بنوں گا استاد۔''

''پاگل بنے گا۔''

''جی ضرور بنوں گا ستاذ'' جمورا پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگا۔ پبلک تالیاں بجانے لگی۔

مداری خوش تھا۔ تماشہ صحیح جا رہا تھا۔ وہ بولا۔

''صاحبان، مہربان، قدردان۔ اگلا آئٹم ہے آج کے تماشے کی شان۔''

مداری نے جمورے کو زمین پر لٹا کر اس پر چادر ڈال کر چہرہ ڈھک دیا۔ پھر ایک چاقو سے، جمورے کی گردن دھڑ سے الگ کر دی۔ پبلک حیرت و تعجب سے تالیاں بجانے لگی۔

مداری آگے بولا۔۔۔''قدردانوں! پاپی پیٹ کا ہے سوال
جموے کی زندگی، ہے ایک جنجال''

مداری نے ڈگڈگی کو تیزی سے بجا کر چھوڑ دیا۔

''مہربان لوگوں اور بچّے پارٹی اب زور سے بجاؤ تالی جمورے کی مر گئی ہے سالی اب یہ گائے گا قوّالی۔''

مداری نے تالی، سالی اور قوّالی الفاظ کو لمبا کھینچا۔ جمورے نے لہک لہک کر، ٹھمک ٹھمک کر قوّالی سنائی۔

پبلک نے سکّے اچھالے۔ تماشہ تمام ہوا۔

مداری نے سکّے سمیٹ لئے۔۔۔جمورا تماشے کا سامان سمیٹنے لگا۔

مداری اپنے گھر چلا گیا۔۔۔جمورا بھی اپنا حصّہ لے کر اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

جمورے کا نام ہریا تھا، اس کا تعلق دور دراز کے کسی گاؤں سے تھا۔ چھ سال قبل وہ اس مہانگر میں روزی روٹی کی تلاش میں آیا۔ جب اس نے اس شہر

''چہارسُو''

میں قدم رکھا، اس کے ہمراہ چھ سال کی بیٹی چُنیا، تین سالہ بیٹا بالو اور بیوی چمکی تھی۔ وہ اپنے پریوار کے ساتھ مہینوں ریلوے اسٹیشن، بس اڈّوں، میٹرو پل کے نیچے پڑا رہا۔ جو کام بھی ملتا تھا، کر لیتا تھا۔ اینٹ گارا ڈھونا، چائے کے ہوٹل پر برتن دھونا۔ جیسے کاموں پر اس کا گھر چل رہا تھا۔

چار سال ہوئے چائے کی ڈھبری پر اس کی ملاقات مداری سے ہوئی۔ مداری کو ایک جمورے کی تلاش تھی۔ ہریا کام کی تلاش میں تھا۔ مداری نے ہریا میں کچھ ایسا دیکھا کہ اس نے ہریا کو جمورا بننے کی تجویز رکھی، جسے ہریا نے بنا سوچے سمجھے قبول کر لیا۔ مداری نے ہریا کو جمورے کا کام سکھایا۔ ہریا کو جمورا بن کر لوگوں کو ہنسانا برا نہیں لگتا تھا۔ چند روپئے مل ہی جاتے تھے۔ اسے تکلیف تھی تو یہ کہ سب اسے جمورا ہی کہنے لگے تھے۔ جتنے لوگ بھی اسے جانتے تھے سب کے لئے وہ جمورا ہو گیا تھا۔ تماشے کے دوران بھی مداری کے علاوہ جب کوئی اسے آواز لگاتا 'اوئے جمورے ذرا ٹھمکا تو لگا' اسے بہت ذلّت کا احساس ہوتا تھا۔

ہریا اکثر حیران و پریشان رہتا تھا۔ جہاں ہریا جمورا بن کر اپنے کرتبوں کی وجہ سے پبلک کو حیرت زدہ کر دیتا تھا، وہیں وہ وقت بے وقت خود بھی حیران ہو جاتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ:

یہ 'اے سی سی' کیا ہوتا ہے۔

'این آر سی' کسے کہتے ہیں۔

یہ ٹکڑے ٹکڑے گینگ کیا ہوتا ہے۔

اتنے بڑے بڑے عالیشان بنگلوں میں کون رہتا ہے؟

اتنی اونچی اونچی عمارتیں کیسے بن جاتی ہیں؟

اتنی بڑی گاڑیاں کہاں سے آتی ہیں؟

لوگوں کے پاس اتنا پیسے کیسے آجاتا ہے؟

پیسے والوں کے بچّے اتنے گورے، گلابی اور خوب صورت کیسے ہوتے ہیں؟

ہریا گاڑیوں میں اور راہ چلتی حسین، اسمارٹ لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھتا تو اس کے دل میں خیال گزرتا، اس کی بیوی چمکی ایسی کیوں نہیں ہے۔ ان سولات کی تلاش میں کبھی کبھی وہ راہ چلتے رک جاتا تھا اور کھو جاتا تھا۔ راہ چلتے لوگوں کو گھورنے لگتا تھا۔

جہاں کہیں چند لوگ اسے گفتگو کرتے نظر آتے، وہ چپکے چپکے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا تھا۔

کچھ دن پہلے اس کی چمکی سے لڑائی ہو گئی تھی۔ ٹریفک سگنل پر جام لگا ہوا تھا۔ وہ دونوں بچّوں اور چمکی کے ساتھ ٹریفک کی وجہ سے رکے ہوئے لوگوں کو کھلونے، پلاسٹک کے پھول وغیرہ بیچ رہے تھے۔ کار میں بیٹھے ایک صاحب کے جوتوں کو دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ صاحب کے بال اور کالے جوتے چمک رہے تھے۔ ہریا کے پاس جوتے نہیں تھے۔ اس نے بے خیالی میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے بال آپس میں چپکے ہوئے، بری طرح چکٹ رہے تھے۔ ہریا کھو گیا۔ اسے ہوش تب آیا جب صاحب کی برابر میں بیٹھی میم صاحب نے اسے چور اچکّا جان کر ڈانٹ کر بھگایا۔ چمکی نے اس بات کو دیکھ لیا تھا۔

رات کو کھانا بنانے سے پہلے چمکی ہریا پر بجلی کی طرح کڑک پڑی۔۔۔ ''کا ہے، گاڑی میں بیٹھی میم ساب کو گھورے جا رے تھے؟''

''چمکی، کتنے مزے ہیں ان ساب لوگ کے۔'' ایسا لگتا تھا جیسے ہریا ابھی تک وہیں تھا۔۔۔ ''چمکے چمکے جوتے، کھلے کھلے بال، ساپ ستھرے کپڑوں میں کام پر جانا اور کرسی پر بیٹھ کر ٹھنڈے کمرے میں کاگج ادھر ادھر کرتے رہنا۔'' ہریا نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔

''اُوہو۔۔۔'' چمکی نے چڑ کر کہا۔۔۔ ''بڑے آئے ساب لوگ کے بارے میں سوچنے والے۔۔۔ استاد تو بن نہیں سکت، ساب بنیں گے۔''

''تو جیادا بک بک نہ کیا کر چمکی۔۔۔ کہاں کی بات کہاں لے جات ہے۔'' چمکی نے ہریا کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے غصّے کو قابو میں کرتے ہوئے دھوتی کی انٹی میں سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ بیڑی جلائی اور اپنی جھنجھلاہٹ کو بیڑی کے دھوئیں میں اڑانے لگا۔

''کیا بک بک کر رئی ہوں میں۔۔۔'' چمکی بھڑک اٹھی۔۔۔ ''کب سے کہوں استاد سے کہہ، پیسے بڑھائے، ہمرا گزر نہ ہوئے اس میں۔۔۔ کتنی مہنگائی۔۔۔''

''چمکی اب میں تجھے کیا سمجھاؤں۔۔۔'' ہریا نرم پڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بچّے اور چمکی سگنل پر کھلونے اور پھول نہ بیچیں تو گزارا مشکل ہو جائے۔۔۔ ''کیا کہوں میں تجھ سے۔۔۔ ان تھوڑے سکّوں کے لئے کتنا جلیل ہونا پڑتا ہے۔۔۔ تو کیا جانے کتّا، گدھا اور جنانہ تک بننا پڑتا ہے۔'' وہ اپنی چمکی کے سامنے شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی بیڑی کے تین چار کش لگائے۔

''تو۔۔۔ کیا۔۔۔ میں بھی تو بچّوں کے سہارے آگ اگلتے سورج کے نیچے اور جلتی دھرتی کے اوپر بھکاریوں کی طرح گڑگڑا کر کھلونے بیچتی ہوں۔'' چمکی نے نفرت سے تھوک گٹکا۔۔۔ ''حرام کے جنے، کچھ تو ایسے بھگاتے ہیں جیسن ہم نالی کے کیڑے ہوں۔۔۔ اور جو خریدے ہیں، ایسے احسان دکھائیں جیسے بھیک تو دے رئیں۔۔۔ اور کچھ لوگن ۔۔۔ حرامی۔۔۔ پلّے۔۔۔'' چمکی رونے لگی۔

ماں کی آواز سن کر باہر کھیل رہے دونوں بچّے جھونپڑی میں آ گئے۔ اور ماں باپ کو تکنے لگے۔

''اب بتا۔۔۔ میں بھی کیا کروں؟'' ہریا چمکی کے قریب آ گیا۔۔۔ ''میں برابر تو محنت کر رہا ہوں نا۔''

''تجھ سے کتنی بار بول چکی کہ تو بھی استاد بن۔۔۔'' چمکی نے خود پر قابو پا لیا تھا۔۔۔ ''اپنا تماشہ لگانا شروع کر دے۔ کسی چھورے کو گاؤں سے لے آ

اور جمورا بنالے۔۔۔اور نہ ملے تو مجھے ہی اپنی جموری بنالے۔۔۔'' چمکی کے پسینے سے نہائے کالے چہرے پر پیلے پیلے دانت چمکے۔

''مجھے ہی جموری بنالے۔۔۔'' ہریا نے منہ چڑاتے ہوئے چمکی کی نقل اتاری۔ایسی نقل جس میں چمکی کے کئے محبت ہو، جیسے کہنا چاہتا ہو'ارے تو تو ہے ہی میری جموری۔۔۔اومیری چمکی'۔۔۔مگر وہ بولا۔

یہ سب اتنا آسان نہ رے چمکی۔۔۔تماشہ لگانے کے لئے اور بھی چیچوں کی جروت ہو۔''

'' صاف کیوں نہیں بولتا۔۔۔تیرے بس کی نئیں۔۔۔تو ناکارہ ہے۔۔۔بے کار آدمی۔۔۔'' چمکی پھر بھڑک اٹھی۔چیختے ہوئے بولی۔۔۔''استاد تو بن نہیں سکتا۔۔۔خواب دیکھے، ساب لوگ کے۔۔۔جمورے کا جمورا ہی رہے گا تو تمام جندگی۔۔۔''

اس سے پہلے کہ ہریا کچھ بولے، وہ اٹھی اور رات کی روٹیاں بنانے کے لئے، برابر کے پارک سے لگے، چھوٹے سے جنگل سے لکڑیاں بیننے کے لئے جھونپڑی سے نکل گئی۔

ہریا بیٹھا بدبداتا رہا۔۔۔''ہائے، یہ میری چمکی بھی۔۔۔اسے جمورا ہی سمجھتی ہے۔وہ کافی دیر یوں ہی گردن لٹکائے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔۔۔دنیا کا سب سے گھٹیا، بے ہودہ اور خراب کام جمورا بننا ہی ہے۔

شانتی نگر سے تھوڑا آگے مہان چوک ٹریفک سگنل ہے۔اس چوک کی سڑکیں کافی چوڑی ہیں۔دوطرف فٹ پاتھ سے لگی دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔اور دو جانب پبلک پارک ہیں، جو بہت کم استعمال میں آتے ہیں۔کہا جاسکتا ہیں کہ اس چوراہے کے چاروں جانب ختم ہوتا جنگل ہے۔فٹ پاتھ سے لگی جھاڑیوں کو کاٹ کر کچھ بنجاروں نے اپنا ٹھکانا بنالیا ہے۔انھیں میں سے ذرا ہٹ کر ایک جھونپڑی ہریا کی بھی ہے۔لال بتی ہونے پر بنجاروں کی دیکھا دیکھی ہریا کی بیوی بچے بھی کچھ سامان ٹریفک سگنل ہونے پر بیچنے لگے ہیں۔یہ لوگ مقامی کمپنی کے ایئر فون، پلاسٹک کے پھول، پھولوں کے ہار یا گلدستے، رنگ برنگے چمکیلے کاغذ یا لکڑی سے بنے کھلونے فروخت کرتے ہیں پچھّیس جنوری یا پندرہ اگست پر جھنڈے بیچنے کے علاوہ کبھی کبھار لمبا جام لگ جانے پر بشلری پانی کی جعلی بوتلیں بھی بیچتے ہیں۔

آج شانتی نگر روڈ پر ایکسیڈینٹ ہوجانے کی وجہ سے مہان چوک ٹریفک سگنل پر لمبا جام لگا ہوا تھا۔ہریا بھی پانی کی بوتلیں لے آیا تھا۔وہ بوتلیں لئے گاڑیوں اور بائک سواروں سے پانی کے لئے پوچھ رہا تھا۔جام دور تک پھیل گیا تھا۔جو بائک اور رکشہ فٹ پاتھ کے قریب تھے وہ اپنی گاڑیوں سے اتر کر فٹ پاتھ سے لگی چائے کی ڈھبریوں، کھونچوں پر سے۔چائے، پانی، گٹکا یا نمکین وغیرہ لے کر کھا پی رہے تھے۔ساتھ ہی اپنے ساتھیوں سے سکھ دکھ، فلم، سیاست، کرکٹ، رومانس یا پھر اپنی اپنی کاروبار یا نوکریوں کی الجھنیں، پریشانیاں اور تکلیفیں بتا رہے تھے۔ہریا عادت کے مطابق پانی کی بوتلیں کم بیچ رہا تھا اور لوگوں کی باتیں زیادہ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ہریا صرف ان لوگوں کی باتیں ہی سننے کی کوشش کر رہا تھا جو اپنی نوکری یا کاروباری پریشانیوں سے جھوج رہے تھے۔باقی لوگوں کی باتیں ان سنا کر آگے بڑھ جاتا تھا۔

چاچا بھتیجہ محوِ گفتگو تھے۔''چاچا! اب کیا بولوں، زندگی سے گھن آنے لگی ہے۔۔۔میں، بہت ہی۔۔۔''

چاچا نے بھتیجے کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔۔۔''ہاں بیٹا، میری بھی حالت ایسی ہی ہے۔میں بھی زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔''

چاچا کی نگاہیں کار میں بیٹھی اس عورت پر تھیں، جو موبائل میں ڈوبی ہوئی تھی۔جس کا آدھے سے زیادہ سینہ بلاؤز سے باہر تھا اور باقی باہر آنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

بھتیجا اپنا غم بھول گیا۔۔۔''کیا ہوا چاچا، آپ تو بہت اچھے ہوٹل میں کام کرتے ہیں نا۔۔۔اچھی تنخواہ ہوگی آپ کی۔۔۔؟''

''اچھی تنخواہ کیا ہوتی ہے بھائی۔۔۔مہنگائی آسمان کو چھوتی جارہی ہے۔۔۔اور سیدھی بات یہ ہے آپ کتنا بھی کما لو بیوی بچّے تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔۔۔امبانی، ٹاٹا برلا کی باتیں کرتے ہیں۔اوپر سے سسرا ذلّت بھرا کام۔۔۔بس۔۔۔نہ پوچھ یار۔۔۔''

''آپ اپنے کام سے خوش نہیں شاید۔۔۔'' بھتیجا چاچا کا دکھ جاننا چاہتا تھا تاکہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔

''ہاں بھئی، بڑی اکتاہٹ ہوتی ہے۔روز صبح ہوٹل پہنچو۔۔۔وردی پہنو، پگڑی باندھو، نقلی داڑھی مونچھے لگاؤ اور دروازے پر کھڑے ہو جاؤ ویلکم کرنے۔۔۔ایسے جیسے اسٹیچو۔۔۔ایکدم مورت بن کر۔۔۔دیکھنے والوں کو سانس بھی لیتے نظر نہ آؤ۔۔۔حد تو تب ہوتی ہے، جب کوئی کوئی حرامی مذاق میں یا یہ جاننے کے لئے یہ انسان ہے یا کوئی مورتی ہی ہے۔پیچھواڑے میں آل پن، سوئی وغیرہ چبھو دیتا ہے۔۔۔مگر ہل نہیں سکتے، ورنہ گئے کام سے۔۔۔بہت ذلّت ہوتی ہے یار۔۔۔خیر چھوڑو۔۔۔تم بتاؤ۔کیا ہو رہا ہے ان دنوں؟''

''چاچا، میں ان دنوں کام کی تلاش میں ہوں۔۔۔کوئی کام ہو تو بتانا۔۔۔'' بھتیجے کو چاچا نے اب غور سے دیکھا۔۔۔وہ بے حد کمزور لگ رہا تھا۔

''ہوا کیا۔۔۔تو تو۔۔۔تیری نوکری کا کیا ہوا۔۔۔؟''

''کوئی بھی کام کروں گا۔۔۔جو مالک، بوس کہے گا کروں گا۔۔۔اتنا جان گیا ہوں۔بے روزگاری سے بڑی کوئی گالی نہیں ہوتی دنیا میں۔۔۔جب ہم کام کرتے ہیں تو کچھ ہی لوگوں میں ذلیل ہوتے ہیں مگر۔۔۔جب کام نہیں ہوتا تو انسان تو انسان گلی محلے کے کتّوں تک کے سامنے خوار ہونا پڑتا ہے۔۔۔آسان مال سمجھ کر لوگ آپ کی بیوی کو بھی۔۔۔بچّوں کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔'' بھتیجا سسکنے لگا۔

''تو۔۔۔تو اچھی بھلی نوکری کر رہا تھا۔۔۔ پھر کیسے گئی۔۔۔؟''
چاچا نے اپنی گردن کا پسینہ پونچھا۔
''غلطی ہوگئی۔۔۔اب کوئی بھی کام کروں گا۔۔۔'' بھتیجا رونے لگا۔
''رو۔۔۔رو نہیں، یہ بتا بات کیا تھی؟'' چاچا نے بات سمجھنے کی کوشش کی۔
''چاچا، میرا بوس شوق رکھتا تھا۔۔۔کسی نہ کسی بہانے کیبن میں بلا لیتا تھا۔۔۔اور۔۔۔کپڑے اتروا کر۔۔۔کسی حد تک تو میں نے برداشت کیا۔۔۔مگر۔۔۔مگر جب وہ بولا۔۔۔گندے پن کی تمام حدیں پار کر رہا تھا وہ۔۔۔میں نے گھنیا کر نوکری چھوڑ دی۔۔۔''
چاچا کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔وہ اوپر والے کا دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے بھتیجے سے بولے۔۔۔
''پریشان مت ہو۔۔۔جو ہوا سو ہوا۔۔۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
انھوں نے بیگ سے نکال کر پانی کی بوتل بڑھا دی۔
ہریا چاچا بھتیجا کی گفتگو سن کر پھر حیران ہو گیا۔اور سوچنے لگا۔۔۔
رات کو چمکی کو بتاؤں گا۔۔۔دیکھ کیا کیا ہوتا ہے۔۔۔اس شہر میں۔'' ہریا کو خیال آیا۔پانی کی بوتلیں گرم ہونے لگی ہیں۔اس نے سوچا، جلدی ان کو بیچوں ورنہ یہ بالکل ہی گرم ہو جائیں گی۔ہریا فٹ پاتھ پر چلتا ہوا آگے آ گیا۔
ایک چائے کی ڈھبری پر انل ٹریفک کھلنے کے انتظار میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔تب ہی پیچھے سے آواز آئی:
''اکیلے ہی اکیلے۔۔۔پیو گے سگریٹ۔۔۔'' انل کا دوست راشد کھڑا تھا۔اس کے ساتھ آفس کا ساتھی ستیش بھی تھا۔
انل نے راشد سے پوچھا۔۔۔''آپ دونوں ایک ہی کمپنی میں ہیں نا؟''
''ہاں، یہ اب میری کمپنی میں آ گیا ہے۔'' راشد نے بتایا۔۔۔
''پہلے کسی اور جگہ کام کرتا تھا۔''
''کوئی خاص بات؟۔۔کیوں چھوڑ دیا وہاں سے کام۔'' انل نے ستیش سے بات کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ایسے ہی معلوم کیا۔
''بھائی کیا بتاؤں۔۔۔آفس میں چاروں طرف سی سی ٹی وی کیمرے لگے رہتے ہیں۔۔۔اب کیا بولوں۔انگڑائی یا جمائی بھی لو تو اس کی وجہ بتاؤ۔۔۔بس کرسی سے چپک کر کام کرتے رہو۔۔۔کسی کا پیٹ خراب ہو اور وہ کئی بار واش روم چلا جائے تو طلبی ہو جاتی تھی۔۔۔ایک دن میری سنک گئی اور میں منیجر پر سوار ہو گیا۔۔۔خوب تو تو میں میں ہوئی۔۔۔''
''آپ نے نوکری چھوڑ دی۔۔۔یہی نا؟'' انل نے اندازہ لگایا۔
''جی۔۔۔'' ستیش کے پاس کچھ کہنے کو نہیں بچا تھا۔
''اور یہاں۔۔۔راشد کے آفس میں، سب ٹھیک ہے۔۔۔؟''
انل کی اس بات پر راشد اور ستیش نے ایک دوسرے کے چہرے دیکھے۔
''اب ٹھیک اور صحیح کیا یار۔۔۔کام تو کرنا ہی ہے۔۔۔'' راشد شکایت والے انداز میں بولا۔
''ویسے سب صحیح ہے۔۔۔سیلری بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔'' ستیش کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بات کو راشد نے لپک لیا۔۔۔
''مگر یہ کہ۔۔۔ریسرچ ہم کرتے ہیں۔پرزینٹیشن ہم تیار کرتے ہیں اور منیجر بوس کو سلائڈ پر دکھاتے ہوئے اس طرح پیش کرتا ہے کہ سارا کام اس نے کیا ہم نے بس۔۔۔''
''جھک ماری ہے۔۔۔'' ستیش نے جل کر راشد کی بات مکمل کی۔
''اینکر یمینٹ، پرموشن۔۔۔سب منیجر کا اور ہم۔۔۔'' راشد جل کر، جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''ہم الّو کے الّو۔۔۔وہاں کے وہیں۔۔۔'' ایسا لگتا تھا جیسے دونوں کوئی پریزنٹیشن ساتھ میں تیار کر کے لائے ہیں۔
''بھائی، سب جگہ ایسے ہی ہے، بس پوچھو مت۔۔۔'' انل نے ٹھنڈی سانس بھری۔
''ابے، تو تو اسکول ٹیچر ہے، تجھے کیا پریشانی۔۔۔'' راشد نے ہریا سے پانی کی بوتل خریدتے ہوئے کہا۔ہریا ان کے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔۔۔اسے تینوں دوستوں کی گفتگو دلچسپ لگ رہی تھی۔
''یار، بچّوں کو پڑھانا بھی کوئی کام ہے۔۔۔کھیل ہے کھیل۔'' راشد اور ستیش کی اس بات پر انل نے جلدی سے اپنی چائے ختم کی اور کپ بنچ پر رکھتے ہوئے بولا۔
''بھائی، سب کو ایسے ہی لگتا ہے، مگر ہم کتنی مشکل سے گزرتے ہیں۔۔۔آپ کیا جانو۔۔۔آپ اگر دو دھاری تلوار پر چل رہے ہوتے ہیں تو ہم پرائیویٹ اسکول ٹیچر تین دھاری تلوار سے لڑ رہے ہوتے ہیں۔'' انل کا درد زبان پر آ گیا۔
''کیا مطلب۔۔۔'' ستیش نے لاپرواہی سے پوچھا۔
''مطلب؟؟؟۔۔۔بس یوں سمجھ لو ہم لوگوں کا کام سرکس کے جوکر سے کم تھوڑی ہوتا ہے۔'' انل بنا روکے بولتا چلا گیا جبکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ستیش اور راشد اس کی باتیں بے دلی سے سن رہے ہیں۔۔۔جلد سے جلد ٹریفک کھلے اور ان کو چھٹکارا ملے۔
''اسکول ٹیچر ہونا ایک عذاب ہے۔۔۔پرنسپل اپنی ہانکتی ہے۔۔۔کوارڈینیٹر سے زیادہ قابل دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔۔۔جب لیسن تیار ہو جائے تو۔۔۔بچّے؟ سارے پلان کی ایسی تیسی کر دیتے ہیں۔ایسے ایسے بدتمیز بچّے ہوتے ہیں کہ پوچھو مت بس اتنا سمجھ لو کہ ہمیں بچپن میں ٹیچر سے ڈرایا، دھمکایا اور اب بچّوں سے خوف آتا ہے۔۔۔سرکار کا قانون الگ۔۔۔کبھی کبھی تو کسی ٹیچر

باقی صفحہ ۱۰۷ پر ملاحظہ کیجیے

دلتوں کی اندھیری رات

ندیم راعی
(مرادآباد)

میں گریجویشن کے آخری سال میں تھی، آلوک میرا کلاس فیلو مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی۔ وہ اتنا خوبصورت خوبرو ہینڈسم تو نہیں تھا کہ لڑکیاں اسے دل دے بیٹھیں لیکن اس میں سنجیدگی، متانت خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی، وہ سمجھدار بھی تھا اور محنتی بھی۔ سادہ لوح سادگی پسند، معمولی سی شکل صورت اور درمیانہ قد تھا اس کا لیکن اس کے چہرے پر مردانہ رعب اور وجاہت نمایاں طور پر نظر آتی تھی جو دوسرے خاص طور سے خوبرو ہینڈسم موڈرن اور قیمتی لباس زیب تن کرنے والے لڑکوں سے بالکل مختلف تھا۔ یہی اس کی جداگانہ پہچان میرے لئے متاثر ہونے کی وجہ تھی اور میں اس کی طرف خود بہ خود کھنچی چلی جا رہی تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دلت لڑکا ہے اور میں بڑی ذات کی بیٹی۔۔۔لیکن دل ذات پات چھوٹا بڑا اور اونچ نیچ کی تمیز کہاں کرتا ہے وہ تو بس پیار کرنا جانتا ہے ۔۔۔عجب بات تو یہ ہے کہ وہ میری اس حالت زار سے بالکل واقف نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اس پر اپنے اس دیوانے پن کا اظہار کیا تھا ہم دونوں میں قدر مشترق یہ ہے کہ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ اور میری طرح کلاس میں اول یا دوئم رہتا۔ جب وہ کہیں نظر نہیں آتا تو اس کی چھوٹی بہن مکتا۔ جو فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے سے اس کے بارے میں معلومات فراہم کر لیتی لیکن اس کو بھی میں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے بھائی کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہوں۔

میں گجرات کے چھوٹے سے دیہات کے پردھان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ جسے بڑے ناز و نیاز سے پالا پوسا میرے تین بڑے بھائی گاؤں کی پنچائت کے اہم رکن ہیں اور سیاسی سماجی اقدار میں ہمہ وقت شریک رہتے ہیں آلوک قریب کے گاؤں میں رہتا ہے جس کے اجداد ہمیشہ ہمیش سے۔ مرے ہوئے جانوروں کا چمڑہ اتارتے چلے آئے ہیں اور یہی اُن کا ذریعہ معاش ہے۔

ہمارے ملک کے اس جمہوری نظام اور آئین نے صدیوں سے دبے کچلے غریبی ریکھا سے نیچے زندگی گذارنے والی ذاتوں کو یہ سہولیات فراہم کر دی ہیں کہ وہ دیگر اقوام کے شانہ بشانہ تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی ایک عام آدمی کی طرح سکون وعزت سے گذار سکیں سرکار کی انہیں سہولیات و وظیفے کے بوتے آلوک ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہوئے یہاں تک پہونچا ہے اور وہ سنجیدگی ومحنت سے اپنی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یقیناً کسی دن وہ ایک مقام پر پہونچنے میں کامیاب ہوگا۔ اور میں کم بخت اس پر مرمٹی تھی۔ رات ودن اس کے خیالوں میں گم رہتی۔۔۔اور اسے نہ تو کسی طرح کے کھیل کود اور نہ ہی لڑکیوں میں دلچسپی تھی وہ اپنی دنیا میں الگ تھلگ رہتا کالج میں تقریباً سبھی اس کی قومیت کے بارے میں جانتے تھے۔ اور قدرے اس سے دور رہتے نہ اس کا کوئی دوست تھا نہ اس سے کوئی دوستی کرنا چاہتا تھا۔ اور نہ وہ کسی سے دوستی کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ صرف اور صرف حصول تعلیم اس کا مقصد عین تھا۔ میں ہمہ وقت ڈری ڈری سہمی سہمی رہتی کہ کہیں میرے گھر والوں کو میرے یکطرفہ عشق کی بھنک نہ لگ جائے کہیں میرے بھائی میری آنکھوں میں میرے پیار کی تصویر نہ دیکھ لیں لہٰذا میں اپنے بھائیوں سے دوری بنائے رکھتی تھی اور ان سے ہمہ وقت آنکھیں چراتی رہتی مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ میں آلوک کے پیار میں گرفتار ہوں تو یہ آلوک کو ہی نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کو نیست ونابود کر دیں گے۔ یہ جانے بغیر کہ اس میں اس کا اور اس کے خاندان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

آخر وہ بے قصور کیوں موت کے گھاٹ اتار دئے جائیں۔ قصوروار تو میں ہوں سزا مجھے ملے۔ اور سنگین سے سنگین سزا۔

میں آلوک سے پیار کر کے اپنے آپ کو بغیر کسی جرم کئے جانے والا مجرم تصور کرنے لگی تھی۔ کالج جانا بھی میں نے کم کر دیا تھا۔ بس اپنے کمرے میں آلوک کے خیالوں میں گم پڑی رہتی۔ میری ماں اور بھابھیاں میری اس حالت کو دیکھ کر بے حد فکر مند تھیں ڈاکٹر سے صلاح مشورہ کیا لیکن انھوں نے کوئی مرض تشخیص ہی نہیں کیا کیونکہ میرا مرض تو ڈاکٹروں کے بس میں نہیں تھا یہ مرض تو لا علاج تھا۔۔۔تاہم میری چھوٹی بھابی جو میری ہم عمر ہیں نے میرے مرض کو کچھ کچھ سمجھ لیا تھا۔ اور اکثر و بیشتر ''لڑکا کون ہے کیسا ہے ہمیں نہیں ملواؤ گی۔؟'' جیسے سوالات کرتیں جنھیں سن کر میں چونک جاتی کہ کہیں انھوں نے میری آنکھوں میں اس کی تصویر تو نہیں دیکھ لی ہے۔ میرے چہرے کی لکیروں میں تو اسے نہیں پڑھ لیا ہے۔ میں گھبرا کر انکار میں جواب دیدیتی کہ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے کوئی لڑکا وڑکا نہیں ہے بس تھوڑی طبیعت خراب ہے ڈاکٹر نے دوا دیدی ہے۔ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔۔۔'' مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اس کی یادوں کے سلسلے دراز ہوتے گئے آنکھیں اس کے دیدار کو ترس گئیں بھائی بھابیوں کے اصرار اور پھر اس کے دیدار کی چاہ نے مجھے کالج جانے پر مجبور کر دیا۔ اُسے دیکھ لینے کے بعد سکون تو نہیں ملا البتہ بے چینی بڑھ گئی۔۔۔تاہم میں اپنی چھوٹی بھابی کے شک کے دائرے میں ضرور آ گئی تھی جس کی وجہ سے میں ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں وہ میرے بھائیوں کو نہ بتا دیں کہ مجھے عشق کا روگ لگ گیا ہے اور اس مرض کی دوا وہ لڑکا ہے جسے میں دل وجان سے چاہتی ہوں۔ تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔۔۔اس بے قصور اور اس کے پورے خاندان پر۔۔۔؟

میں اپنے کمرے میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی اور ساتھ ہی آج کے اخبار کی ورق گردانی میں مصروف تھی کچھ نام نہاد گئو رکھشکوں نے ایک ٹرک سے کچھ گائیں ضبط کیں جن کے اندازے کے مطابق وہ لوگ یہ گائیں کاٹنے کے لئے لے جا رہے تھے۔ جنھیں ان گئو رکھشکوں نے پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا۔ نہ پولس نہ ایف آئی آر نہ عدالت نہ کوئی عذر نہ کوئی ڈیفنس۔۔۔سارے کام ان گئو

رکھشکوں نے تن تنہا کر ڈالے انصاف وقانون کو ان لوگوں نے تاک پر رکھ دیا تھا۔۔۔گویا کہ ہمارے صوبے میں انسانوں وانصاف کا راج نہیں بلکہ جنگل راج ہے۔ بے حسوں کی حکومت ہے۔۔۔ ہندوتو کے نام پر جس کا جو جی چاہے کر گذرے۔۔۔

ویدک کال میں ہندوتو کو بچانے کیلئے شاید دیوی دیوتا ہتھیاروں سے لیس رہتے تھے۔۔۔یہ ہندوتو کو بچانے کے لئے کس سے لڑتے تھے (اُس زمانے میں مسلمان تو تھے نہیں) جبکہ ویدک کال میں گایوں کی بلی دی جاتی تھی اس بلی پر تھا اور خون خرابے کی وجہ سے ہی جین اور بودھ مذہب کا آغاز ہوا۔ جو ہنسا یعنی تشدد کے پوری طرح خلاف تھے۔ تب گئو ان کی ماتا نہیں تھی اور آج ہندتو کو بچانے کے لئے گئو رکھشک دل گئو سیوا دل سمیتی ومختلف تنظیمیں میدانِ حشر میں اتر آئی ہیں۔

گئو رکھشکوں کی یہ باڑھ ہمارے گھر کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی اور میرا ایک بھائی گئو رکھشک سمیتی کا رکن بن گیا تھا۔ جس کی ماہانہ میٹنگ ہماری حویلی میں ہوا کرتی۔ ٹی وی انٹرنیٹ واٹس ایپ پر گئو رکھشکوں کے کارناموں کو میڈیا بڑے زور وشور سے دکھا رہا تھا جیسے میڈیا کو کچھ اور کام ہی نہیں ہے۔ جیسے مجھے اس کی یاد کے سوا کوئی کام نہیں وہ نظر نہیں آتا تو میں تڑپ جاتی ہوں اور پورے دن کھوئی کھوئی سی رہتی ہوں۔ بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ ٹی وی پر ایک دلت طالب علم دیپک کی خودکشی ملک میں دلتوں اور مسلمانوں کے خلاف غم وغصہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ دھڑلے سے لکھا اور دکھایا جا رہا تھا۔ لاشعوری طور پر نہ جانے میں دلتوں کے مسائل اور ان کی دبی کچلی زندگی کے پہلوؤں میں کیوں دلچسپی لینے لگی تھی۔ میرے دل میں نہ جانے کیوں ان مظلوموں کے لئے نرم گوشہ بنتا جا رہا تھا۔ میں اکثر اپنی حویلی میں ہونے والی گئو رکھشکوں کی میٹنگ کی کارروائی چھپ چھپ کر سنا کرتی تھی۔ آج کے موڈرن ٹکنالوجی کے زمانے میں بھی ہمارے گھر کی عورتیں بہو بیٹیاں گھر کی چہار دیواری اور پردے میں رہا کرتی تھیں اور مردوں کے کام کاج وکارگذاریوں سے دُور۔۔۔

رات کا وقت تھا میں سونے جا رہی تھی جیسے ہی میں ٹی وی بند کرنے لگی کہ ایک خبر میں دکھایا جا رہا تھا کہ قریب کے گاؤں یعنی آلوک کے گاؤں کے کچھ دلتوں کے گھروں سے گئو رکھشکوں نے دلتوں کے بوڑھے اور جوانوں کو آج دوپہر ننگا کر کے قطاروں میں کھڑا کر کے لاٹھیوں سے پیٹا جا رہا تھا ان دلتوں میں آلوک اور آلوک کے پتا دینو کا کا بھی تھے۔ جن پر الزام تھا کہ انھوں نے گئو ماتا کی ہتیا کر کے اس کا چمڑہ اتارا ہے اور گئو ماتا کے گوشت کو آپس میں بانٹ کر کھا پکا لیا ہے اور گئو رکھشکوں کی دیدہ دلیری دیکھئے کہ انھوں نے اس ظلم وتشدد کی پوری ویڈیو فلم بنا کر فیس بک پر وائرل کر دی ہے جسے پورے ملک میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا نے دیکھا ہے اور ملک کے مختلف چینلوں نے اس ویڈیو کو دکھایا۔ آلوک ودیگر کی یہ حالت دیکھ کر میں کراہ اٹھی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے نہ جانے اس کی بہن وماں کا کیا حال ہوا ہوگا میں گھبرا کر جب نیچے ڈرائنگ روم کی طرف آنا چاہتی تھی تو میرے بھائی کی سربراہی میں گئو رکھشکوں کی میٹنگ رواں دواں تھی جس میں ایسی ایسی رونگٹے کھڑی کر دینے والی قرار دادیں پاس ہوئیں جسے سن کر شیطان بھی شرما جائے۔ جن میں ایک قرارداد یہ بھی تھی کہ آج رات کو دلتوں کے گھر میں گھس کر گئو ماتا کے قاتلوں کی بہو بیٹیوں کو مزہ چکھائیں گے اور انھیں تباہ وبرباد کر ڈالیں گے۔

سورج کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ دلتوں کے ایک جھونپڑے نما گھر سے ایک مادر زاد برہنہ لڑکی کو ان وحشی جانوروں نے چیخ وپکار وآہ وبکا کے باوجود ساری رات نوچ نوچ کر لہولہان کیا اور اس کی عزت کئی کئی بار لوٹی گئی اس کا چہرہ اس کے پھٹے جمپر میں پھنسا تھا یہ گئو رکھشک اسے گھسیٹ کر باہر لائے ان میں سے ایک نے لاٹھی کی نوک سے اس ادھ مری لڑکی کے نازک حصوں پر ضرب لگائی اس کے سر پر اپنا پیر رکھ دیا۔ اس کے مردہ جسم میں کچھ لرزش پیدا ہوئی یہ دیکھ کر کہ وہ زندہ ہے ان وحشیوں نے اس کے چہرے سے اس کا جمپر ہٹا کر اس پر ایک بالٹی پانی ڈالدیا وہ قدرے ہوش میں آ گئی اس کا پورا جسم خاص طور سے پوشیدہ اعضاء لہولہان تھے اپنے پیروں پر وہ لڑکھڑاتی جیسے کھڑی ہوئی ان میں سے خنجر لئے ایک گئو رکھشک یہ کہہ کر چیخ پڑا کہ ''یہ تو میری بہن رامیشوری ہے گاؤں کے پردھان دین دیال کی بیٹی ہے'' وہ اپنے ہاتھ سے خنجر پھینکتے ہوئے اس کی طرف بڑھا اس لڑکی نے اسے زور سے دھکا دیا اور خنجر اٹھا کر اس کی نوک اپنے برہنہ سینے پر رکھ کر کہا ''خبردار میرے قریب کوئی نہ آئے تم لوگوں نے دلت کی بیٹی سمجھ کر میری عزت تار تار کر دی اور مجھے زخمی کر دیا میں ان بے قصور دلتوں کی بہو بیٹیوں کو تمہارے چنگل سے نکال کر بھگانے میں کامیاب ہوگئی اور میں نے ان کی جگہ لے لی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بیٹی کسی کی بھی ہو بیٹی بیٹی ہوتی ہے۔

''جگ ہنسے، گھر بسے''

''کرونا وائرس'' کے پیدا کردہ اس اموات شماری کے روح فرسا اور دلخراش موسم میں لندن کے قرب وجوار کسی رہائشگاہ میں یا ضیافت گاہ میں شادیانے بجے اور خیر سے مصنفہ اور ڈائریکٹر نور سجاد ظہیر اور یاور عباس رشتۂ ازدواج میں باہم ایک ہوگئے۔ دولہا، دلہن دونوں بی بی سی کی اردو نشریات کے روح رواں اور ایک عالم میں مقبول ومعروف ہیں۔

مذکورہ خبر کے ساتھ یہ تفصیل یا تخصیص جڑی ہوئی ہے کہ خیر سے عروس نے زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھی ہیں اور نوشہہ کی سوویں (100) سالگرہ چھ ماہ بعد منعقد ہونے والی ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات کے ساتھ روایت بھی بندھی ہے کہ ہر شادی میں لوگ استہزا کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح ''جگ ہنسے، گھر بسے'' کی کہاوت بھی پوری ہو جاتی ہے۔

''الہام کا گماں''

تصور اقبال

(اٹک)

کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کیا کام آتا ہے
تصوّر ہوں تصور میں وہ صبح وشام آتا ہے

اگر مجھ سے کوئی پوچھے یقیناً ''میم'' ہوتا ہے
تجھے کس نے بتایا ہے کہ پہلے لام آتا ہے

سنا ہے آج بھی اُس باغ کا مالی نہیں بدلا
یہی گلفام آتا تھا وہی گلفام آتا ہے

مرا بھائی بڑا ہے، نا اُسے پورا ہی ملتا ہے
میں چھوٹا ہوں مرے حصے میں آدھا آم آتا ہے

وصیت میں نے کر دی ہے کفن میرا وہی ہوگا
مدینے اور مکے سے جو اک احرام آتا ہے

صداقت بھی شرافت بھی امانت بھی دیانت بھی
حوالہ چاہے جو بھی ہو مرا ہی نام آتا ہے

یقیں کر لو نہیں بھولا رفاقت چار دن کی وہ
سمندر پار سے میرے لیے پیغام آتا ہے

غزل لکھنا اگر چھوڑوں تو بالکل ہی نکما ہوں
قسم لے لو کوئی مجھ سے یہی اک کام آتا ہے

اگرچہ اک پڑوسی ہے مگر اپنوں سے بہتر ہے
بلاناغہ ہمارے گھر وہ صبح و شام آتا ہے

کسی دن اُن سے پوچھوں گا حقیقت یہ تصوّر جی
مرے جانے سے اُن کے گھر میں کیوں کہرام آتا ہے

قاسم جلال

(بہاولپور)

بڑھ رہی ہے ازل سے علم کی پیاس
کھا رہا بشر فریبِ حواس

اُن کے وعدوں پہ مت لگاؤ آس
کاغذی پھول میں رنگ نہ باس

خامیٔ فکر کی علامت ہے
آس کی ہوخلش کہ گریۂ یاس

غم نہ بن جائے روح کا ناسور
بول! کچھ تو نکال دل کی بھڑاس

پھول بھی خار بن کے چبھنے لگیں
اس قدر بھی بشر نہ ہو حسّاس

جسمِ بے روح شاعری ہے وہ
ہو نہ جسکی حقیقتوں پہ اساس

اے خدا! کیا ستم ظریفی ہے
پھول بوئے تھے اور کاٹی گھاس

تپشِ سوزِ دل خدا کی پناہ
سوکھ جائے نہ چشمۂ احساس

زہر افشاں ہیں آپ کی آنکھیں
گرچہ باتوں میں شہد کی ہے مٹھاس

فیصلوں میں ہے ہچکچاہٹ کیوں
جب ہے میزانِ عقل آپ کے پاس

روح کو ہے یہ زہرِ قاتل بھی
اور تریاق بھی ہے خوف و ہراس

ہم کو الہام کا گماں جس پر
تیرے نزدیک وہ سخن، بکواس

زیست جب موت کی طرح ہے اٹل
کر خوشی سے قبول، ہو نہ اداس

موت بھی جن کو راس نہ آ سکی
زندگی آئے گی انہیں کیا راس

چھپ سکا ہے نہ چھپ سکے گا کہیں
آنکھ جذبِ دروں کی ہے عکّاس

روح پر داغِ جُرم اُبھریں گے
جب اُتر جائے گا بدن کا لباس

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

(فاکہہ بجل کے لیے)

چہارسو ہے جو پھیلی وہ روشنی تم ہو
مجھے تو لگتا ہے ایسے کہ زندگی تم ہو

مکالمے کا بھی اک سلسلہ سا رہتا ہے
کہ مجھ کو کہنا جو ہوتا ہے سوچتی تم ہو

ہیں رابطے بھی عجب سے کچھ درمیاں اپنے
ہے گونج جن کی دروں میرے خامشی تم ہو

کبھی جو ٹوٹے نہیں یہ تو ایسا بندھن ہے
ہمیشہ ناز رہے جس پہ دوستی تم ہو

تم پاس ہوتی ہو، سامانِ تسکیں رہتا ہے
ہو دل کا میرے سکوں، امن و آشتی تم ہو

دروغ گوئی کی دھند پھیلی چاروں جانب ہے
تمہی اُجالا ہو رستے کا، راستی تم ہو

ہمارے تجربے بھی کتنے ملتے جُلتے ہیں
دھیان میں ہے جو میرے وہ کھوجتی تم ہو

○

مظہر بخاری

(میاں چنوں)

وہ حسیں جب سے میرے دھیان میں ہے
ایک خوشبو سی جسم و جان میں ہے

کل سرِ راہ تیری بات چلی
اب تلک ذائقہ زبان میں ہے

دن مزے سے گزر رہے ہیں مرے
آج کل وہ مرے مکان میں ہے

جب سے میں اس سے مل کے آیا ہوں
ہر طرف زندگی اڑان میں ہے

مجھ وحی زاد پر یقین اُتار
وسوسوں میں ہے دل، گمان میں ہے

یہ جو میں ہشت رنگ رہتا ہوں
معجزہ دستِ مہربان میں ہے

کٹ گیا پیڑ گھر کے آنگن کا
دھوپ کا شور سارے لان میں ہے

مجھ میں مظہر ہے روشنی اُس کی
وہی ضو ریز شمع دان میں ہے

○

سبھاش گپتا شفیق

(بھارت)

اگر نصیب میں حسن نظر نہیں ہوتا
تو اس خرابے میں اپنا گزر نہیں ہوتا

نہ کچھ ہو پاس تو پھر اسکا لطف ہی ہے الگ
کہ کچھ بھی راہ میں کھونے کا ڈر نہیں ہوتا

کبھی بھی مجھکو بلاتا نہیں سفر کے لئے
وہ رہگزار کہ جو پرخطر نہیں ہوتا

یہ لوگ ایسے ہی خنجر بہ دست نکلیں گے
عدالتوں سے میاں کچھ اگر نہیں ہوتا

برائے نام نہ ہوتے جو قاعدے سارے
ستم کے چہرے پہ نور سحر نہیں ہوتا

نہ مجھ سے روٹھتیں تاروں بھری حسیں راتیں
شفیق اپنا میں دشمن اگر نہیں ہوتا

○

شہلا نقوی

(نیویارک)

کس طرح شعر تراشے گی مری بے ہنری
سانحہ ہو چکا باقی ہے فقط نوحہ گری

اک قبا قامتِ ہستی کے لیے ہے درکار
پارچے بکھرے ہیں باقی ہے ابھی بخیہ گری

خاک رستوں کی تو چھنوائے گی کب تک مجھ سے
کونسا گھر ہے مرے واسطے اے دربدری

شعبدہ باز ہیں اور ایک کنواں موت کا ہے
جینے کے واسطے ہر ایک کی ہے بازی گری

سر کو اندوہ میں دیواروں سے ٹکراتی رہی
جہاں کے آئینہ خانے میں مری بے بصری

○

رِشی خان

(جرمنی)

آئے زوال جس دم انساں کی عظموں کو
شاہین کے نشیمن ملتے ہیں کرگسوں کو

یہ کام ہی تھا ایسا، رہبر بھی کر نہ پائے
تہذیب کا سکھانا، صحرا کے ڈاکوؤں کو

جتنی حسیں ہے منزل اُتنا سفر ہے مشکل
یا ترک خواہشیں کر یا دوست مشکلوں کو

کر کے سبق میں حاصل بڑھتا رہوں گا آگے
گنتے رہو گے بیٹھے تم میری لغزشوں کو

ہر عیش ہو میسّر، لیکن نہ ہو محبت!
دوزخ میں کیوں نہ ڈالیں ہم ایسی جنتوں کو

ان میں چھپے خزانے ہم کیسے ڈھونڈ پاتے؟
پتھر سمجھ لیا تھا خاموش برتنوں کو

ان کی ہوئی تسلّی، میں بھی ہوں عام انساں
کب سے ترس رہی تھیں آنکھیں یہ آنسوؤں کو

گلشن کو جائیں کیسے؟ اس شہر سے رِشی جی
جاتے ہیں سارے رستے صحراؤں جنگلوں کو

○

رومانہ رومی

(کراچی)

دو حرفِ مدّعا مرے لب سے نکل گئے
اتنی سی بات پر ترے تیور بدل گئے

جو لوگ حادثات کے سانچے میں ڈھل گئے
آساں وہ خارزارِ طلب سے نکل گئے

ہر شعبۂ حیات کا نقشہ بدل گیا
اربابِ اقتدار نئی چال چل گئے

سب سے قدم قدم پہ ہوئیں لغزشیں مگر
اُس نے جنھیں سنبھال لیا وہ سنبھل گئے

اِب تک نہ حسن و عشق کی فطرت بدل سکی
کہنے کو زندگی کے تقاضے بدل گئے

اِک ناخدا نے کتنے سفینے ڈبو دیئے
ہم نے خدا کا نام لیا اور نکل گئے

ہر گوشۂ جہانِ محبت اُجڑ گیا
دُنیا بدل گئی مری، وہ کیا بدل گئے

طوفانِ اضطراب ہے دن رات موجِ زن
رومانہ رومی کی تمھیں دُنیا بدل گئے

○

شبہ طراز

(لاہور)

آیئے ، دِل دُکھایئے صاحب — پھر ہمیں آزمایئے صاحب
وُسعتِ آسمان ، اُف توبہ — اب مرے پَر کٹایئے صاحب
یہ اُداسی مری سہیلی ہے — جایئے ! آپ جایئے صاحب
ہجر سا ہجر ہے محبت میں — کیا کریں یہ بتایئے صاحب
نیند کا قرض جب اُٹھا ہی لیا — خواب ہم کو دِکھایئے صاحب
رات ، خاموشی ، چاندنی ، خوشبو — آ کے جادو جگایئے صاحب
قصہ گو تھک کے سو گیا شاید — قصہ آگے بڑھایئے صاحب
وقت تو راکھ ہو گیا کب کا — اب ہمیں بھول جایئے صاحب
زندگی ہے ، گزر ہی جائے گی — دل کہیں پر لگایئے صاحب

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

درِ افق سے چراغِ سحر لیے نکلا — یہ کون تازہ رتوں کی خبر لیے نکلا
مجھے جنوں تھا سفر کی صعوبتیں دیکھوں — سو دھوپ شہر میں سوکھے شجر لیے نکلا
لٹے لٹے سے دنوں کے مٹے مٹے سے نقوش — میں اپنے ساتھ یہی مال و زر لیے نکلا
ذرِ کثیر سے دنیا میں معتبر ٹھہرا — وہ بے ہنر تھا مگر یہ ہنر لیے نکلا
کہاں نصیب ہوا اس کو ظلمتوں میں چراغ — جو دل میں تیز ہواؤں کے ڈر لیے نکلا
لہو لہو اسے دیکھا گیا یہاں پہ عدیلؔ — جو سنگ شہر میں روشن نظر لیے نکلا

○

نصرت جعفری

(سرگودھا)

راگ چھیڑا ہے نہ چھیڑا ہے فسانہ ہم نے — خندہ روئی سے کیا سب کو ''دِوانہ'' ہم نے
ہم زمانے کی روش پر نہیں چلنے والے — اپنی مرضی پہ چلایا ہے زمانہ ہم نے
رنگت و قوم و قبیلہ و زبان و مذہب — پیرے ان سارے خداؤں کو نہ مانا ہم نے
جانے والوں نے پکارا جو کبھی مشکل میں — فاصلوں کا نہ کیا کوئی بہانہ ہم نے
اک پری چہرہ کو دیکھا تو یہ دل میں آیا — خواب دیکھا تھا کبھی کوئی سہانا ہم نے
ہائے افسوس کہ اعداء کی صفوں میں نصرتؔ — آج دیکھا ہے کوئی یار پرانا ہم نے

○

افتخار حیدر
(شورکوٹ)

بوسہ نہ دے گلے نہ لگا ہاتھ مت ملا
اے یارِ خوش جمال مگر سامنے تو آ

دوچار گز کے فاصلے سے مسکرا کے دیکھ
دوچار گز کے فاصلے تک آ کے لوٹ جا

یا گھر میں بیٹھ اور مجھے تصویر بھیج دے
فصلِ وبا میں وصل کا انداز ہے جدا

ملنے کے اشتیاق کو فردا پہ ٹال دے
امروز حالِ دل مجھے واٹس ایپ پر سنا

کھڑکی سے جھانک جھانک کے خوش ہو اروئے خوش
پٹ کھول، دیکھ دیکھ کے کچھ دیر مسکرا

گزریں وبا کے دن تو بغلگیر ہوویں گے
ارمان ضبط کر اے مرے یار تھم ذرا

○

احمد سراج فاروقی
(راجستھان)

کسی بھی دل میں کہاں سچ کا بیج پلتا ہے
ہمارے ملک میں اب صرف جھوٹ چلتا ہے

یہ کس کے نام سے رکتی ہیں دھڑکنیں میری
یہ کون مجھ میں ک ء کروٹیں بدلتا ہے

اسے ہے جسم کی خواہش میں دل کا شیداء
یہاں سے اس کا میرا راستہ بدلتا ہے

ہوائیں بھیجنے والے پلٹ کے دیکھ ذرا
میرا چراغ تیری آندھیوں میں جلتا ہے

یہاں چھپا تو کہیں اور جا کے نکلے گا
سیاہ رات سے کب آفتاب ڈھلتا ہے

سلگتی دھوپ سے جب میں گزرنے لگتا ہوں
کسی کا سایہ میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے

چلو سراج کسی دوسرے سفر پہ چلیں
یہاں تو جھوٹے خداو?ں کا حکم چلتا ہے

○

پریم ناتھ بسمل
(مرادپور، بہار)

کرونا نے ایسا ستم کر دیا
مانس مرنے کی قیمت کو کم کر دیا

ناز تھا سائنسدانوں کو خود پہ مگر
ناک میں اس نے سب کے ہی دم کر دیا

حد سے بڑھنے لگا تھا بہت چین بھی
جھٹ سے قدرت نے پیچھے قدم کر دیا

ہم نے دیکھی نہ ایسی بیماری کبھی
ہنستے گاتے زمانے میں غم کر دیا

نکلتا نہیں گھر سے باہر کوئی
سارے عالم پہ دہشت رقم کر دیا

آج بسمل جو کھانسی ذرا آ گئی
ترک ہم سے محبت صنم کر دیا

○

عبدالوہاب (لاہور)

اپنے گھر کے، در و دیوار سے، ڈر لگتا ہے
گھر کے باہر، تیرے گلزار سے، ڈر لگتا ہے

فاصلے بن گئے، تکمیلِ محبت، کا سبب
وصلِ جاناں سے، رُخِ یار سے، ڈر لگتا ہے

اُسکی یادوں سے ہی تسکینِ تصور کرلوں
اب مجھے، محفلِ دلدار سے، ڈر لگتا ہے

سارے تبدیل ہوئے، مہر و وفا کے دستور
چاہنے والوں کے، اب پیار سے ڈر لگتا ہے

خوشبوؤں، لذتوں، رنگوں میں خوف پنہاں ہے
برگ سے، پھول سے، اشجار سے ڈر لگتا ہے

تھی کسی دور علیلوں کی عیادت واجب
لیکن اب، قربتِ بیمار سے، ڈر لگتا ہے

جنکی آمد کو سمجھتے تھے خدا کی رحمت
ایسے مہمانوں کے، آثار سے، ڈر لگتا ہے

اب تو لگتا ہے، میرا ہاتھ بھی اپنا نہ رہا
اس لئے، ہاتھ کے تلوار، سے ڈر لگتا ہے

تن کے کپڑے بھی عدو، پیر کے جوتے دشمن
سر پہ پہنے ہوئے، دَستار سے ڈر لگتا ہے

جو گلے مل لے میری جان کا دشمن ٹھہرے
اب، ہر اک، یارِ وفادار سے، ڈر لگتا ہے

ایک نادیدہ سی ہستی نے جھنجوڑا ایسے
خلق کو، گنبد و مینار، سے ڈر لگتا ہے

بن کے ماجوج، نمودار ہوا، چاروں اوڑ
اِسکی یاجوج سی، رفتار سے، ڈر لگتا ہے

عین ممکن ہے یہاں سب ہوں کورونا آلود
شہر کے کوچہ و بازار سے ڈر لگتا ہے

خوف آتا ہے صحیفوں کی تلاوت سے اب
ہر رسالے سے، ہر اخبار سے، ڈر لگتا ہے

اب تو اپنوں سے مصافحہ بھی پُر خطر ہے وھاب
یوں نہیں ہے کہ فقط اغیار سے، ڈر لگتا ہے

اسدرضا سحر (احمد پورسیال)

خود کو تشکیل کرنے والا ہوں
یعنی تبدیل کرنے والا ہوں

اپنے حصے کے آج ساغر میں
زہر تحلیل کرنے والا ہوں

دیکھ لو آج میں تری خاطر
اپنی تذلیل کرنے والا ہوں

اپنی مرضی کا امتحاں لینا
حفظ انجیل کرنے والا ہوں

بچے پھولے کہاں سمائیں گے
کل میں تعطیل کرنے والا ہوں

میں اندھیروں کے اس جہاں کو سحر
شہرِ قندیل کرنے والا ہوں

عامر بیگ (یوایس اے)

تو گیا ہے تو کوئی چاند نکلتا ہی نہیں
تیرا بیمار کسی طور سنبھلتا ہی نہیں

دل اگر دل ہے تو احساس کی کو کافی ہے
دل ہے پتھر تو کسی طور پگھلتا ہی نہیں

جانے کس منزلِ موہوم کی جانب ہیں رواں
دو قدم ساتھ ہمارے کوئی چلتا ہی نہیں

کب تلک صبر کے پھولوں کو جھلستا دیکھیں
ظلم کی آگ کا سورج ہے کہ ڈھلتا ہی نہیں

کسی دریا کی طرح وقت بڑھا جاتا ہے
میری تقدیر کا پتھر ہے کہ چلتا ہی نہیں

شادی وصل ہو یا رنج جدائی عامر
دل کا دیپک کسی احساس سے جلتا ہی نہیں

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۲۶

آپ یہاں؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو وہ بولی، جی ہاں۔ خیریت تو ہے؟ سانپ کی کاٹ کا زخم تو نہیں دُکھ رہا؟ میں نے پوچھا تو ڈالیا نے جواب دیا جی نہیں! کاٹ کا زخم تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس یونہی نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے سوچا کچھ دیر آپ سے باتیں کر آؤں۔ یہاں آئی تو آپ سانپ کی آنکھوں میں مراقبہ کرتے ہوئے اچھے لگے اس لیے آپ کو دیکھنے بیٹھ گئی۔ سانپ کی کاٹ کی وجہ سے آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور میں نے آپ سے اگلے چوبیس گھنٹے آرام کرنے کو کہا تھا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اب بھی آرام سے ہی بیٹھی ہوں کوئی بھاگ تھوڑی رہی ہوں۔ اس نے مسکرا کر برجستہ کہا۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن آرام بستر پر لیٹ کر ہوتا ہے بیٹھے رہنے سے نہیں ہوتا، میں نے جواب دیا تو اس نے اٹھتے ہوئے کہا، اگر میرا یہاں آنا آپ کو بُرا لگا ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔ نہیں نہیں، آپ بیٹھیں۔ ایسی کوئی بات نہیں میں تو یہ سب کچھ آپ کی حفاظت کے لیے کہہ رہا تھا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ یہ کمرہ سانپوں کا گڑھ ہے اور کوئی سانپ کہیں سے بھی نکل کر آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا تو ڈالیا واپس بیٹھتے ہوئے بولی، میرے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کیا ہو گی کہ میں یہاں ایک ایسی ہستی کے سائے میں بیٹھی ہوں جو کو برے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مراقبہ کرتا ہے۔ میں کوئی ہستی وستی نہیں ہوں۔ ایک عام سا انسان ہوں، میں نے جواب دیا تو اس نے کہا، جب آپ جان اور سٹیو کے خیمے میں باتیں کر رہے تھے تو میں پاس والے خیمے سے آپ کی باتیں سن رہی تھی۔ کسرِ نفسی کے علاوہ آپ کی فراغ دلی بھی قابل تعریف ہے۔ آپ نے جس بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے سریت، جان اور سٹیو کو معاف کیا ہے یہ عام فہم سے ہٹ کر ہے۔ اس میں بڑے پن کی کوئی بات نہیں۔ بہت سے لوگ اپنی کوتاہیاں چھپانے کے لیے دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے ان کی کسی بات کا بُرا نہیں مانا تھا، میں نے جواب دیا۔ کیا واقعی آپ کا نام شان ہے؟ جی ہاں! میں نے جواب دیا۔ کیا شان آپ کا خاندانی نام ہے یا پہلا، ڈالیا نے پوچھا تو میں نے جواب دیا، میرا نام شان سے شروع ہو کر شان ہی پر ختم ہوتا ہے۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو رہی تھیں اس لیے میں اب ڈالیا کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سفید نائٹ گاؤن میں ملبوس میرے پیچھے بالکل میری طرح آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھی تھی۔ مٹی سے گاؤن میلا ہو جائے گا آپ بستر پر بیٹھ جائیں، میں نے کہا تو اس نے جوابدیا، جی نہیں، میں یہاں ٹھیک ہوں۔

مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے کہ آپ نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر میرا مذاق نہیں اڑایا تھا اور میں آپ سے معافی بھی مانگتا ہوں کہ میرے دفاع میں آپ کو جان کی تانہ زنی سہنا پڑی تھی، میں نے کہا۔ آپ کو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جان گھٹیا ذہنیت کا مالک ہے۔ جب میں نے آپ کو پہلی بار سندر بن کے ڈیرے پر دیکھا تھا تو آپ کی آنکھوں سے جھلکتی ہوئی ذہانت مجھ سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اس لیے میں نے جان کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے میری کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ ڈالیا نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد پوچھا، میں آپ کی تنہائی اور عبادت میں مخل ہو کر آپ کو خواہ مخواہ بور تو نہیں کر رہی؟ کسی کے ساتھ گزرا ہوا اچھا وقت تنہائی کی عبادت سے بہتر ہوتا ہے، میں نے جواب دیا۔ آپ کا اندازِ گفتگو فلسفیانہ ہے، ڈالیا مسکرا کر بولی۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کو کس فلسفی نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟ فلسفی نہیں، انسان کو فلسفہ متاثر کرتا ہے، میں نے جواب دیا۔

باتیں کرتے ہوئے ڈالیا کی پیٹھ دیوار کے اُس سوراخ کی جانب تھی جہاں سے گزر کر ہم صبح دارالشکوہ کے کمرے میں گئے تھے۔ جبکہ میرا رخ ڈالیا کی طرف ہونے کی وجہ سے اسی جانب تھا۔ ہماری باتوں کے دوران کالی میری گود میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور ہولے ہولے پھنکارنا شروع کر دیا۔ میں اس کی غصیلی اور پیار بھری پھنکار کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کالی کو میں نے اس انداز میں پھنکارتے ہوئے نواب ادریس کے ہاں قبر سونگھ کر سنا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ڈالیا کو آگاہ کرتا یا کالی کی غصیلی پھنکار کا نوٹس لیتا کالی میری گود سے ڈالیا کی جانب اچھلی لیکن کالی کا ٹارگٹ ڈالیا کے پیچھے تھا۔ وہ اڑتے ہوئے ڈالیا کے پیچھے جا گری۔ کالی کو اب سے پہلے میں نے اس تیزی سے رینگتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے بتی جلا کر دیکھا کہ کالی ڈالیا کے پیچھے دارا کے کمرے کی دیوار کے سوراخ میں گھس رہی تھی۔ میں بھی ٹارچ لے کر کالی کے پیچھے دوڑا اور دارالشکوہ کے کمرے میں داخل ہوا تو میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کمرے کی چھت سے ایک شیش ناگن لٹکی تھی جس کا آدھا دھڑ چھت کے سوراخ میں تھا اور آدھا بستر کے اوپر ہوا میں لٹکا تھا۔ نیچے سے چھ سات کریٹ سانپ اس پر چہار جانب سے حملہ آور تھے۔ کالی شیش ناگن کے دفاع میں کریٹ سانپوں سے بھڑ گئی۔ میں نے ایک ایک کر کے کریٹ سانپ پکڑ کر شیش ناگن کے جسم سے علیحدہ کیے اور انہیں اسی ڈرم میں جہاں صبح والے سانپ رکھے تھے ڈال کر ڈرم کا منہ بند کر دیا اور ناگن کی جانب متوجہ ہوا جو چھت سے اپنا جسم سمیٹ کر نیچے آ کر میرے اور کالی کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ یہ ناگن مجھ سے ملنے آنا چاہ رہی تھی لیکن کریٹ سانپ اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ ناگن کے پھن پر کسی برص کے مریض کی طرح سفید داغ تھے۔ میں نے اسی وقت اس کا نام برصہ تجویز کر لیا۔ اس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر میرے بوسے لینا شروع کر دئے۔ مجھ سے گلے ملنے کے بعد ناگن نے اپنا منہ میرے پیچھے کی جانب کر دیا۔

مڑ کر دیکھا تو ڈالیا میرے پیچھے محوِ حیرت سانپوں کا انسان سے پیار بھرا ملاپ دیکھ رہی تھی۔ برصہ کا منہ ڈالیا کی جانب تھا لیکن اس کی لپیٹیں میرے جسم پر تھیں اور وہ مجھے لپیٹوں کی طاقت سے ڈالیا کی جانب دوستانہ انداز میں گھسیٹ رہی تھی۔ مجھے وہ نقشہ یاد آیا جب گورا میرے ہاتھوں سے نکل کر انکل اکرام کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ ڈالیا کی جانب شیش ناگن کو بغیر کسی تمہید کے بھیجنا خطرناک بھی ہوسکتا تھا اس لیے میں نے پوچھا، ڈالیا جی، کیا آپ کو سانپوں سے ڈر لگتا ہے؟ اس نے حیرت کی کیفیت سے نکل کر جواب دیا، سانپوں سے کسے ڈر نہیں لگتا لیکن آپ کی موجودگی نے میرا سانپوں کا ڈر ختم کر دیا ہے۔ میں نے کہا، یہ ناگن آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ آپ کچھ حرکت کرنے کی بجائے اس کا اپنے ساتھ ردِعمل دیکھیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی نیت آپ کو نقصان پہنچانے کی نہیں ہے۔ مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے، اس نے جواب دیا تو میں نے کہا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو آہستہ آہستہ میرے قریب آنا شروع کر دیں۔ وہ بولی، آپ کی موجودگی میں ایک سانپ تو کیا میں سانپوں کی کچھاڑ میں گھسنے سے نہیں گھبراؤں گی۔ یہ کہتے ہوئے ڈالیا ایک لمبا قدم بھر کر میرے قریب آ گئی اور برصہ نے اپنا منہ اس کے چہرے کے برابر اٹھا کر اپنی زبان سے ڈالیا کا گال چھوا۔ برصہ اپنا جسم ڈالیا کے جسم سے لپیٹ کر بالکل ایسے اٹھکیلیاں کرنے لگی جیسے گورا اور کالی اکرام اور جینا سے کیا کرتے تھے۔ پھر اس نے ڈالیا کا منہ چومنا شروع کر دیا۔ یہ آپ کا بوسہ لے رہی ہے، میں نے ڈالیا کو بتایا تو اس نے بھی جواباً برصہ کا بوسہ لیا۔ ابتدائی حالات کے مطابق میں سمجھا تھا کہ برصہ مجھے ملنے آئی ہے لیکن اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ڈالیا سے ملنے آئی تھی۔ اب مجھے یہاں اپنی موجودگی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی تھی۔ لگتا تھا مجھے بڑے بابا نے یہاں ڈالیا کی وجہ سے بھجوایا تھا اور برصہ اس جگہ میری نہیں ڈالیا کی منتظر تھی۔ میرا کام ان دونوں کو ایک دوسرے سے دوستانہ ماحول میں ملانے کا تھا۔ اگر میری عدم موجودگی میں یا دوسرے لوگوں کی موجودگی میں برصہ ڈالیا کے پاس جانے کی کوشش کرتی تو نہ ڈالیا اسے اپنے پاس آنے کی اجازت دیتی اور نہ ہی ڈالیا کے ساتھی دنیا کے اتنے بڑے اور خطرناک ترین سانپ کو اُس کے قریب پھٹکنے دیتے اور اس افراتفری میں برصہ ماری جاتی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کھیلتا دیکھ کر مجھے جینا اور کالی کی پہلی ملاقات کا منظر یاد آ گیا۔ ڈالیا اور برصہ یقیناً کسی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اگر میں ڈالیا کو یہ سب کچھ بغیر کسی تمہید کے بتا دیتا تو بات اس کی فہم سے بالاتر ہوتی۔ مجھے اپنا کردار کافی محتاط ہو کر ادا کرنا تھا۔ اس لیے میں نے کالی کے سر پر اپنے ہونٹ رکھے اور ہولے سے کہا، اب تم برصہ کے ساتھ یہاں رہو گی اور اسے بتاؤ کہ میں ڈالیا کی ہر ممکن مدد کروں گا اور اس وقت تک اس کا ساتھ دوں گا جب تک اسے میری ضرورت ہو گی۔ کالی میری بات سن کر میرے بدن سے رینگتی ہوئی برصہ کے منہ برابر ہو گئی۔ دونوں کی زبانیں ملیں تو دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر چلتے ہوئے چھت کے اسی سوراخ میں واپس چلے گئے جہاں پر میں نے برصہ کو لٹکا ہوا دیکھا تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد میں نے ڈالیا کو دیکھا تو وہ ابھی تک اپنے ساتھ پیش آنے والے غیر مرئی تجربات سے گنگ تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑے ٹارچ کی روشنی میں واپس اپنے کمرے میں لایا اور اسے اپنے بستر پر بٹھا دیا۔ اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟ میں نے پوچھا۔ وہ تیزی سے سانس لیتے ہوئے بولی، اوہ خدایا، کیا بتاؤں! مجھے یہ سب کچھ ہالی وڈ کی کسی فلم کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ آپ کی وجہ سے دنیا کا خطرناک ترین سانپ میرا منہ چوم رہا تھا۔ اگر میں سے بتا دیتا کہ یہ سانپ میری وجہ سے نہیں کسی اور وجہ سے اس کا منہ چوم رہا تھا تو بات شاید اس کی سمجھ میں نہ آتی۔ اس لیے میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں کچھ بتانے کی بجائے وقت کے ساتھ ڈالیا پر یہ پردے کھولنا شروع کروں گا۔ یہ سوچ کر میں نے کہا، اگر آپ آج رات پیش آنے والے اس تجربے کو اپنے تک محدود رکھیں تو مجھے خوشی ہو گی۔ ڈالیا کا گلابی چہرہ جذبات سے سرخ تھا جب اس نے جواب دیا، اگر میں کسی اور کو بتاؤں گی بھی تو کوئی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ سائنسی دور کے پروردہ ہونے کی وجہ سے ہم لوگ ہر واقعہ سائنس کے ترازو میں تولتے ہیں اور تجربات کی زبان سے سمجھتے ہیں۔ اگر میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا اور اگر میں خود ابھی ابھی اس تجربے سے نہ گزری ہوتی تو میں بھی ایسا واقعہ کسی اور سے سن کر اسے یک قلم مسترد کر دیتی۔ ایسی باتیں ہمارے ہاں صرف الف لیلیٰ کی داستانوں یا ہالی وڈ کی فلموں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مافوق الفطرت حقائق ہم اپنی زندگیوں سے کسی حرفِ غلط کی طرح خارج کر دیتے ہیں۔ زندگی کے اس تجربے نے مجھے ابھی تک یقین اور غیر یقینی کے تذبذب میں رکھا ہوا ہے۔ میری نیند کافور ہو چکی ہے اور میں خود کو ہوا کے دوش پر اڑتا محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے کہا اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھوں میں مراقبہ کر لیں تو آپ کا ذہن ہلکا ہو کر خود بخود سو جائے گا اور آپ کو نیند آ جائے گی۔ کیا آپ مجھے ہپناٹائز کرنا چاہتے ہیں؟ اس نے پوچھا۔ اگر میں ہپناٹائز کروں گا بھی تو آپ کی حرمت کو آنچ نہیں آنے دوں گا، میں نے کہا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا، مجھے اس شخص سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے جس نے اپنی لنگی پھاڑ کر میرا ننگا بدن ڈھانپا تھا۔ میں نے اب سے پہلے کبھی مراقبہ نہیں کیا۔ اگر آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہو گا تو میں بخوشی کروں گی۔ ہم آپ کے خیمے میں چلتے ہیں تاکہ آپ وہیں سو جائیں میں نے کہا۔ چلیں، وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ہم باہر نکل کر اس کے خیمے میں آئے۔ میں نے اسے بستر پر لٹایا اور کہا، اب آپ میری آنکھوں میں دیکھیں۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، آپ کی آنکھیں اندھیرے میں ہیروں کی طرح دمک رہی ہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں سہلانا شروع کر دیں۔ ہماری نظریں ٹکرائیں اور کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا تو میں اس کے جسم پر چادر ڈال کر خیمے سے نکلا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

معلوم نہیں رات کو میں کب سویا تھا لیکن صبح جلدی آنکھ کھلی۔ کالی میرے پاس نہیں تھی۔ آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ نہ جانے برصہ کا ڈالیا سے کیا رشتہ ہے۔ کیا وہ اس کی ماں ہے یا کوئی رشتہ دار ہے۔ ڈالیا کی عمر کسی طرح بھی پچیس سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ برصہ نہ جانے کب سے یہاں ہے اور وہ کن حالات میں یہاں پہنچی تھی؟ میرے ذہن میں سوالات تو بہت تھے لیکن جوابات کے لیے وقت درکار تھا۔ دیوتاؤں نے مجھے ان دونوں کے ملاپ کے لیے چنا ہے تو باقی راستہ بھی خود بخود نکل آئے گا۔ مجھے سب سے پہلے ڈالیا کے بارے میں کچھ جاننا چاہیے پھر بات آگے بڑھے گی۔ مجھے یقین تھا کہ ڈالیا مجھے اپنے بارے میں بتانے سے گریز نہیں کرے گی۔ اس کے بارے میں جاننے کے بعد میں آگے کی سوچوں گا۔ سریت کی آواز نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر نکالا۔ وہ میرے بستر کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا شمان بابو، سب لوگ ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور کھڑے ہو کر کہا تو چلیں۔ ہم چار خیموں کی قطار میں پہلے خیمے میں گئے جہاں جان، سٹیو اور ڈالیا بیٹھے تھے۔ درمیان کی میز پر انڈوں کی آملیٹ، ٹوسٹ اور مکھن کا ناشتا رکھا تھا۔ میں نے صبح کا سلام کیا اور سب سے کہا، مکھن کے بغیر آپ سب کچھ کھا سکتے ہیں۔ مکھن پر صرف آج کے دن کے لیے پابندی ہے۔ ناشتے کے دوران میں نے سب سے پوچھا، رات نیند کیسی آئی تھی؟ بھئی مجھے تو رات شراب پیے بنا پہلی بار مزے کی نیند آئی تھی، جان بولا۔ اور مجھے جان کے خراٹوں کے علاوہ رات کو کسی چیز نے بے آرام نہیں کیا، سٹیو ہنس کر بولا۔ ڈالیا نے مسکراتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں گرہ لگائی اور آپ نے رات مجھے اپنے جیون کی سب سے میٹھی نیند اور ایک سہانا سپنا دیا ہے جس کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔

اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں، میں نے سب سے پوچھا تو جان نے جواب دیا۔ میں تو اب کانٹوں کی چبھن کے علاوہ اپنے بدن پر کچھ محسوس نہیں کر رہا۔ سٹیو بولا، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ سٹیو کی ٹانگوں پر سانپ نے کاٹا تھا اس لیے ناشتے کے بعد میں نے اسے کہا، میں آپ کے زخم پر کانٹے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سٹیو نے اپنا ڈھیلا پاجامہ اٹھایا۔ اس کے جسم میں گڑے چاروں کانٹے سبزی مائل رنگ بدل کر سرخی مائل ہو چکے تھے۔ میں نے ایک کانٹا نکال کر انہیں دکھاتے ہوئے بتایا، یہ کانٹا زہر چوس کر اپنا رنگ بدل چکا ہے۔ اب آپ کانٹے اپنے جسم سے نکال سکتے ہیں۔ جان نے کہا، مجھے اپنے تمام کپڑے اتار کر کانٹے نکالنے کے لیے تمہاری مدد چاہیے ہوگی اور اس لیے اگر باقی لوگ باہر چلے جائیں تو میں بھی شمان جی کی مدد سے کانٹے نکال لوں۔ سٹیو، ڈالیا اور سریت اٹھ کر باہر نکلے، جان نے انڈرویئر کے علاوہ اپنے جسم سے کپڑے اتارے اور میں نے اس کے جسم سے کانٹے نکالے۔ اس نے کپڑے پہنتے ہوئے مجھے کہا، آج تم بازار جا کر اپنے لیے کچھ کپڑے لے لو۔ ٹھیک ہے، میں نے جواب دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر نکلا تو سیرت مجھے باہر ہی مل گیا۔ اس نے بھی سب سے پہلے مجھ سے کپڑوں کے بارے میں پوچھا تو میں نے جواب دیا، آپ کے پاس جب بھی وقت ہوگا ہم بازار جا کر کپڑے لے آئیں گے۔ تو ابھی چلتے ہیں، مجھے تیار دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ باہر نکل کر ہم جیپ میں بیٹھ گئے اور سریت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ بنے بنائے کپڑوں کی ایک دکان پر گاڑی روک کر سریت نے کہا، آپ جو بھی لینا چاہیں بلا جھجک اور پیسوں کی پروا کیے بغیر لے لیں۔ جان اور سٹیو نے مجھے آپ پر خرچ کرنے کی کھلی چھٹی دی ہے۔ میں نے دکان سے اپنے لیے کرتے پاجامے، رات کے کپڑوں کے علاوہ جینز کی پتلون، قمیص، جوتے، انڈرویئر اور جرابیں لیں۔ پھر دوسری دکان سے اپنے لیے شیو کے سامان کے علاوہ برش، ٹوتھ پیسٹ اور صابن بھی لیا۔ وہاں سے نکل کر ایک حمام والے حجام کی دکان پر گئے جہاں سے میں نے سر کے بال ترشوائے اور شیو بنوائی اور چہرے پر ہلکی ہلکی موچھیں رہنے دیں۔ پھر میں حمام میں گھس گیا نہا دھو کر دانت صاف کیے اور جینز کی پتلون اور سوتی قمیص پہن کر باہر نکلا تو سریت نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا، بھگوان قسم اب آپ کو وہاں کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔

حجام کی دکان سے اترتے وقت سریت کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ پاؤں میں موچ کی وجہ سے اس کے لیے چلنا مشکل ہو گیا اس لیے میں اسے سہارا دے کر گاڑی تک لایا تو وہ بولا، ہمیں فون کر کے کسی ڈرائیور کو بلوانا پڑے گا کیونکہ میں درد کی وجہ سے گاڑی نہیں چلا سکوں گا۔ میں نے جواب دیا، آپ فکر نہ کریں میں گاڑی چلا کر لے جاؤں گا۔ وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتا ہوا حیرت سے بولا، کیا تمام شمان آپ کی طرح ہر فن مولا ہوتے ہیں؟ میں نے جواب دیا، مجھے معلوم نہیں۔ گاڑی آگے بڑھائی تو سریت کہنے لگا، اگر آپ برا نہ مانیں تو میں چند ذاتی سوال پوچھوں؟ میں نے جواب دیا، پوچھیں۔ وہ بولا آپ شکل وصورت سے، بول چال سے، رکھ رکھاؤ سے اور ہر لحاظ سے کسی بڑے خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود بنوں بی بی کے ڈیرے پر کیوں رہ رہے تھے؟ میں نے کہا، کاش میرے پاس آپ کے سوال کا جواب ہوتا۔ بعض اوقات بھگوان کسی خاص وجہ سے ہمیں کہیں لاتے، رکھتے اور لے جاتے ہیں۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے وہ بولا، اگر آپ نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن ایک بات ہے کہ آپ نے تینوں امریکیوں کو جیون دے کر گویا خرید لیا ہے۔ آج صبح آپ کے آنے سے پہلے وہ تینوں آپ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جان اور سٹیو آپ کو اپنا گرو مان چکے ہیں۔ کل وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ اب میں کوئی کام آپ سے اجازت لیے بغیر نہ کروں۔ اور ڈالیا اپنے سوتیلے باپ سے آپ کے بارے میں بڑے میٹھے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ ڈالیا کا سوتیلا باپ کون ہے؟ میں نے حیرت سے پوچھا تو سریت بولا، سٹیو ڈالیا کا سوتیلا باپ ہے۔

باتوں کے دوران سریت مجھے واپسی کی راہ بھی بتاتا رہا۔ منزل پر پہنچ کر میں نے گاڑی خیموں کے پاس روکی اور سریت کو سہارا دے کر گاڑی سے اتار

کر خیمے کی جانب بڑھا۔اس کا خیمہ ڈالیا کے خیمے کے بعد آتا تھا۔ڈالیا کا خیمہ کھلا تھا اور وہ اپنے خیمے میں میز کے پیچھے ایک کرسی پر بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔اس نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا پھر اس نے غیر یقینی کے عالم میں مجھے دیکھا۔میری آنکھوں پر آ کر اس کی آنکھیں رک گئیں وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور وہ بولی، کیا یہ واقعی آپ ہیں۔جی ہاں! یہ بھی میرا ایک روپ ہے ڈالیا جی، میں نے مسکرا کر کہا۔میں نے آپ کی آنکھوں سے آپ کو پہچانا ہے۔اگر آپ دھوپ والی عینک لگا کر آتے تو میں کبھی نہ پہچان سکتی۔آپ کا یہ روپ بہت ہی بھاؤنا ہے۔خدا کی قسم آپ اس روپ میں شہزادے لگ رہے ہیں۔میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ ہی ہم تینوں سریت کے خیمے میں داخل ہوئے۔سریت کو بڑی احتیاط سے بستر پر بٹھا کر میں نے اس کے پاؤں سے جوتا اتار کر پوچھا آپ کو کہاں موچ آئی ہے؟ اس نے اپنے ٹخنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہاں۔لیکن اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔میں نے کہا، آپ یہاں بیٹھیں میں ایک بالٹی میں ٹھنڈا پانی لے کر آتا ہوں۔آپ ٹھنڈے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ جائیں۔اگر کچھ منگوانا ہو تو باہر جانے کی بجائے مجھے آواز دیں۔میں آپ کے لیے لے آؤں گا اور میں رات کو بھی آپ کے قریب رہوں گا۔آپ کے لیے قریب ہی ایک چھوٹا خیمہ گاڑ دیا گیا ہے پیچھے سے آتی ہوئی ڈالیا نے مجھے بتایا۔باہر نکل کر ایک بالٹی میں ٹھنڈا پانی لے کر آیا اور سریت کی ٹانگ کو آہستہ سے اٹھایا اور اس کا پاؤں بالٹی کے ٹھنڈے پانی میں رکھ کر کہا، اب آپ آرام کریں۔

ڈالیا اس عرصے میں مجھے دیکھتی رہی۔مجھے فارغ دیکھ کر بولی، چلیں! میں جان اور سٹیو کو آپ کا نیا روپ دکھا لاتی ہوں۔چلیں! میں اس کے ساتھ چل پڑا۔وہ مجھ سے چند قدم آگے چلتی ہوئی جان کے خیمے میں داخل ہو کر بولی، کیا آپ اس خوبصورت نوجوان کو پہچانتے ہیں؟ مجھے غور سے دیکھ کر سٹیو بولا، بھئی لباس اور بالوں نے تم میں کمال کی تبدیلی کی ہے۔جان بولا، معاف کرنا میں تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔شکریہ کہہ کر خیمے میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا اور دوسری پر ڈالیا تو سٹیو نے کہا، ہم دونوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں معاوضے پر مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیں۔میں نے جواب دیا، میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا۔میں آپ کے ساتھ بغیر معاوضے کے کام ضرور کروں گا اور اپنا کام کرنے کے بعد واپس سندر بن چلا جاؤں گا۔چلو معاوضہ نہ سہی ہم تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھیں گے۔اگر تمہیں کسی شے کی ضرورت ہو تو ہم میں کسی سے بھی کہہ سکتے ہو، جان بولا۔مجھے منظور ہے۔میں نے ملانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔سٹیو کے بعد جان نے بھی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ایسے میں باورچی نے دوپہر کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔میں نے اسے بنگالی میں کہا، سریت کے پاس کے خیمے میں علیحدہ سے کھانا لے جانا۔جی اچھا کہہ کر اس نے ہمارے لیے کھانا لگایا۔

کھانے کے بعد جان بولا، تمہارے خیال میں ہمیں نیچے کب جانا چاہیے۔میں نے جواب دیا، میں آج اکیلا وہاں جا کر آس پاس اچھی طرح چھان بین کرتا ہوں۔اگر کوئی سانپ وانپ ہوا تو وہاں سے ہٹا دوں گا۔کل صبح آپ لوگ تسلی سے وہاں جائیں۔سٹیو بولا، تو ٹھیک ہے تم جاؤ۔وہاں سے نکل کر میں کمرے میں آیا تو پیچھے سے ڈالیا آ کر بولی، اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں بھی آپ کے ساتھ نیچے جانا چاہتی ہوں۔معلوم نہیں وہاں کتنے سانپ ہوں گے، اس لیے اگر آپ کچھ وقت انتظار کر لیں تو مناسب ہوگا۔میں نے کہا تو وہ بولی، مجھے آپ کی موجودگی میں سانپوں سے بالکل ڈر نہیں لگتا اور میں نے سٹیو سے اجازت بھی لے لی ہے۔میں نے کہا، بات ڈر کی ہے اور نہ ہی اجازت کی۔بات اَن دیکھے ماحول کی ہے۔جہاں تک میری بات ہے تو میں خود کو اَن دیکھے ماحول میں سنبھال سکتا ہوں لیکن اگر مجھے ایسے ماحول میں اپنے علاوہ آپ کو بھی سنبھالنا پڑا تو میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔آپ آج مجھے وہاں تنہا جانے دیں۔میں تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر اور ماحول سے شناسائی پیدا کرنے کے بعد آپ کو لے جاؤں گا۔اگرچہ ڈالیا کو میری بات بُری لگی تھی اس کے باوجود اس نے ضد نہیں کی تھی۔

اپنے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچ لیے نیچے اترا۔وہاں کریٹے سانپوں کے چند باقیات دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ کالی اور برصہ وہ کام کر رہے تھے جو میں کرنے گیا تھا۔یعنی دونوں نے کریٹ سانپ کھا کھا کر اپنی بھوک مٹائی تھی۔میں نے کالی سے کہا، یہاں کوئی اور سانپ تو نہیں ہیں؟ اس نے برصہ کی جانب دیکھا جیسے اس سے پوچھ رہی ہو۔برصہ نے اس سوراخ کی جانب میری توجہ دلائی جس کو میں نے ڈرم رکھ کر بند کر دیا تھا۔میں نے ڈرم کھسکایا اور نیچے دیکھا تو مجھے ٹارچ کی روشنی میں کچھ نظر آیا۔پھر ایک اور اینٹ ہٹا کر نیچے دیکھا تو مجھے وہاں چند سانپ نظر آئے، میں نے کالی سے کہا تم برصہ کے ساتھ اندر جا کر ان سانپوں کو پکڑ پکڑ کر یہاں لاؤ۔دونوں تیزی سے نیچے گئے۔وہ اپنے منہ میں سانپ پکڑ پکڑ کر لے آتے اور میں ان کے منہ سے نکال کر انہیں ڈرم میں رکھتا جاتا۔

چند اور اینٹیں ہٹانے کے بعد فرش کا سوراخ کچھ اور کھلا۔نیچے دیکھنے میں آسانی ہوئی تو وہاں مجھے سانپوں کے انڈے نظر آئے۔تیزاب سانپوں کے انڈوں کو مارتا ہے اور تیزاب سے مستقبل میں اس مقام پر سانپوں کی پیدائش کا خطرہ بھی ٹل جاتا ہے۔وہاں سے نکل کر باہر خیموں میں آیا اور سریت سے تیزاب کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔حفاظتی سامان میں گندھک کے تیزاب کا ایک گیلن پڑا ہے۔میں نے وہاں جا کر تیزاب اٹھایا اور نیچے جا کر انڈوں پر ڈالا۔تیزاب کی بُو پھیلی تو میں وہاں سے نکل کر ایک بار پھر سریت کے پاس آیا اور اس سے پوچھا میں نے نیچے سانپ کے انڈوں پر تیزاب ڈال دیا ہے۔اب میں چاہتا ہوں کہ آج کی رات وہاں پنکھوں سے تیزاب کی بُو مارنے کے علاوہ تازہ ہوا داخل کی جائے۔کیا ہمارے پاس کچھ پنکھے ہیں؟ ہاں ہیں، اس نے جواب دیا۔مسجد کے باہر والے ایک کمرے کو ہم نے گودام کے طور پر کرائے پر لیا ہے وہاں

آپ کو پنکھے مل جائیں گے۔ جہاں لگوانے ہیں مزدوروں سے کہہ کر لگوالیں۔ وہاں سے نکل کر گودام میں گیا، تین پنکھے نکالے اور ان کے ساتھ بجلی کی لمبی لمبی تاریں بھی نکالیں۔ سرنگ سے لے کر دارالشکوہ کے کمرے تک تین مختلف جگہوں پر پنکھے لگانے کے بعد انہیں چلا دیا۔ یہ کام کرتے کرتے سورج ڈھل چکا تھا۔ میں واپس جان کے خیمے میں گیا تو سریت وہاں بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی بولا، پاؤں کی موچ ٹھیک ہوگئی ہے۔ چلو شکر ہے، میں نے جواب دیا۔ میں نے سب کو اپنی کارگزاری سنانے کے بعد کہا، آپ لوگ کل صبح سے اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔ چونکہ میرا کام آپ کے ہاں ختم ہوگیا ہے اس لیے میں جلد واپس سندر بن جانا چاہتا ہوں۔ سٹیو بولا، بھئی ہم تو سمجھے تھے کہ تم ہمارے ساتھ اس وقت تک رہو گے جب تک ہمارا کام ہندوستان میں ختم نہیں ہو جاتا۔ آپ کا کام یہاں کب ختم ہوگا؟ میں نے سٹیو سے پوچھا تو وہ بولا، اس جگہ ہمارا کام دو تین دن کا ہے۔ اس کے بعد ہمیں کچھ اور تاریخی مقامات پر کھدائی کرنی ہے جہاں چھ ماہ کا کام ہوگا۔ اگر تم اگلے چھ ماہ ہمارے ساتھ رہ جاؤ تو مہربانی ہوگی۔ میں نے جواب دیا، چلیں میں کم از کم یہاں پر کھدائی کے اختتام تک آپ کے پاس رہ جاتا ہوں۔ آئندہ کے بارے میں بعد میں سوچوں گا۔

عشائیے کے بعد میں اپنے خیمے میں جا کر سوچنے لگا۔ اب مجھے برصہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھانا تھا اور مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے؟ میرے پاس یہ کام کرنے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو ڈالیا سے اس کے خاندان کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کروں۔ دوسرا اپنے طور پر کچھ تحقیق کروں۔ میں ڈالیا سے خواہ مخواہ ذاتی سوالات نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے دوسرا طریقہ مجھے پسند آیا تھا۔ اپنے طور پر تحقیق کرنے کے لیے میں نے سوچا کہ نیچے جا کر کالی کی مدد سے برصہ سے پوچھوں کہ اسے میری کس طرح کی مدد درکار ہے تو بہتر ہوگا۔ یہ کام کرنے کے لیے میرے پاس آج رات تھی۔ خیمے سے نکل کر کمرے میں گیا جہاں پنکھے ابھی تک چل رہے تھے لیکن تیزاب کی بُو مدہم ہو چکی تھی اس لیے میں نے پنکھے بند کر دئے۔ ابھی میں ٹھیک سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ ڈالیا اپنے ایک ہاتھ میں کینوس اور دوسرے میں پینسلوں کا بنڈل اٹھائے داخل ہوئی تو میں نے پوچھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ مصور بھی ہیں۔ وہ بولی، مصوری میرا شوق ہے۔ پھر اس نے کہا، میں نیچے جا کر اس سانپ کی تصویر بنانا چاہتی ہوں جس نے میرا بوسہ لیا تھا۔ میں نے جواب دیا، بالکل جائیں۔ اب وہ جگہ سانپوں سے پاک اور محفوظ ہے۔ اب یہاں صرف کالی ہے اور برصہ ہیں۔ برصہ، کیا مجھے چومنے والی ناگن کا نام برصہ ہے؟ اس نے پوچھا۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا تو اس نے میری جانب دیکھ کر کہا، پلیز آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ تو چلیں، میں نے ڈالیا سے کہا۔ ہم دونوں اندر گئے تو میں نے برصہ اور کالی کو آواز دی۔ دونوں چھت کے سوراخ سے نیچے آئے تو میں نے برصہ سے کہا، ڈالیا تمہاری تصویر بنانا چاہتی ہے۔ تم سامنے بیٹھ جاؤ۔ برصہ میرا کہنا مان کر بیٹھی تو ڈالیا موم بتی روشن کرتے ہوئے بولی، دراصل کل اس ناگن نے میرا دل موہ لیا تھا۔ رات کو اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سوئی تو میں نے خواب میں اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے میں صبح آنا چاہتی تھی لیکن آپ نے منع کر دیا تھا۔ کل رات سے اب تک میں اس سے ملنے کو ترس رہی تھی۔

آپ تصویر مکمل کریں میں درمیان میں مخل ہونے کی بجائے اوپر جاتا ہوں، میں نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ آپ بھی میرے پاس یہیں رُک جائیں پلیز، وہ بولی۔ اچھا میں یہ کہہ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کچھ وقت تک برصہ کا خاکہ بناتی رہی پھر اٹھتے ہوئے بولی چلیں خاکہ مکمل کر لیا ہے، تصویر بعد میں مکمل کر لوں گی۔ برصہ میرے پاس آئی تو میں نے اسے کالی کے پاس جانے کو کہا۔ ڈالیا حیرت سے بولی۔ یہ سانپ آپ کا کہنا ایسے مان رہے ہیں جیسے سدھائے ہوئے جانور مالک کا کہنا مانتے ہیں۔ چلو ایک تو آپ کا سدھایا ہوا ہے لیکن برصہ تو جنگلی ہے۔ یہ بھی آپ کا کہنا ایسے مان رہی ہے جیسے سدھائی ہوئی ہو۔ میں جواب میں اس سے کہنے لگا تھا کہ یہ آپ کی وجہ سے میرا کہنا مان رہی ہے لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے خاموش رہا۔ وہ بولی، میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ سانپ بھی سدھائے ہوئے جانوروں میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا، سانپ کا دماغ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے اس لیے یہ نہیں سدھایا جا سکتا۔ وہ بولی، تو پھر یہ آپ کی بات کیسے مانتے ہیں۔ میں نے برصہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، آپ اسے کچھ کہہ کر دیکھیں، برصہ آپ کا بھی ہر کہنا مانے گی۔ اس نے مجھے بے یقینی کے عالم میں دیکھتے ہوئے برصہ سے کہا، چلو اپنی دُم پر کھڑی ہو کر میرا گال چومو۔ برصہ نے اس کے حکم پر عمل کیا تو ڈالیا گہری سانس لے کر بولی، خدا کی قسم آپ سانپوں کے جادوگر ہیں۔ ایک نہ سدھائے جانے والی دنیا کی خطرناک مخلوق کسی غلام کی طرح آپ کا حکم مان رہی ہے۔ کیا دنیا کے تمام سانپ شمانوں کا کہنا ایسے مانتے ہیں جیسے یہ آپ کا مان رہے ہیں؟ میں نے سادگی سے جواب دیا، مجھے معلوم نہیں۔

وہاں سے نکل کر ہم اوپر آئے تو ڈالیا جذبات سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے بستر پر بٹھا کر پوچھا، آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ اس نے جذبات سے سرخ چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مسلتے ہوئے کہا، مجھے یہ سب کچھ کسی اور دنیا کی کہانی لگتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنے الفاظ کا چناؤ کیسے کروں؟ اچھا، آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے ٹھنڈا پانی لاتا ہوں، میں یہ کہہ کر مڑا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا، مجھے ٹھنڈے پانی کی نہیں آپ کی ضرورت ہے۔ بس آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس بیٹھ جائیں۔ میں چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ گیا تو اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا، کچھ دیر کے لیے مجھے اپنی بانہوں میں تھام لیں۔ میں نے اس کی خواہش کی تعمیل کی۔ وہ کافی دیر تک میری بانہوں کے ہالے میں بیٹھی گہرے سانس لیتی رہی اور میں خاموشی سے اس کے دل کی دھڑکن سنتا رہا۔ میری بانہوں میں اس کی کپکپی بند ہوگئی اور اس

کے سانسوں کی روانی اعتدال پر آ گئی۔ اس نے میرے کندھے سے سر اٹھایا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا، میرے قدم بے جان ہو رہے ہیں۔ آپ مجھے سہارا دے کر میرے خیمے تک چھوڑ آئیں پلیز۔ اسے اپنے سہارے اٹھایا اور ہم کمرے سے نکل کر اس کے خیمے کی جانب بڑھے۔ چلتے وقت ڈالیا نے اپنا بازو میری کمر کے گرد حائل کیا ہوا تھا اور سر میرے کندھے پر رکھے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے ایسے چل رہی تھی جیسے کوئی نشے کی حالت میں کسی کے سہارے چلتا ہے۔ سریت اپنے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ ہم دونوں کو اس حالت میں چلتا دیکھ کر اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکراتا ہوا اپنے خیمے میں چلا گیا۔ میں نے ڈالیا کو اس کے بستر پر لٹایا اور اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ کچھ دیر تک اس کی کنپٹیاں مسلتا رہا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑا تو میں اس کے خیمے کا پردہ تان کر واپس اپنے خیمے میں سونے کے لیے جانے لگا لیکن مجھے یاد آیا کہ ڈالیا کے جذبات کی رو میں اپنا کینوس دارالشکوہ کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ جان اور سٹیو کل صبح کھدائی کا کام شروع کر دیں گے اور اگر انہوں نے وہ کینوس وہاں دیکھا تو نہ جانے کیسے کیسے سوالات کریں۔ یہ سوچ کر میں واپس نیچے گیا اور بغیر توجہ دیے کینوس اٹھا کر باہر نکلا اور اسے ڈالیا کے خیمے کے ایک کونے میں آہستہ سے رکھ کر اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔

دوسری صبح حسبِ عادت میری آنکھ جلدی کھلی۔ دانت صاف کیے کپڑے بدلے اور خیمے سے نکلا تو سریت کی آنکھوں کو اپنے خیمے کا طواف کرتے ہوئے پایا۔ مجھے نکلتا دیکھ کر وہ میری جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر رات والے واقعے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھی تک رقصاں تھی لیکن اس نے مجھ سے اس بارے میں استفسار نہیں کیا۔ بولا، شان جی ہم ناشتے پر آپ کے منتظر ہیں۔ ہم دونوں جان کے خیمے میں گئے۔ ڈالیا وہاں نہیں تھی۔ ناشتے کے دوران سٹیو نے بتایا کہ ڈالیا کی طبیعت ناساز ہے تو میں نے سریت کی جانب دیکھتے ہوئے انہیں بتایا، جی ہاں! اس کی طبیعت کل رات بھی ٹھیک نہیں تھی۔ رات میں اسے سہارا دے کر خیمے میں چھوڑ گیا تھا۔ جان اور سٹیو نے دارا کے کمرے کے بارے میں پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ وہ جگہ اب سانپوں سے اور باقی تمام مضمرات سے محفوظ ہے۔ اب آپ وہاں جو چاہیں کریں۔ اگر میری ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔ ٹھیک ہے تو ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں، یہ کہہ کر وہ تینوں اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں ڈالیا کے خیمے کے قریب جا کر کھنکارا۔ پھر ہولے سے کہا، ڈالیا جی کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔ آ جائیں، اندر سے اس کی نحیف آواز آئی۔ خیمے میں داخل ہوتے ہی مجھے سوندھی خوشبو آئی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ڈالیا بستر پر ایک چادر لپیٹے لیٹی تھی اور اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟ میں نے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔ اس نے چادر سے ہاتھ نکال کر میرا ہاتھ تھاما تو مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے کوئی گرم شے میرے ہاتھ پر رکھ دی ہو۔ آپ کو بخار ہو رہا ہے، میں نے بے چینی سے اس کے ماتھے پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی پیشانی بخار سے تپ رہی تھی۔ وہ مسکرائی لیکن اس کی مسکراہٹ بے جان تھی۔ مجھے آج صبح سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے زور دے کر مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا، آپ کو کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے؟ بھوت پریت سے، اس نے نقاہت سے جواب دیا۔ کس بھوت پریت سے؟ میں نے مزید حیرت سے پوچھا۔ وہ مجھے کینوس کی جانب متوجہ کرتے ہوئے بولی، اُس سے۔ میں نے کینوس کی جانب دیکھ کر کہا، لیکن اس کینوس پر تو آپ نے کل رات برصہ کی تصویر بنائی تھی۔ آپ اسے اٹھا کر خود ہی دیکھ لیں۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ میں اس کے بستر سے اٹھا اور کینوس اٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگا۔ کینوس پر برصہ کے پس منظر میں مناسہ کی رنگدار تصویر تھی۔ لگ رہا تھا کہ ڈالیا نے پہلے مناسہ کی تصویر قرطاس پر بکھیری پھر برصہ کی تصویر بنائی۔ ڈالیا اپنی کمزور آواز میں بولی، میں نے کل رات اس کینوس پر کسی پس منظر کے بنا برصہ کا خاکہ دیکھا تھا۔ یہ تو مناسہ دیوی کی تصویر ہے، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

تلاش

محبوبِ حقیقی کو کوئی تلاش نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اُسے اپنی تلاش نہ دے۔ سو اگر تمہیں اُس کی تلاش عطا ہوئی ہے تو جان لو کہ اُسے بھی تمہاری تلاش ہے۔

اہلِ عشق کی محبت خام کو بھی خاص بنا دیتی ہے۔

جب دِل میں محبت کی آگ جلنے لگے تو پھر اِس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ تالی ایک ہاتھ نہیں بجتی۔

اگر کوئی پیاسا پانی پانی پکارتا ہے تو پانی بھی صدا دیتا ہے کہ کہاں ہے میرا پینے والا۔؟ صرف پیاسے کو پانی کی پیاس نہیں ہوتی بلکہ پانی کو بھی پیاسے کی پیاس ہوتی ہے۔

ہماری روح میں اُس ذات (خدا پاک) کی پیاس اُسی ذات کی کشش کا کمال ہے۔ وہ خود ہمیں اپنی جانب کھینچتا ہے۔ کیونکہ ہم اُس کے ہیں اور وہ ہمارا ہے۔

(حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ)

اور سب چاند ہو گئے

(بلغاری کہانی)

جارجی گوسپوڈینوف

ترجمہ: ظفر قریشی (نیویارک)

جارجی گوسپوڈینوف (Georgi Gospodinov) ۱۹۶۸ء میں بلغاریہ میں پیدا ہوئے۔ کہتے ہیں کہ یہ سال بلغاریہ کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن جارجی گوسپوڈینوف کو یقین ہے کہ ۱۹۶۸ء بلغاریہ میں آیا ہی نہیں۔ وہ شاعر اور ناول نگار ہیں۔ ان کے ایک ناول ''قدرتی ناول'' کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے نو سال کی عمر میں ایک مقامی اخبار کو اپنی نظم بھیجی تھی جس کی اشاعت پر انہیں تقریباً تین ڈالر معاوضہ ادا کیا گیا تھا۔ انہوں نے یہ رقم موصول ہونے پر حساب لگا کر فیصلہ کیا کہ اگر ان کی بیس نظمیں شائع ہو جائیں تو مجموعی رقم سے وہ بلغاریہ میں بنی ہوئی ایک بائیسکل خرید سکیں گے لیکن بوجوہ وہ اتنی رقم جمع نہ کر سکے اور ساختہ بلغاریہ بائیسکل سے محروم رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یوں تو میرے کئی پسندیدہ سوال ہیں لیکن ایک سوال جو مجھے بہت پسند ہے اور میں بار بار اسے دہراتا ہوں۔ وہ سوال یہ ہے کہ ہماری عمریں غیر منصفانہ طور پر اتنی مختصر کیوں ہیں؟

جارجی گوسپوڈینوف کی تحریروں کو کئی قومی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا ہے۔

☆

کیسٹر پی (Castor P) نے مرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کی عمر ۷۹ سال اور تین مہینے تھی۔ زندگی کی مزید کروٹیں دیکھنے کی اسے تمنا یا آرزو نہیں تھی۔ اسے کوئی غم نہیں تھا اور نہ ذاتی دکھ تھا جو اسے اس فیصلے کی جانب دھکیلتا۔ کیسٹر پی کے دادا نے بھی یہی عمر پائی تھی۔ اس کا باپ ابھی اسی برس کا نہیں ہوا تھا کہ اس نے بھی زندگی ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیسٹر کا خیال تھا کہ اسی سال کی عمر مناسب ہوتی ہے خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنی فطری زندگی میں سائنس کو دخل اندازی کی دعوت دے کر اضافہ کر لیا تھا۔

حتمی نتیجے تک پہنچنے سے قبل اسے کچھ رسمی کارروائیاں کرنی تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ موت ہمیں منظم بناتی ہیں۔ ''آخری خواہشات'' کے مرکزی دفتر کی جانب بڑھتے ہوئے کیسٹر پی نے سوچا یہ دفتر ارضیاتی بقاء کے محکمے کا ایک ذیلی شعبہ تھا۔ ''آخری خواہشات'' کے نام پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی کیونکہ اس نام نے اسے شراب خانوں کی روایت یاد دلائی تھی جس کے مطابق بار میں بیٹھے لوگوں کو بار کے بند ہونے سے قبل آخری آرڈر دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے بستر میں لیٹ کر مر جایا کرتے تھے۔ یہ سوچ کر اسے کچھ افسوس بھی ہوا تھا کیونکہ اب تو مرنے کا بھی رسمی اور باقاعدہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ وہ چاہتا تو زمین پر مزید پچاس برس گزار سکتا تھا۔ یہ اس کا حق تھا۔ اس کی انشورنس نے اسے اختیار دیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو پورے ایک سو پچیس سال زندہ رہ سکتا تھا۔ ایک سو پچیس برس سرکاری طور پر منظور کی گئی عمر تھی جبکہ وہ جانتا تھا اور بااثر اور دولتمند لوگوں نے تین تین سو سال کی زندگیاں خرید رکھی تھیں بلکہ بعض خلائی بینکار تو تین سو برس سے کہیں زیادہ عمریں خرید بیٹھے تھے۔

کیسٹر کے پاس اختیار تھا کہ ''ارضیائی بقاء'' کے محکمے میں ذاتی طور پر اس درخواست کے ساتھ پیش ہو کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اور برضا و رغبت اپنے باقی ماندہ سال محکمے کو لوٹا رہا ہے اور یہ کہ وہ فلاں سال کے فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو مرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد مقررہ تاریخ سے چند ماہ قبل یاددہانی کے طور پر اسے تصدیق کرنا ہوتی کہ اپنی درخواست کے مطابق وہ مرنے کے لیے تیار ہے۔

کیسٹر نے تین ماہ قبل اپنی پہلی درخواست محکمے کو دی تھی۔ درخواست میں اس نے استدعا کی تھی کہ محکمہ اس کے فیصلے سے اس کے بیٹے کو آگاہ کر دے تاکہ اپنے بیٹے سے وہ آخری ملاقات کر سکے۔ محکمے کے افسروں نے کیسٹر سے پوچھا تھا کہ ارضی کائنات میں اگر اس کے اور بھی عزیز و اقارب ہیں تو محکمے کو آگاہ کر دے تاکہ سب کو بیک وقت مطلع کیا جا سکے۔ افسروں کا کہنا تھا کہ رابطے کے اخراجات اس کی انشورنس کمپنی ادا کرے گی۔

''میرا تو اس ارضی کائنات میں میرے بیٹے کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔'' کیسٹر نے انہیں بتایا تھا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا بیٹا کس سیارے پر تعینات ہے تاہم اسے احساس ہوا کہ زبان ایک خطرناک چیز ہے۔ کیونکہ وہ کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا کہ دنیاوی کائنات میں وہ یک و تنہا ہے لیکن اپنی ہی زبان سے ادا ہونے والا یہ جملہ سن کر وہ بہت خوفزدہ ہوا تھا کہ اس پوری کائنات میں وہ اکیلا ہے۔

بیٹے کے نام پیغام اس نے خود ریکارڈ کرایا تھا۔ پیغام کی ریکارڈنگ میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ الفاظ اس نے پہلے ہی سوچ رکھے تھے۔ وہ لہجہ نرم اور رواں رکھنا چاہتا تھا لیکن اپنی آواز کا کیا کرتا جو پیغام کے آخر میں کرخت ہو گئی تھی ''میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے۔ برائے مہربانی مجھے رخصت کرنے کے لیے آ جاؤ۔'' تفصیلی پیغام کی ضرورت نہیں تھی۔ دفتر میں موجود لڑکی نے ضروری فارم وغیرہ بھرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ مواصلات کے جدید ترین ذرائع کے باوجود مکتوب الیہ اس قدر طویل فاصلے پر تھا کہ کیسٹر کو یقین نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کو پیغام وقت پر مل جائے گا۔ اس کا بیٹا جس سیارے پر تھا اس کی گردش کا حساب کتاب کیسٹر کی کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا، یاد رکھنا تو بڑی بات تھی۔ ''وہ ہو گا کہیں کسی جنگل بیابان میں۔'' یہ جملہ پچھلی صدی میں قابل فہم تھا لیکن آج اسے کون سمجھتا۔ دفتر کی وہ لڑکی جو اس کی اتنی مدد کر رہی تھی وہ بھی اس جملے کے معنی نہیں سمجھ سکی تھی تاہم اس نے ہمدردانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کیسٹر سے کہا کہ موجودہ تیز رفتار ذرائع مواصلات استعمال کیے جائیں تب بھی اس کا پیغام کم از کم دو

ہفتوں میں پہنچے گا۔ میرے باپ کے خطوط تو مجھے ایک ہفتے میں مل جایا کرتے تھے کیسٹر نے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ کیسٹر نے اپنی زندگی کا حساب کتاب لپیٹنے کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کی تھی۔ پیغام یا تار یا جو کچھ بھی اسے آج کل کہا جاتا تھا، بیٹے تک اس کے پہنچنے کے وقت کا اندازہ اس نے دو ہفتے لگایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا پیغام وصول کرنے کے بعد اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ہفتہ تو لے گا۔ دراصل باپ کی طرف سے مرنے کے فیصلے کی اطلاع کو مسترد کرتے ہوئے بیٹا اسے بڑھاپے کی حماقت قرار دیتا لیکن باپ کو وہ اتنی اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اپنی موت کا فیصلہ کبھی واپس نہیں لے گا۔ ایک ہفتے میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گا اور اگلا ہفتہ وہ تذبذب میں گزارے گا۔ فیصلے کے پانچویں ہفتے میں وہ ہنگامی بنیادوں پر چھٹی کی درخواست کرے گا اور ایک طویل سفر کی تیاری کرے گا اور تقریباً ڈیڑھ ماہ میں زمین کی طرف واپس ہو گا۔

تین مہینے گزر گئے اور بیٹے کی واپسی کا کوئی اشارہ بھی اسے نہیں ملا۔ کیسٹر پی تقریباً روز ہی محکمے کے دفتر کا چکر لگا رہا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دفتر میں کام کرنے والی لڑکی بے چارگی کے عالم میں اپنے دبلے پتلے کندھے اُچکا دیتی۔ لڑکی کی یہ حرکت اظہار ہمدردی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔

زمین کی زندگی کو الوداع کہنے کے لیے کیسٹر پی نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے مطابق آج آخری دن تھا۔ اس کے پاس شہر کے گلی کوچوں میں مٹر گشت کرنے کے لیے چند گھنٹے باقی بچے تھے۔ زمینی جنتری کے مطابق یہ دن موسم بہار کا پہلا دن ہوتا۔ شاہ بلوط (Chestnut) کے درختوں کی چوٹیوں پر پھولوں کے گچھے دمک رہے تھے۔ سفید ببول (Acacia) کے درخت موسم بہار کی ہوا کے جھونکوں میں سرشاری سے جھوم رہے تھے۔ سڑکوں اور گلیوں میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا لیکن یہ موسم بہار تو وہ موسم نہیں تھا جو اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ آج کے پھول یقیناً بڑے اور تروتازہ تھے لیکن خوشبو سے عاری تھے۔ کیسٹر پی کو یاد تھا کہ اس کے زمانے کے غنچوں کی خوشبو کس قدر مست کر دینے والی ہوتی تھی۔ اور غنچوں کا ذکر الگ ہے۔ اس کے دور کی ہر چیز کی اپنی نرالی خوشبو ہوا کرتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ جب اس کا بیٹا بڑا ہو رہا تھا تو ایک مرتبہ اس نے سفید ببول کی خوشبو کی تعریف کا تعین کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دیر تک مثالیں تلاش کرتا رہا تھا لیکن ناکام رہا تھا کیونکہ اس کا بیٹا ایک ایسے دور میں پیدا ہوا تھا جب قدرتی خوشبوئیں عنقا ہو چکی تھیں۔ جب تک خوشبو کا موازنہ نہیں کیا جائے گا کوئی مثال یا مترادف نہ پیش کیا جائے خوشبو کی وضاحت یا اس کی تعریف کیا ہو سکتی ہے؟ یہ درست ہے کہ سفید ببول کی خوشبو بنفشہ (Lilac) کے پھولوں جیسی ہوتی ہے لیکن ببول کی خوشبو میں زیادہ نزاکت ہوتی ہے۔ مگر یہاں دشواری یہ تھی کہ بنفشہ کے پھول بھی اپنی خوشبو کھو بیٹھے تھے۔ اور پھر پھولوں کی خوشبو غائب ہوئی تو شہد کی مکھیاں اور بھونرے بھی غائب ہو گئے جبکہ پھولوں کے گرد بھونرے نہ منڈلائیں تو فطرت اپنا ایک اہم کردار ترک کر دیتی ہے۔ شہد کی مکھیوں کو غائب ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا اور بھونروں کو غائب ہوئے چار عشرے گزر چکے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ سیل یا موبائل ٹیلی فونوں نے مکھیوں کی ان مخصوص اقسام کے مواصلاتی نظام کو درہم برہم کیا تھا جس کے نتیجے میں دنیا ان سے محروم ہوئی جبکہ کچھ اور لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ ایک نیا وائرس تھا جس کی جارحیت کے سبب زمین شہد کی مکھیوں اور بھونروں کو گنوا بیٹھی۔ شہد کی مکھیاں جب غائب ہو رہی تھیں تب ہی انسان کو سوچنا چاہیے تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ یہ ایک علامت تھی کہ حالات غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کر رہی تھی لیکن ترقی کے مقابلے میں فطری طور طریقوں کو زیادہ نقصان ہو رہا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ٹیکنالوجی کی ترقی سے ہونے والے نقصان کی رفتار بہت زیادہ تیز تھی۔ بعد میں پھولوں کو مصنوعی طریقے سے بارور کرنے (Pollination) کی کئی ناکام کوششیں ہوئیں۔ عام مکھیوں کے ڈی این اے کو تبدیل کر کے ان میں شہد کی مکھیوں کی خصوصیات پیدا کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن تب تک بہت تاخیر ہو چکی تھی اور شہد کی مکھیوں اور بھونروں کی نئی اقسام پیدا کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں فطرت کے اپنے نظام میں پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔

انسان کی جانب سے ہونے والی ان احمقانہ کوششوں کی روک تھام کیسٹر پی نے اپنے طور پر کی بلکہ پوری زندگی اس نے اس کام کے لیے وقف کر دی لیکن ٹیکنالوجی کا جن زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ کیسٹر کو یاد تھا کہ اپنی جوانی میں اس نے، صدی کے اوائل میں یورپ میں ایک بہت بڑی دوبین کی ایجاد کے منصوبے پر کام کیا تھا۔ اس دوربین کا قطر ۴۲ میٹر تھا۔ یہ دوربین اس قدر کارآمد تھی کہ اس کی مدد سے ۲۰۱۱ء میں ایک دور دراز کہکشاں کے اندر موجود ایک چھوٹا سا سیاہ غار یا دھبہ دریافت کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔

دور افتادہ کہکشاں کے غار یا سیاہ دھبے کی دریافت پر اخبارات نے جو سنسنی خیز خبریں شائع کی تھیں ان کے تراشے کیسٹر پی نے کچھ عرصہ قبل تک بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھے تھے۔ آسمان کھنگالنے کا کام کچھ مدت کے بعد اسے بور کرنے لگا تھا۔ کام حقیقتاً سست تھا۔ اس میں خون کی جوش دلانے والے واقعات نہیں تھے چنانچہ اس نے ''انقلابی'' قسم کے سائنس دانوں کے ایک گروپ میں شمولیت اختیار کر لی تھی جو ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تیل یا ایندھن کی جگہ متعارف کیے جانے والے متبادل ذرائع مناسب نہیں ہیں اور یہ کہ انسان کو توانائی کے نئے ذرائع تلاش کرنے ہوں گے۔ سائنس دانوں کے اسی گروہ نے شہد کی مکھیوں اور بھونروں کے معدوم ہونے کے خطرے سے دنیا کو آگاہ کیا تھا۔ لیکن دنیا کو ان کی پیشن گوئی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ سلیکون (Silicon) سے بنائے گئے ایک نقلی ببول (Acacia) کے سائے تلے بیٹھا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اردگرد موجود ہر شے انسانی ناکامیوں کی علامتیں ہیں۔ دنیا کے حوالے سے اس نے جو کچھ سوچا تھا، دنیا اس کے برعکس راستے پر چل رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے آسمان کی جانب دیکھا۔ اسے یوں

لگا جیسے آسمان کو ایک الٹے سیدھے آپریشن کے بعد بے ہنگم طریقے سے دوبارہ سی دیا گیا ہے۔ آسمان پر بڑے بڑے پیلے دھبے تھے جو اوزون (Ozone) کی تہہ میں انسانی ترقی کی اندھا دھند دوڑ کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے اور جنہیں بند کرنے کے لیے حضرت انسان نے Stratosphgre میں گندھک کے گولے داغے تھے۔ یہ آخری جنگ تھی جس میں اسے شکست ہوئی تھی۔ یہ اس کی آخری کوشش تھی جس میں اس نے ثابت کیا تھا کہ اوزون کے ساتھ ہونے والی ان حرکتوں کے نتیجے میں اوزون کی تہہ مزید پتلی ہو جائے گی۔ اب اسے علم ہو گیا تھا کہ اس کے خدشات درست تھے۔ اس حقیقت نے اسے مزید اداس کیا تھا۔

اب دنیا سے اس کی روانگی کا وقت قریب تھا۔ اس کے پاس صرف تین گھنٹے رہ گئے تھے۔ اسے اگر کچھ الوداعی خط لکھنے تھے تو اس کام کے لیے یہ وقت مناسب تھا۔ لوگوں نے خط لکھنے کے لیے کاغذ قلم کا استعمال ایک عرصہ قبل ترک کر دیا تھا۔ یہ اس کی عقلمندی تھی کہ اس نے ایک قلم اور کاغذ کا ایک دستہ چھپا کر رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے آخری وقت میں یہ کام کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ تحریر کی روایت پر عمل کرنے کے لیے یہ آخری وقت اس نے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کو اب بھی امید تھی کہ اس کا بیٹا ان آخری لمحات میں اس سے آ کر ملے گا۔

یہ جو آخری خطوط اس نے لکھنے تھے اس نے سوچا تھا کہ ان میں سے پہلا خط وہ اپنے باپ کو لکھے گا۔ یہ وہ خط تھا جو کم از کم پچاس برس کی تاخیر سے لکھا جانے والا تھا۔ کیسٹر نے سوچا تھا کہ اس خط میں وہ اپنے باپ کو رسمی طور پر رخصت کرے گا۔ خط شروع کرتے ہوئے وہ ہچکچایا کہ باپ کے لیے کیا القاب استعمال کرے۔ ایک لمحے کے لیے رک کر وہ ایک کاغذ کے ابتدائی حصے میں صرف ''ڈیڈ'' (Dad) ہی لکھ پایا۔ قلم کی کاغذ پر چلنے کی آواز نے جو کھرچنے کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی، اسے ایک انجانی خوشی سے دوچار کیا۔ اس کے ساتھ ہی گویا الفاظ کا ایک سیلاب تھا جو امنڈ آیا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے الفاظ کاغذ اور قلم کے منتظر تھے۔

اس نے اپنے باپ کو دنیا میں ہونے والی موجودہ ترقی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ''والد محترم، آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ اس ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے سے محروم رہے'' کیسٹر پی (Castor P) کا باپ پھول پودوں اور درختوں سے عشق کرتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ وہ دنیا کا آخری ''مالی'' تھا تو غلط نہ ہوگا۔ اسے اپنے درختوں اور پودوں سے گفتگو کرنے کا جنون تھا۔ سیب اور چیری کے درختوں سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور ہوتا تھا اور اخروٹ اور ناشپاتی کے درختوں کے ساتھ سرگوشی کرتے ہوئے اس کا انداز بالکل مختلف ہوتا تھا۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے کے پاس جاتا تو اس کے چہرے پر نہ نقاب ہوتی تھی اور نہ ہاتھوں پر دستانے۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اور دیر تک بھڑوں، بھونروں اور شہد کی مکھیوں سے دیکر تک محو گفتگو رہتا۔ ان دنوں دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے نتیجے میں کیسٹر کے باپ کی بنی دنیا تو غائب ہی ہو چکی تھی۔ ''ڈیڈ! میں آپ کا باغ محفوظ نہ رکھ سکا۔ شہد کی مکھیاں معدوم ہو گئیں مگر آپ کا اخروٹ کا درخت اب تک سلامت ہے۔'' اس نے لکھا تھا خط کے آخر میں اس نے اپنے باپ کو ترک دنیا کرنے کے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ یہ اطلاع آگے بڑھانے سے قبل وہ رکا۔ اسے مناسب الفاظ کی تلاش تھی۔ ''باقی تمام چیزیں ٹھیک ہیں۔۔۔ پریشان نہ ہوں۔ میرا بیٹا مجھ سے ملاقات کی غرض سے آیا ہے۔'' کیسٹر نے لکھا۔ ''لیکن میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میں آپ سے آخری ملاقات کرنے نہ آ سکا۔ مجھے معاف کر دیں۔ آپ کا بیٹا کیسٹر۔ نوٹ: ہم بہرحال عنقریب ملیں گے اور جتنی دیر چاہیں ایک دوسرے سے باتیں کریں گے اگر حیات بعد از موت کو انہوں نے تباہ نہ کر دیا ہو!''

خط مکمل کرنے کے بعد کیسٹر کو لگا کہ اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ خط مکمل کرنے کے بعد اس کی توقع سے زیادہ وقت لگا تھا۔ جب اس کا باپ زندہ تھا کیسٹر نے کبھی اس سے بات چیت کے لیے اتنا وقت نہیں نکالا تھا۔

بیٹے کو خط لکھتے ہوئے اس نے زیادہ تکلیف محسوس کی تھی۔ خط کا آغاز کرنے کی اس نے بار بار کوشش کی۔ ہر مرتبہ تھوڑا لکھنے کے بعد اسے صفحہ پھاڑنا پڑتا۔ وہ دوبارہ وہی عبارت لکھتا جو پھاڑے ہوئے کاغذ پر اس نے لکھی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے خط سے بیٹے کو اس کے دکھ درد کا احساس ہو۔ آخر کار جب وہ اپنا خط مکمل کر چکا تو اس کی عبارت نے خود اسے حیران کیا تھا جو کچھ یوں تھی:

''میں نے جو کام بھی کرنے کی کوشش کی اس میں ناکام رہا ہوں۔ گزشتہ چند برسوں سے میں توڑ پھوڑ اور افراتفری کی تھیوری کا قائل ہو گیا تھا اور اس عرصے میں میں نے بادلوں، دریاؤں، درختوں اور جھاڑیوں کو بغور دیکھا ہے گو کہ یہ تعداد میں کم ہو گئے تھے لیکن فطرت کا اپنا بھی ایک حساب کتاب ہوتا ہے اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زمین پر جو چیزیں بچ گئی ہیں آگے چل کر ان میں کس نوعیت کی تبدیلیاں آئیں گی۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے برعکس میں کبھی خلاء کا قائل نہیں رہا اور نہ میں اسے تسخیر کرنا چاہتا تھا۔ خلاء مجھے مرطوب، سرد اور سیاہ محسوس ہوتا ہے لیکن آج کی دنیا تو خلاء جیسی ہی ہو چکی ہے۔ میرے باپ اور دادا نے اپنے باغوں میں جو کچھ اُگایا تھا جس کا تذکرہ میں یہاں کر رہا ہوں وہ اب موجود نہیں۔ ان کی دنیا کی عدم موجودگی میں فطرت کا حساب کتاب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میری بات پر تمہیں غصہ تو آئے گا لیکن میں پھر کہوں گا کہ ہم نے خلاء میں جانے کے لیے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ ہم دراصل تیار نہیں تھے۔ صدیاں پہلے جب بدو صحراؤں میں گھوما کرتے تھے وہ وقتاً فوقتاً خیمے ڈال کر ٹھہر جایا کرتے تھے۔ اس طرح نہ صرف انہیں آرام کرنے اور ستانے کا موقع ملتا تھا بلکہ ان کے اونٹ بھی تازہ دم ہو جاتے تھے۔ یہی نہیں، ان کی ارواح کو بھی ان کا ساتھ دینے کا موقع مل جاتا تھا۔ دیکھو، روح کی رفتار مختلف ہوتی ہے، کاروان سے بچھڑنے والوں کو، پیچھے رہ جانے والوں کو آ ملنے کا موقع ملتا تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے یا تاخیر کے سبب کارواں سے مل نہ سکے خلاء کے ریگستانوں میں بھٹک رہے ہوں گے۔ میں ان کا رونا اور چیخنا چلّانا سن رہا ہوں۔ میں چت لیٹ کر چاند پر نظر جماتا ہوں جہاں میں

چند گھنٹوں میں ہوں گا۔ کیا تم جانتے ہو کہ خلاء کس عنصر کا بنا ہوا ہے؟ مجھ سے سنو۔ خلاء کا خمیر تنہائی سے اٹھا ہے۔ تنہائی تیزی سے بھڑکنے والی چیز ہے جو اپنے اردگرد کی جگہ میں سما جاتی ہے۔

''میرے دادا اور تمہارے پڑ دادا اس گھر میں رہتے تھے جو انہوں نے خود بنایا تھا۔ اس گھر کا باغ خود انہوں نے لگایا تھا۔ اپنے گھر سے زیادہ سے زیادہ دور اگر وہ کبھی گئے تو گاؤں گئے یا گھر کے پچھلے حصے کے جنگل میں گئے۔ ان کی تنہائی کا حجم ان کے گھر اور باغ جتنا تھا۔ میرے باپ کی تنہائی اس شہر جتنی تھی جس میں وہ منتقل ہوا تھا بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ میرے باپ کی تنہائی اس اپارٹمنٹ اور شہر جتنی تھی جس میں وہ منتقل ہوا تھا۔ میرا دادا کہتا تھا کہ میرا باپ ''بھاگ گیا'' اسے شہر نے قبول کر لیا تھا۔ جب میں بڑا ہوا تو ترک وطن کر کے کسی اور ملک میں چلا گیا یا ''بھاگ گیا۔'' اور اب تم وسیع و عریض خلا میں کہیں ''بھاگ گئے'' ہو اور میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری تنہائی کتنی بڑی ہوگی۔ کیا اس تنہائی کے ہماری کائنات جتنے رخ ہیں؟ کیا یہ ہلکی اور غیر مرئی ہے؟ اس کا حجم کیا ہے؟ اس کا وزن کتنا ہے؟ اس کے کتنے پہلو ہیں؟ کشش ثقل اس پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے؟

ماضی میں تنہائی نچوڑ کی شکل میں ہوتی تھی۔ مختصر۔ اسے بلّی کی طرح پالا جا سکتا تھا۔ آج کی تنہائی کا حدود اربع خلائی ہے۔ میں تنہائی کی جیومیٹری پر تھیسس لکھنا چاہتا تھا لیکن میں اسے ریاضی کے ایک اصول میں نہیں سمو سکتا اس لیے کہ یہ میری سمجھ سے ہی باہر ہے۔ اب جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میرے اندر شکایات کرنے کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ اب میں اپنے باپ اور دادا کی شکل اختیار کر رہا ہوں اور وقت آ گیا ہے کہ ان کے پاس چلا جاؤں اور ان سے ملوں۔ مجھ تک پہنچنے میں تاخیر پر اپنے آپ سے ناراض نہ ہونا۔ میرے لیے اتنا علم کافی ہے کہ تم مجھ سے آخری ملاقات کے لیے آ رہے ہو اور راستے میں ہو۔

''اور ہاں۔۔۔ اس سے قبل کہ میں بھول جاؤں۔۔۔ جب تم یہ خطوط وصول کرنے محکمے کے اس شعبے میں آؤ تو اس لڑکی سے اچھی طرح پیش آنا جو یہ خطوط تمہارے حوالے کرے گی۔ اچھی لڑکی ہے۔ اس سے بات کرو اور ممکن ہو تو اسے میری یاد میں سہی کھانے پر مدعو کر لینا۔ نفیس لڑکی ہے۔''

کیسٹر پی نے پیار سے کاغذ تہہ کر کے لفافے میں ڈالے۔ جن جن لوگوں کے لیے اس کے دل میں جگہ تھی اس نے ان سب سے فرداً فرداً الوداعی ملاقات کی تھی۔ یہ اس کی کائنات کے لوگ تھے۔ خطوط اکٹھے کر کے وہ محکمے کے دفتر کی طرف چل پڑا جہاں موجود لڑکی کو وہ اپنی آخری تحریریں حوالے کرنے والا تھا۔ اس کی نظر مخالف سمت پر پڑی۔ وہاں لوگ آ جا رہے تھے۔ دفتر کی جانب بڑھتے ہوئے اس کی نظر متعدد اینجلینا جولیوں (Angelina Jolies) اور بریڈ پٹس (Brad Pits) پر پڑی جو بوڑھے ہونے لگے تھے لیکن صاف لگتا تھا کہ اپنے دور کے مقبول ترین فلمی جوڑے کا سستا چربہ ہیں۔ انہیں دیکھ کر کیسٹر پی دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ ''یہ تو ناقابل مرمت ہو گئے ہیں۔'' اس نے سوچا ''نقلی انسانی خلیوں سے تیار کیے گئے ان نمونوں کا زمانہ بھی لد گیا ہے۔'' لیکن انہیں دیکھ کر کیسٹر کو افسوس ہو رہا تھا کہ دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر انہیں جعلی زندگیاں گزارنے کی سزا ملی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ محکمے کے دفتر والی لڑکی کم از کم اصلی اور فطری تو ہے!'' دفتر کے اندر داخل ہونے سے قبل وہ کچھ دیر کے لیے باہر رک گیا۔ کن انکھیوں سے اس نے ایک کونے میں چند درختوں کے سائے میں وہ خلائی کیپسول (Capsule) دیکھا جو اسے چاند تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ چاند کا وسیع قبرستان اس جیسے زمین کے باشندوں کے لیے حال ہی میں قائم کیا گیا تھا۔

کیسٹر پی سے اس کی آخری الوداعی خطوط لے کر لڑکی اچانک اس کے ساتھ بغل گیر ہو گئی۔ اس نوعیت کی ذاتی انسیت یا شفقت کے مظاہرے کی سختی سے ممانعت تھی۔ ''میرا بیٹا جلد کسی نہ کسی روز یہاں پہنچ ہی جائے گا۔'' کیسٹر پی نے گلوگیر آواز میں لڑکی سے کہا۔ اس وقت وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ کسی بھی لمحے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتا کیونکہ اس کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔

''وہ یقیناً آئے گا۔ میں جانتی ہوں۔'' لڑکی نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے اس کی ڈھارس بندھائی۔

شام ہونے لگی تھی۔ غروب ہوتے سورج کی نارنجی روشنی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس روشنی سے وہ بچپن سے واقف تھا جو رات کی تاریکی میں فاسفورس (Phosphorus) کی دودھیا روشنی میں تبدیل ہو کر سب کو چاند بنا دیتی تھی۔

☆

مطالعہ

---مطالعہ کسی سے اختلاف کرنے یا فصیح زبان میں گفتگو کرنے کی غرض سے نہ کرو بلکہ ''تولنے'' اور ''سوچنے'' کی خاطر کرو۔

(بیکن)

---جو نوجوان ایمانداری سے کچھ وقت مطالعے میں صرف کرتا ہے، تو اسے اپنے نتائج کے بارے میں بالکل متفکر نہ ہونا چاہئے۔

(ولیم جیمز)

---وہ شخص نہایت ہی خوش نصیب ہے جس کو مطالعہ کا شوق ہے، لیکن جو فحش کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اس سے وہ شخص اچھا ہے جس کو مطالعہ کا شوق نہیں۔

(میکالے)

---مطالعہ ذہن کو جلا دینے کے لئے اور اس کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

(شیلے)

''دائمی گردشیں''

کورونا وائرس

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

(۱)

آدمی، آدمی، آدمی
آدمی، آدمی، آدمی
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی

قتل کرتا ہوا، قتل ہوتا ہوا۔۔۔آدمی
دین اور دھرم کی
پُتلوں کو بڑے پیار سے چوم کر
جھوٹی تعظیم کی، ریت اور رسم کی ہر روایت
کی تکمیل کرتے ہوئے
اندھے کنویں کے اندر ڈوبتا ہوا۔۔۔آدمی

ناخلف آدمی
ناسمجھ آدمی
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی
بجتی مٹی سے ڈھالا ہوا، آدمی
جب کورونا کے مدِّ مقابل ہُوا، رُک گیا۔
رُک گیا۔۔۔
ملک در ملک سب
شہر اور بستیاں
حکم حاکم سے سنسان کر دی گئیں
کوٹھیاں، محل، چھوٹے بڑے سب مکاں،
جھونپڑے
مثلِ زنداں ہوئے۔

لوگ قیدی بنے
حکم حاکم سے اور جان کے خوف سے
اپنے اپنے ٹھکانوں میں روپوش ہو
(دن ہو یا رات)
چُپ چاپ رہنے لگے

دائمی گردشیں
سست کر دی گئیں یا معطل ہوئیں
شاہراہوں میں، رستوں میں پہرے لگے
کوچے کوچے سپہ گشت کرنے لگی۔
آدمی نے یہ اعلان کرتے ہوئے
''اس سے ڈرنا نہیں۔۔۔اس سے لڑنا ہے
لڑکر، ہرانا بھی ہے''
ڈر گیا۔
اپنے اندر بہت ڈر گیا
ڈر گیا، ڈر گیا، ڈر گیا۔
دوڑتا، بھاگتا، کودتا، ناچتا۔۔۔آدمی
ڈر گیا۔۔۔!!

(۲)

حضرت نوح (علیہ السلام)، طوفاں سے گھبرائے تھے
یا نہیں۔۔۔؟

کشتیٔ نوحؑ ڈر کر بنائی تھی، یا
حکم رب تھا۔۔۔یہی۔۔۔؟
سوچیئے، سوچیئے، سوچیئے!!
کس نے اُن سے کہا تھا۔۔۔؟
''میں پہاڑوں کی جانب چلا، آپ بھی ساتھ میرے چلو۔
اونچے ہوتے ہوئے زورِ طوفاں کا خدشہ
مجھے کچھ نہیں
آپ بھی مت ڈرو، ساتھ میرے چلو۔
ہم پہاڑوں پہ چڑھتے چلے جائینگے
اور طوفان کا
زور ٹوٹے گا، یا رخ بدل جائے گا
ساتھ میرے چلو۔۔۔ساتھ میرے چلو۔۔۔''

حضرت نوحؑ کشتی بناتے رہے
وہ پہاڑوں کی جانب گیا، گُم ہوا
اور جب
کشتیٔ نوحؑ ساحل پر جا کر۔۔۔رُکی
ان پہاڑوں کا نام ونشاں بھی نہ تھا۔
صرف اک گونج تھی
بولنے والا باقی نہ تھا
''ساتھ میرے چلو، ساتھ میرے چلو''

(۳)

پشت پر اسپ عالم کی بیٹھا ہُوا
ارضِ آدم کا اک معنوی بادشاہ
تیسری عالمی جنگ کے
رجز پڑھتا ہُوا۔۔۔
سامنے آ گیا۔
صاف لفظوں میں اعلان کرنے لگا
جنگ آغاز ہو۔
کورونا، وائرس کورونا
اک قرض، اک وبا ہی نہیں
ایک دشمن ہے جو اپنا لشکر لیے۔۔۔
عالم عالم ہے حملہ کناں
بے اماں، بے اماں، بے اماں۔۔۔!!

یہ کڑا وقت ہے، یہ نیا وقت، یہ نئی جنگ ہے،
آزمائش نئی۔۔۔
آدمی کو ہے درپیش اک امتحاں
اک نیا امتحاں۔۔۔!
یہ نئی جنگ اور یہ نیا امتحاں
تیسری عالمی جنگ کہلائے گا۔۔۔

ایسٹر پر مری، آنکھیں مرکوز ہیں
یہ ہے وعدہ مرا،
کورونا
موت کا اور دہشت کا زندہ نشاں
میری حکمت سے معمور یلغار سے
ایسٹر تک مقابل رُکے گا نہیں،
ملک در ملک
بڑھتے قدم روک کر
ارض آدم کے باہر نکل جائے گا۔۔۔

ایسٹر کے لیے
چرچ کھُل جائینگے
ملک در ملک، لوگوں سے بھر جائینگے۔۔۔!!

○

خون آشام

پروین شیر
(امریکہ)

کون خون آشام آیا؟
خشک ہوکر سب رگ جاں
یوں تہی داماں ہوئی ہیں
شیشہءاحساس پر لاکھوں دراڑیں آگئی ہیں
آس کے زخمی پرندے لاپتہ ہیں
شاخ جاں سنسان ہے اب
برف باری شدت آلام کی ایسی ہوئی ہے
اب سلگتے خواب کے لوبان سب مدفون ہیں انبار یخ میں
کون ہے جو سب چراغوں کو چرا کر لے گیا ہے؟
قریہ قریہ ہیں اندھیروں کے بسیرے
وقت کی تاریکیوں میں
ہوگئیں تحلیل سب صوت وصدا
رہ گزاریں اک سکوت مرگ کی چادر میں اپنا
منہ چھپائے اونگھتی ہیں
زندگی کی دور تک جاتی ہوئی پگ ڈنڈیوں پر
برگ وگُل بکھرے ہوئے ٹوٹے پڑے ہیں
کون خون آشام آیا دُھنداوڑھے؟۔۔۔!

○

دہشت انگیز کروناوائرس

یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

جان، بے جان، ہر شے میں وہ،
ہر جا، ہر سُو، ہوا میں بھی معلق
اور سانسوں میں بھی حاضر،
کروناوائرس خدا بنا ہوا ہے۔۔۔!

ایسی وحشت، دہشت نگری میں
کیسے تمکو گلے لگاؤں
لب ورخسار کو کیسے چوموں
کیسے تمہارے سینے سے لگ پاؤں
جسمیں جان سے جانے کا ہوا ندیشہ
ایسے رستے پہ کیسے خود کو لے جاؤں
مجبوریٔ حالات کو سمجھو جاناں!!

اپنے پن اور دوستداری کا بھی کیسے میں
مل کر جشن مناؤں، مصافحہ بھی
کروں میں کیسے تم سے
دار پر کیسے خود کو لے جاؤں
کسی بھی مسئلے کا حل خودکشی نہیں ہے!!

ایسی وحشت ودہشت انگیزی سے
کیسے اپنی جان بچاؤں
جو ہے ہر سو، ہر شے میں
بھی ہے حاضر

بہتر ہے دُور ہی کریں آداب وسلام
دور ہی کریں نمستے، رام رام

○

یاالٰہی، رحم کر!

(عالمی وبا کے پس منظر میں دعائیہ نظم)

انیس الرحمٰن
(سکھر)

تیرے در پر آ پڑے ہیں، یاالٰہی ، رحم کر!
تجھ سے ہی سب مانگتے ہیں ، یاالٰہی ، رحم کر!

سب وباؤں ، سب بلاؤں ، آفتوں کو دُور کر
رنج و غم گھیرے ہوئے ہیں،یاالٰہی ، رحم کر!

تیری رحمت پر نظر ہے، تیری قدرت پر یقیں!
مسئلے ہی مسئلے ہیں، یاالٰہی ، رحم کر!

سارے سلطان و گدا،سب نیک و بد تیرے ہی ہیں
مغفرت سب چاہتے ہیں،یاالٰہی ، رحم کر!

سارے طوفانو حوادث، سامنا جن کا رہا
حکم سے تیرے ٹلے ہیں،یاالٰہی ، رحم کر!

تُو ہی خالق ، تو ہی مالک، تُو ہی ہے پروردگار
مانتے تھے، مانتے ہیں،یاالٰہی ، رحم کر!

پھر سے لوٹا دے زمیں کو زندگی کی رونقیں
سارے انساں کہہ رہے ہیں،یاالٰہی ، رحم کر!

○

رات ڈھل جائے گی

شب تاریک میں
ٹمٹماتے ہوئے
کچھ ستاروں نے کل
گفتگو مجھ سے کی
ہاں اندھیرا تو ہے
اس اندھیرے میں لپٹا ہوا خوف ہے
موت کا کھیل ہے
چار جانب مگر
بھول جاؤ اندھیرا ہے کتنا، ہے کیوں
آج کی شب صرف
آج کی رات تم
ہم ستاروں کی ساتھی بنو
صبح ہونے تلک
روشنی دیں گے ہم
روشنی کم تو ہے
لیکن ہے تو سہی
میں نے جب یہ سنا
حوصلہ کچھ بڑھا
اور اداسی کی چادر پہ دکھنے لگے
جگمگاتی امیدوں کے تارے مجھے
ملگجی روشنی
اٹھ کھڑی ہوگئی
مسکراتے ہوئے
زندگی نے کہا
میں ابھی ہوں یہاں
یاں تمھارے قریں
رات ڈھل جائے گی
دل نے بڑھ کر تسلی دلاسے دیئے
روشنی ہے ابھی
تھوڑی کم ہے تو کیا
اس کنارے پہ دیکھو
کھڑی ہے سحر
میرے روٹھے ہوئے
ہمت و حوصلے
لوٹ کر آ گئے
اور گلے لگ گئے !!!

فرح کامران
(نیویارک)

''وطن کی مٹی گواہ رہنا''

(کورونا وائرس کے تناظر میں)

شگفتہ نازلی

(لاہور)

بڑھتی ہوئی تعداد سُن کے نہ گھبرائیے
حفظانِ صحت کے اصولوں کو اپنائیے،

بیشک فلُو سے ملتی جلتی علامات ہیں
لیکن بچاؤ کے بھی کئی اقدامات ہیں،

کھانسی اگر ہو ہاتھ میں رومال لیجیے
اور چھینکتے ہوئے بھی کہنی سے ہی ڈھانپیے

ہو گر ''بخار'' سانس میں بھی دشواری رہے
ہیلپ لائن سے ہی رابطے میں بہتری رہے

انفیکشن کے جو ہونے کا گر احتمال ہو
تو ہے ضروری ماسک کا بھی استعمال ہو،

ممکن ہو جتنی بار ہاتھ اپنے دھوئیے
صحت ستھرائی کا کبھی دامن نہ چھوڑیئے

گیدرنگ میں جانے سے ذرا خود کو بچائیے
اور شیک ہینڈ سے نہ مرض اپنا بڑھائیے

لازم ہو گر تو آئسولیشن وراڈ میں رہیں
پھیلاؤ روکنے کو کریں سب جو وہ کہیں

انمول ہے یہ زندگی اس کی قدر کریں
معالج کے مشوروں سے نہ صرفِ نظر کریں

○

قفل پڑے سماعتوں پر

جہانگیر اشرف

(بریڈفورڈ)

بہروں کی یہ بستی ہے
یہاں پہ بہرے رہتے ہیں
کوئی کسی کی سنتا نہیں
سب اپنی اپنی کہتے ہیں

قفل پڑے سماعتوں پر
سارا زور ہے باتوں پر
علم و ہنر بے کار یہاں
عقل و شعور لاچار یہاں
دلیل پہ حاوی شور ہے
وہی دیدہ ور ہے
جسمیں جتنا زور ہے

بہروں کی یہ بستی ہے
یہاں پہ بہرے رہتے ہیں
کوئی کسی کی سُنتا نہیں
سب اپنی اپنی کہتے ہیں

○

''امیداوراحتیاط''

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

کیسی یہ عالم میں پھیلی ہے وبا
بے کلی اور بے بسی ہے ہرطرف
موت سے پہلے کی اک خاموشی میں
ہورہا ہے رقص موت وخوف کا
جس نے لب سے مسکراہٹ چھین لی
گم ہُوئی محفل کی رعنائی سبھی
راستے سارے ہی اب ویران ہیں
اور کسی مزدور کی اجرت گئی
ایسے عالم میں بچا ہے پاس کیا؟؟؟؟
فوری دل گویا ہُوا''اُمّید''سے
اور یہی اُمّید تو ہے زندگی
اور یہی اک زندگی ہے روشنی
اور اِسی ہی روشنی سے پھوٹتی
وہ سحر ہے ,اُس اَندھیری رات کی
جس میں پھیلی یہ بلا بن کر وبا
کھا گئی ناجا نے کتنے جسم وجاں
پھر بھی جتنے ,جو بھی اب تک پاس ہیں
سب کی خاطر ہی جَلائیں اک دِیا
اُس دِیے میں ہُو اُمیدوں کی کرن
اور عمل کی لَو سے جھلکے'' احتیاط''
تھام لو اللہ کی رسّی کو پھر
جو مٹاتا ہی نہیں اُمّید کو
اور اُسی رب کا ہے مجھ کو بھی یقیں
لوٹ کر آئے گی رونق جابجا
دے گی دستک بھی خوشی اگلے قدم
بس ذرا اُمّید کو تھامے رہو
احتیاط و صبر پر مائل رہو

سماجی دُوری بہ امرِ مجبوری

تصورا قبال
(اٹک)

بشکلِ کورونا وبا یہ جو آئی
جدا ہو گیا ایک دوجے سے بھائی
جہاں بھر میں خوف وہراس ایک پھیلا
ہوئے قید اپنے گھروں میں جو باسی
نظام ہو گیا آج مفلوج سارا
کسی کا نہیں چل رہا کوئی چارہ
قیامت کی کہتا ہے کوئی نشانی
کوئی اس کو کہتا ہے قہرِ الٰہی
بغاوت خدا سے جو ہم کر رہے ہیں
جھلک اُس نے اپنی ذرا سی دکھائی
اکڑ کر زمیں پر جو ہم چل رہے تھے
گناہوں میں دن رات یوں ڈھل رہے تھے
بُھلا کر خدا کے فرامین سارے
بدن پر کوئی وائرس مل رہے تھے
ہوئی آج ویران سڑکیں تو جانا
خدا کو بہر طور ہم نے منانا
کورونا کورونا ہے ہر ایک لب پر
کورونا سے بچنا یقیناً ہے مشکل
اگر''اِس کورونا'' سے بچ بھی گئے تو
کوئی دوسرا قہر پھر ہوگا نازل

○

''موت کا اک نیا خدا''

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

اَیوباؤں اور آفتوں کے خدا
اَب زرا یہ تو بتا
یہ کرونا ہے کیا بلا
کیا یہ موت کا ہے نیا خدا؟
موت جو چمگادڑوں اور کتوں کی ہڈیوں سے
بلبلاتی نکلی
اور زمین ساری نیلی کر گئی۔
موت کا خدا بڑا مہربان ہے
ہر رنگ و نسل و مذہب پہ
بلا تفریق بَرس گیا
کلیسا و مندر کی گھنٹیاں اور مسجد کی آزاں ہیں ماتم کناں
موت کے بہت سے سوداگر میدان میں اتر آئے ہیں
اور وَبا کے دنوں میں
تھوک کے حساب سے
نفرت بیچ رہے ہیں
کچھ لوگ
خوف اور نفرت کا مسالہ لگا کر میاں بنا رہے ہیں
ٹی وِی اور اَخباروں پہ جھوٹ اور ڈَر کا
عالمی و ملکی پہرہ ہے
ڈیٹول سے دُھلی اور دَستانوں میں چھپی
خَمریں حاضر ہیں
موت کے تاجر
مہنگے داموں
ماسک اور سینی ٹایزر بیچ کر
تسبیحاں گھماتے
اللہ کی حَمد بیان کر رہے ہیں
گوداموں میں دو ماہ کی خوراک کا زخیرہ ہے
گھر بیٹھے دو بجے کی خبریں سن کر لمبی ڈکار مارتے ہیں
یہ کورونا کم بخت ہے کہ پھیلتا ہی جاتا ہے
امریکہ اور چین کی جنگ ہے
امیر ملکوں کا ڈرامہ ہے
بس غریب کو پیسنے کا بہانہ ہے
منہ کا زائقہ خراب ہو گیا ہے
آج تو بس کڑاہی گوشت بنانا ہے
اَگر بار بی کیو ہو جائے
تو کیا ہی بات ہے
موٹی عورت
تڑخے کناروں والے کپ میں
چائے کی چسکی بھرتی ہے
پھر روہانسی ہو کر شوہر سے کہتی ہے
رُوزمَرہ کے مگ ٹوٹ چکے ہیں
حکومت نے کاسمیٹک، کراکری، کپڑوں اور جوتوں کو
عیاشی کے زمرے میں ڈال کر
اس کی خریداری
بند کر دی ہے
میں اپنے بیاہ کا نیا ڈنر سیٹ اور مگ نہیں نکال سکتی
اور بازار صرف دالیں سبزی لینے نہیں جا سکتی
یہ موئے نوکر کس مرض کی ہیں دَوا
ملازم اس خیال پہ رنجیدہ ہے
اور کمینی خوشی سے سوچتا ہے
اچھا ہوا
اس بھدی عورت کا چائے کا مگ ٹوٹ گیا ہے
ہر جانب بند دکانیں ہیں
بھوک ناچتی ہے سر بازار
اور میرے گھر میں
گو آج کا ہی آٹا ہے
کورونا اور بھوک میں سے
کسی ایک کا چناؤ کرنا ہے
دونوں طرف موت ہے پوری
مگر کورونا کا خدا اچھا ہے
بلا امتیاز و رنگ و نسل
سب کو پکڑ رہا ہے
دنیا خدا کا چھوٹا سا قصبہ ہے
راشن بانٹتا بھلا آدمی
بھلا کیا کہہ رہا ہے
رَب کائنات نے اِزن دیا ہے
میری زمین پہ میرا ہی قانون چلنا ہے
رَبِ کورونا سے کوئی پوچھے زرا
تیری زمین پہ کب غریب کا قانون
لاگو ہوا ہے
پناہ گاہوں میں دُبکے لوگ
افواہوں کے گرم بازار میں
دو نمبری
آزمائش، عذاب اور سازش کا فرق تلاشتے ہیں
خوفزدہ لوگ
سوشل میڈیا پہ دھڑا دھڑ
دعائیں خرید رہے ہیں
اور جب خوف کے اِن بائیو کیمیکل ہتھیاروں سے
دنیا کی صفائی ہو جائے گی
پرانے حاکم نئے قانون لائیں گے
بائیو مانیٹرنگ گھڑی
اَب دل کی دھڑکن اور فشار خون
ناپ کر
ہر دِن کا
بائیو میٹرک زائچہ بنایا کرے گی
میرے ہر ہر سانس کو جانچا کرے گی
آزادی اور زندگی میں سے کس کا انتخاب کیا جائے؟
کورونا کا خدا سازش، آزمائش، اور عذاب میں سے
کسے چنے گا؟
رَب الموت، رب کائنات نے
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا
چند رُوز کی آئسولیشن نے
کائنات میں
تمھارے ڈالے اُوزون کے شگاف کو بھر دیا ہے۔

☆

کورونا

Vivienne

ترجمہ: رینو بہل (چنڈی گڑھ)

سرگوشی کی زمیں نے، مگر توجہ نہیں دی تم نے
بولی تھی زمیں مگر سُنا نہیں تم نے
چیخی بھی تھی زمیں، مگر آواز دبا دی تم نے
اور پھر وارد ہوا میں۔۔۔
سزا دینے نہیں آیا تمہیں
تمہیں بیدار کرنے آیا
زمیں نے کی تھی مدد کی پکار
شدید سیلاب آیا کچھ نہیں کیا تم نے
لگتی رہی آگ، کچھ نہیں کیا تم نے
آئے سمندری طوفان کچھ نہیں کیا تم نے
خوفناک گرد و باد کی بھی نہیں سُنی تم نے
زمیں کی صدا کو اب بھی نہیں سُنتے تم
جب سمندروں میں آلودگی سے مر رہے
سمندری جیو
خطرناک رفتار سے پگھل رہے ہیں گلیشیئر
پڑ رہے ہیں اکال
ان سُنی کر دی تم نے انتہائی منفیت جذب کر
رہی زمیں
مسلسل جنگیں
مسلسل حرص
تم بس اپنی زندگی میں مست رہے
بے غرض پھیلی نفرتوں سے
لاتعلق ہو رہے قتلِ عام سے
زمیں کی صدا کی فکر سے اہم تھا
تمہارے لیے

تازہ ترین آئی فون حاصل کرنا
مگر اب میں آ گیا ہوں
اور میں نے روک دی دُنیا کی رفتار
میں نے تمہیں سُننے کو مجبور کیا
میں نے تمہیں چھپنے کو مجبور کیا
مادیت چیزوں کے بارے سوچنے سے
میں نے تمہیں روک دیا
اب تم بھی زمیں کی طرح ہو
فکرمند ہوا اپنی جان بچانے کو
کیسا لگ رہا ہے اب تمہیں؟
میں نے تمہیں بخار دیا، جیسے آگ سے جلی تھی
زمیں
میں نے تمہیں سانس لینا دشوار کیا
جیسے زمیں کی ہوا میں گھُلی تھی آلودگی
میں نے تمہیں نقاہت دی
جیسے ہر روز کمزور ہوتی جاتی ہے زمیں
میں نے تمہارا چین و آرام
گھر سے باہر جانا
سب چھین لیا
ان سب کی وجہ سے بھول گئے تھے
زمیں اور اس کے درد کو
میں نے دنیا کا کاروبار روک دیا
اور اب
چین کی آب و ہوا صاف ہے
نیلا آسمان شفاف ہے

زمیں کی فضا میں
آلودگی نہیں گھول رہے کارخانے
وینس کا پانی صاف ہے
کیونکہ تھمی ہوئی ہیں گونڈولا کشتیاں
پانی کو آلودہ کرتی تھیں جو
اب تمہارے پاس سوچنے کو وقت ہی وقت ہے
کہ تمہاری زندگی میں اہم کیا ہے
واضح کر دوں پھر تمہیں
سزا دینے نہیں بیدار کرنے آیا ہوں
جب یہ سب گزر جائے گا اور میں چلا جاؤں گا
براہِ کرم یاد رکھنا اس دور کو
زمیں کی صدا سُنتے رہنا
اپنی روح کی آواز سُنتے رہنا
زمیں کو آلودہ مت کرنا
مل کر رہنا
لڑائی جھگڑا مت کرنا
مادیت چیزوں کا موہ مت کرنا
اور اپنے پڑوسیوں سے محبت کرنا
زمیں اور کُل زی روح کا خیال کرنا
خالق پر ہمیشہ عقیدہ رکھنا
کیونکہ اگلی بار میں آیا تو
اور بھی خطرناک بن کر آؤں گا

دستخط
کورونا وائرس

کروناوائرس

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہہِ شیشہ گری کا

اللہ تعالیٰ کی صناعی، اس کی قدرت اور اس کی قوت تخلیق کے مناظر ہمیں دنیا کی ہر چیز میں نظر آتے ہیں۔ یوں تو اسکی کائینات ہر لحاظ سے مجموعہ عجائب ہے مگر حیات کی مختلف شکلیں دیکھنے اور سمجھنے والے ذہن کے لئے نہ صرف حیران کن ہیں بلکہ اسکے وجود کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔ زندگی کے مدارج جہاں ایک طرف تو انسان جیسی عظیم اور اشرف المخلوق ہستی تک پہنچتے ہیں تو دوسری جانب'' یک'' خلیہ جاندار یعنی ایمبا (amoeba) تک۔ ایک زمانہ تھا جب خیال کیا جاتا تھا کہ زندگی کی پست ترین سطح ایمبا پر ختم ہو جاتی ہے لیکن پھر جراثیم دریافت ہوئے جو ایمبا سے بھی چھوٹے تھے اور اب یہ سطح مزید نیچے ہو کر وائرس پر ٹھہری ہے جو حیات کی سب سے چھوٹی شکل ہے۔

وائرس کیا ہے

وائرس دراصل قلیل ترین اجسام ہیں جو مائیکروسکوپ سے بھی نہیں دیکھے جاسکتے انہیں دیکھنے کے لئے الیکٹرون مائیکروسکوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ وہ خود اپنے طور پر زندہ بھی نہیں رہ سکتے انہیں زندہ رہنے کے لئے ایک زندہ خلئے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ زندہ اجسام کا مرکز (بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حیات کا مرکز) ایک انتہائی چھوٹا سا کیمیائی ذرہ ہوتا ہے جسے DNA کہتے ہیں جو اگرچہ زندہ نہیں ہوتا مگر اس میں خود کو تخلیق کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں تقسیم کے علاوہ تخلیق کرنے کے ساتھ یہ بھی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ تقسیم کے بعد بلکل اپنے ہی جیسا ذرہ تخلیق کرتا ہے۔ یعنی اس ذرے میں وراثت کے تمامتر راز اور پیغامات چھپے ہوتے ہیں اور اسطرح تخلیق کیا ہوا نیا ذرہ بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسے پہلے والا ذرہ۔ DNA کا بنیادی کام ایک اور کیمیائی عنصر امائی نو ایسڈ (AMINO ACID) تخلیق کرنا ہے جو پروٹین کا بنیادی عنصر ہے یعنی بہت سے امینا ایسڈ کے ذرات مل کر پروٹین بناتے ہیں۔ پروٹین سے زندہ اجسام کے زیادہ تر اعضا تیار ہوتے ہیں، یعنی ہمارے جگر، عضلات اور دل وغیرہ سب اسی پروٹین سے بنتے ہیں۔

ارتقائی مرحلے کی یہ حیرت انگیز سیڑھی ہے اگرچہ ڈی این اے اپنے طور پر زندہ نہیں ہے نہ ہی وہ اپنے طور پر زندہ رہ سکتا ہے اسے ایک کیمیائی مادہ ہی کہا جاتا ہے مگر ایک خاص حالت میں اس میں زندگی کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی وہ تقسیم ہوسکتا ہے اور اپنی ذات کو اپنے ہی جیسے ذرے میں تخلیق کرسکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ وہ نقطہء ارتکاز ہے جب عالم جمادات عالم حیات سے جڑتا ہے۔

وائرس دراصل اسی DNA کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جسکے چہار طرف پروٹین کا ہلکا سا غلاف چڑھا ہوتا ہے۔ اس حالت میں یہ ایک زندہ جسم نہیں ہے، نہ ہی یہ اپنے لئے غذا تیار کرسکتا ہے نہ ہی یہ تقسیم ہو کر اپنی افزئش نسل کر سکا تا ہے۔ اس کو اس عمل کی ضرورت ہے کہ وہ کسی زندہ اور صحت مند خلئے میں پیوست ہو کر، اسکے اندر داخل ہو کر اسکی توانائی سے اپنی غذا تیار کرے اور تقسیم در تقسیم ہو کر ہزاروں بلکہ لاکھوں اپنے جیسے ذرات پیدا کرے جس کی وجہ سے یہ زندہ وصحت مند خلیہ پھٹ جاتا ہے اور پھر یہ ہزاروں ذرے مزید صحت مند خلیات میں پیوست ہو کر انہیں تباہ کر دیتے ہیں اور اسی طرح یہ زنجیری عمل جاری رہتا ہے۔

متذکرہ بالا سلسلہ یعنی ''چین ری ایکشن'' اسی طرح چلتا رہے تو جان بچنا ناممکن ہے مگر قدرت نے انسان میں ایسے دو مدافعتی نظام رکھے ہیں جن کی وجہ سے وائرس کی زیادہ تر بیماریاں انسان (اور جانوروں کے لئے بھی) نقصان دہ نہیں جیسے عام زکام۔ ایک تو یہ کہ انسان کے خون میں سفید ذرات بیشتر وائرس پر حملہ کر کے انہیں تباہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ دوسرے انسان کے جسم میں موجود کچھ غدود (LYMPH NODES) جیسے خورد ذرات بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں جنہیں ANTIBODIES کہتے ہیں اور یہ وائرس کے خلاف بہت موثر ہوتے ہیں اور انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ اسکی ایک مثال چیچک ہے جسکے خلاف یہ انٹی باڈیز تمام عمر کے لئے مدافعت قائم کر دیتی ہیں۔ انٹی باڈیز کے لئے چیچک کا ٹیکا لگانا درکار ہے۔

وائرس کے نام کی ابتدا لاطینی زبان کی جڑ سے ہوئی۔ اس زبان میں VIRULENTUS کا مطلب زہریلا، نقصان دہ ہے۔ عام انگریزی میں بھی ایک لفظ VIRULENCE استعمال ہوتا ہے جسکا مطلب بھی یہی ہے، اب اسے طبی زبان میں بیماری پیدا کرنے کی صلاحیت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا۔

۱۸۹۰ کے قریب ایک روسی سائینسدان نے تمباکو کے پودوں میں ایک پراسرار بیماری کی تحقیق کرتے ہوئے اس کو دریافت کیا تھا مگر وہ اسکو دیکھ نہیں سکا تھا۔ پھر ایک ڈچ ڈاکٹر نے اسے وائرس کا نام دیا۔ کئی دہائیوں کے بعد الیکٹرون مائیکروسکوپ کی ایجاد کے بعد اس کی ساخت کا پتہ چلایا گیا۔

وائرس سے لاحق ہونے والی بیماریاں اور اسکی ہلاکت خیزی

وائرس کرہ عرض میں بہت افراط کے ساتھ موجود ہے اور یہ نہ صرف انسان بلکہ جانوروں اور پیڑوں پودوں میں بھی انتہائی ملک تباہی کا باعث ہے۔

وائرس سے لاحق ہونے والی بیماریوں میں عام زکام سے لیکر انتہائی مہلک ایڈز شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مئی ۱۹۸۱ سے جب کہ ایڈز پہلی دفعہ دریافت ہوئی تھی اب تک ۲۵ ملین لوگ اسکی وجہ سے لقمہء اجل ہو چکے ہیں ۱۹۱۸ کے

انفلوئنزا کی وبا میں ایک ہی سال میں پوری دنیا میں ۵۰ ملین لوگ ہلاک ہوئے تھے۔امریکا دریافت ہونے کے بعد ریڈ انڈین آبادی کی دو تہائی اکثریت چیچک کی وجہ سے ہلاک ہوگئی تھی جو انہیں سفید فام یوروپی فاتحین کی چھوت کی وجہ سے لگی تھی۔

آج کے دور میں ہیپا ٹائی ٹس، ہرپیس، پولیو، منہ کے چھالے، کچھ خواتین کے اندرونی اعضا کے کینسر، اور وائرس سے لاحق ہونے والا نمونیا، ایڈز، اور دماغی سوزش ENCEPHALITIS شامل ہیں۔اسکے علاہ وائرس پودوں کو بھی تباہ کرتا ہے۔ایڈز کا وائرس اس وقت سب زیادہ خطرناک ہے اس لئے کہ یہ خاص طور پر انسان کے مدافعتی نظام کو ناکارہ کردیتا ہے جسکی وجہ سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

وائرس کے علاج کے لئے ۱۹۸۰ء کی دہائی تک کوئی دوا نہ تھی پھر ایڈز اور ہیپا ٹائی ٹیس کی ہلاکت خیزی کی وجہ سے ریسرچ میں تیزی آئی اور چند دوائیں ایجاد ہوئیں مگر یہ دوائیں بھی صرف چند بیماریوں تک محدود ہیں۔ایک زمانے میں ،اور بڑی حد تک آج بھی، وائرس کی بیماریوں سے بچاؤ صرف ویکسین کی صورت ہی میں ممکن ہے۔جب ویکسین ایجاد ہوئی تو اس نے دنیا میں انقلاب برپا کردیا اس لئے کہ یہ انتہائی اور بڑی حد تک شرطیہ علاج تھی اور آج بھی ہے۔اس کی وجہ سے چیچک، پولیو، یرقان، کتے کے کاٹے کی بیماری اور ہیپا ٹائی ٹس A کا قلعہ قمعہ ہوگیا ہے

اگرچہ ان بیماریوں کے خلاف ٹیکہ ایجاد ہوگیا ہے مگر وائرس کی ویکسین کی تیاری مشکل رہی ہے کیونکہ وائرس کئی شکلوں کا ہوتا ہے اور یہ جلد از جلد اپنی وراثتی ساخت بدلتا رہتا ہے (MUTATION) اور ایک ہی نسل کا وائرس اپنی کینچلی بدل کر دوسری شکل اختیار کرلیتا ہے اور پہلی والی ویکسین اثر کھو دیتی ہے۔

کرونا وائرس کی موجودہ وبائی صورتحال

کرونا وائرس کو ''نادر'' وائرس کہا جارہا ہے اس لئے کہ یہ اپنی ساخت اور بیماری پھیلانے کے معاملے میں خاص صلاحیت رکھتا ہے مگر یہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اس میں کئی وائرس ہیں۔دراصل یہ ایک اور وائرس سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتا ہے جس نے ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۵ء تک چین اور جنوب مشرقی ایشیا میں شدید تباہی مچائی تھی اسے SARS کا نام دیا گیا تھا۔مگر حسب عادت اس خصوصی وائرس نے اپنی ساخت اور اپنی وراثتی خصوصیت بدل لی ہے اور وہ تمام تدابیر جو SARS کے معاملے میں کامیاب ہوگئیں تھیں اب بیکار ثابت ہورہی ہیں۔ ویسے بھی کسی قسم کا انٹی بایوٹک وائرس کے خلاف موثر نہیں ہوتا اور ماضی قریب تک وائرس کے خلاف کوئی بھی دوا ایجاد نہیں ہوئی تھی۔SARS کے بعد یہی وائرس شکل بدل کر مشرق وسطیٰ میں MERS بن کر نمودار ہوا اور کئی ہزار لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔یہی وائرس کرونا وائرس بن کر تمام دنیا کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ دسمبر ۲۰۱۹ء کے آخیر میں چین کے شہر ووہان میں تعینات چینی ڈاکٹروں نے ملک کے باقی ڈاکٹروں کو انتباہ کیا کہ کچھ مریضوں میں ایک غیر معمولی نمونیا پایا گیا ہے جو ''سارس'' سے ملتا جلتا ہے مگر اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید ہے۔اس نمونیا سے جو وائرس دریافت کیا گیا وہ اسی قبیلے کا ہے۔ یہ وائرس عام طور پر جانوروں میں پایا جاتا ہے اور عام حالات میں اس سے پہلے وہ کسی انسان میں نہیں دیکھا گیا تھا۔یہ وائرس چمگادڑوں میں عام ہے۔اب یہ یقینی طور معلوم نہیں کہ یہ انسانوں میں کیسے منتقل ہوا۔ایک اندازہ یہ ہے کہ ووہان کے جانوروں کے مارکیٹ سے یہ کسی انسان کو لگا اور اسکے بعد یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔اس کے پھیلنے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ ہر تیسرے دن اسکی تعداد دو یا تین گنا ہو جاتی ہے۔اور پھر جدید دنیا کی تیز رفتار انداز زندگی کی وجہ سے، یعنی ہر روز ملین سے زیادہ لوگ سفر کرکے ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں، اس نے ساری دنیا کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

شروع میں لوگوں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی کیونکہ یہ مشاہدہ کیا گیا تھا کہ بڑی حد تک صرف بوڑھے افراد یعنی پینسٹھ سال سے زیادہ افراد کو موت کا خطرہ ہے اور ان میں بھی زیادہ اموات ان بوڑھے افراد کی تھی جو اسی سال سے زیادہ تھے اور کسی قسم کی پھیپڑوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔مگر جب کچھ جوان اور صحت مند افراد بھی اس کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے گئے۔تو لوگوں میں خوف وحراس پیدا ہوگیا۔اس کے علاوہ اموات اسقدر جلدی ہوئیں کہ اچھے خاصے بزرگ لوگ جو بظاہر بالکل صحت مند لگ رہے تھے تین دن میں موت کا نوالہ بن گئے۔پچھلے دنوں امریکا کی ریاست نیو جرسی میں ایک ہی خاندان کے چار افراد ایک ہفتے کے اندر اندر ہلاک ہوگئے۔ان سب نے مل کر ایک شام ڈنر کھایا تھا اور خوب قہقہے لگائے تھے اس کے فورا بعد وہاں کے گورنر نے سارے ریسٹوران پر پابندی لگادی۔

مرض پھیلنے کا طریقہ

کرونا وائرس بنیادی طور پر پھیپڑوں کا مرض ہے۔وائرس سانس کی نالیوں کے ذریعہ پھیپڑوں میں پہنچتا ہے۔یعنی وہ شخص جو وائرس کا شکار ہوتا ہے جب کھانستا ہے تو تھوک یا بلغم کی پھوار جس میں لاکھوں وائرس کے جراثیم ہوتے ہیں سامنے والے صحت مند شخص کے سانس کی نالیوں کے راستے اسکے پھیپڑوں میں جاکر تیزی سے تقسیم ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔یاد رہے کہ کھانسی نہ بھی ہو تو بھی جب ہم بولتے ہیں تو نظر نہ آنیوالی تھوک کی پھوار نکلتی ہے جو اسی قدر خطرناک ہوتی ہے۔اسکے علاوہ یہ پھوار دوسری اشیا پر بھی پڑتی ہے جہاں یہ وائرس تین سے پانچ دن تک زندہ رہتا ہے۔انہیں چھونے سے وائرس ہاتھوں پر لگ جاتا ہے اور اب اگر انہی ہاتھوں سے آنکھوں، ناک یا منہ کو چھوا جائے تو وائرس ان میں موجود جھلیوں میں پیوست ہوکر بیماری کا سبب ہوسکتا ہے۔اس لئے وبا کے زمانے میں ہر ایک کے لئے لازمی ہے کہ ماسک کا استعمال کرے اور بار بار صابن سے ہاتھ دھوئے جائیں اور ہاتھ دھوئے بغیر ناک، منہ یا آنکھوں میں انگلیاں ہرگز نہ ڈالی

جائیں۔یہ وائرس کھانے پینے کی چیزوں یا فضلے کی آمیزش سے نہیں پھیلتا۔

علامات

کروناوائرس ایک قسم کا ''فلو'' ہے۔شروع میں چھینکیں، ناک و آنکھوں سے پانی بہنا، پھر کھانسی شروع ہونا اور ایک سو سے زیادہ بخار، اسکے بعد سینے میں گھٹن، یا پھر سانس میں تکلیف شروع ہوجاتی ہے جو بڑھ کر اسقدر شدید ہو جاتی ہے کہ سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے اور بلغم میں خون کی آمیزش ہوجاتی ہے حتیٰ کہ مریض کو مصنوعی سانس کی مشین پر ڈالنا پڑتا ہے۔اگر بدقسمتی سے یہ مرحلہ آجائے تو مریض کا بچنا محال ہوجاتا ہے کیونکہ بدقسمتی سے اس کے خلاف کوئی انٹی بایوٹک اثر نہیں کرتی، مریض کی اپنی قوت مدافعت ہی اسے بچاسکتی ہے۔

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ عمر رسیدہ لوگ کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو پہلے سے پھیپڑوں کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں جیسے دمہ یا سگریٹ پینے والے افراد، یہ بیماری جان کے لئے خطرہ بن جاتی ہے۔نوجوان اور مکمل صحت منداور اچھی مدافعت رکھنے والے لوگ پانچ سے دو ہفتوں میں صحت مند ہو جاتے ہیں۔

اس وائرس کا کوئی علاج نہیں ہے اور مریض کی صحت یابی اسکی اپنی قوت مدافعت پر ہے اس لئے وہ لوگ جو کسی وجہ سے قوت مدافعت کی کمی کا شکار ہوں ان کے لئے یہ بیماری مہلک ہوسکتی ہے۔

وائرس کی دوسری بیماریوں کی طرح آخرکار اس سے بچنے کے لئے ویکسین کی ضرورت ہے مگر اس وقت اسکی ویکسین کا ایجاد ہونا مشکل ہے اور شاید اس میں ڈیڑھ سے دوسال لگ سکتے ہیں اس لئے احتیاتی تدابیر جیسے بھیڑ بھاڑ کی جگہوں سے بچاؤ، لوگوں کے قریب نہ جانا، ماسک پہننا اور بار بار ہاتھ دھونا ضروری ہیں۔

بقیہ : حریا کی حیرانیاں

کے جیل جانے تک کے حالات ہوجاتے ہیں۔۔۔کسی بھی بچّے کو ہاتھ نہیں لگاسکتے۔۔۔پھر پیرنٹس میٹینگ میں ایسے ایسے ماڈل لوگوں سے سامنا ہوتا ہے کہ بس۔۔۔فٹ بال کی طرح کبھی پرنسپل، کو اوڈینیٹر، کبھی بچّے اور کا بھی پیرنٹس۔۔۔زندگی عذاب ہے۔۔۔میں تو کب کا نوکری چھوڑ دیتا مگر یہ ایک کے بعد ایک ای ایم آئی پیچھا نہیں چھوڑتی۔۔۔گھر، کار۔۔۔''

ہریا ان دوستوں کی باتوں سے جتنا حیران ہونا تھا، ہوچکا تھا۔۔۔اب وہ وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ اس نے ایک ایسی بات سنی کہ اب تک کی ساری حیرانیاں معمولی معلوم ہوئیں۔

''بھائی، بس یوں سمجھ لو کہ۔۔۔اسکول ٹیچر ایک جمورا ہوتا ہے جس کے کئی مداری ہوتے ہیں۔۔۔پرنسپل مداری۔۔۔کواوڈینیٹر مداری، پیرنٹس مداری اور۔۔۔اور سب سے بڑے بچّے مداری۔۔۔ہمیں انگلیوں پر نچاتے ہیں۔۔۔''انل بولتے بولتے تھک گیا تو اس نے چائے کی ڈھبری والے سے ایک سگریٹ مانگا۔

''حقیقت تو یہ ہے دوست۔۔۔ہم سب جمورے ہیں۔۔۔جسے کوئی نہ کوئی مداری نچاتا رہتا ہے۔۔۔''راشد نے فلسفیانا انداز میں کہا۔''سب سے بڑا مداری تو وقت ہوتا ہے دوست۔۔۔''ستیش نے راشد سے بھی زیادہ فلسفیانہ چہرہ بنا کر کہا۔۔۔''جو ہمیں حالات نامی ڈگڈگیوں سے الگ الگ طرح کے عجیب عجیب طریقے سے نچاتا رہتا ہے اور ہم لاچار اس کا کہا ماننے کو مجبور ہوتے ہیں۔''

ہریا اب حیران ہونے سے زیادہ الجھن کا شکار ہوچکا تھا۔۔۔اس نے بہت سے مداریوں کو دیکھا تھا۔۔۔مگر یہ وقت کون ہے؟

اور وہ سب سے بڑا مداری کیسے ہوگیا۔۔۔وہ جلدی جلدی گھر کی طرف چل پڑا۔۔۔وہ سوچ رہا تھا چمکی سے پوچھے گا۔کا تو کسی وقت نام کے مداری کو جانتی ہے، شاید اسے پتہ ہو۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا جھونپڑی کے پاس پہنچا۔چمکی باہر ہی کھڑی تھی۔وہ اپنی سری پانی کی بوتلیں اور دوسرا سامان بیچ چکی تھی۔

ہریا نے پانی بوتلوں کا تھیلا زمین پر رکھتے ہوئے چمکی سے پوچھا۔۔۔''اے چمکی، کیا تو کسی وقت نام کے مداری کو جانتی ہے۔۔۔بہت بڑا مداری ہے۔۔۔نام سنا ہے تو نے کبھی اس کا۔۔۔''

چمکی کی نگاہیں پانی کے اس تھیلے پر تھیں جو ہریا نے ابھی ابھی زمین پر رکھا تھا۔۔۔وہ آگ بگولہ ہوتے ہوئے بولی۔۔۔''میں نہ جانتی کسی وقت نام کے مداری کو، ہوگا کوئی۔۔۔تو یہ بتا، تو نے یہ بوتلیں کیوں نہ بیچیں۔۔۔سب گرم ہوگئیں۔اب تیرا باپ ٹھنڈا کرے گا اسے۔۔۔دوکاندار نے پہلے ہی کہ دیا تھا میں واپس نہیں لونگا۔''

ہریا حیران و پریشان تھیلے اور چمکی کو باری باری دیکھے جارہا تھا۔

مائیکرو فکشن کانفرنس

جمیل احمد عدیل
(جھنگ)

مائیکرو فکشن کو اپنے بطون میں زرخیزی کی ثروت فراواں میسر ہے وگرنہ اس کی متعدد جہات ایک طویل نشست کا موضوع نہ بن پاتیں۔۔۔ امکانات کی مقدار کسی صنف کی حیات کا تعین کرنے میں حیران کن معاونت کرتی ہے۔۔۔حال ہی میں شہرِ مجید امجد ساہیوال میں منعقدہ مذکورہ کانفرنس کے نمایاں شرکائے گفتگو میں: جناب حمید قیصر، محترمہ طلعت زہرا، جناب محمد فاروق اکمل، محترمہ فرحین جمال چودھری، ڈاکٹر فضیلت بانو، ڈاکٹر ریاض ہمدانی صاحب، سید تحسین گیلانی، عزیزم منیر عباس سپرا، شہزاد شاکر طور اور نیلم احمد بشیر کے اسما شامل ہیں۔ فکشن کی اس فرع کے تعلق میں پڑھے جانے والے مقالات اور تقاریر کو بغور سننے کا موقع ملا تو واپسی پر ذہن میں مذکورہ موضوع کی مناسبت سے مالہ وماعلیہ نے چند ترتیبیں بنانے کی مساعی کیں؛ یوں ایک نوع کی حدیثِ نفس ایکٹو ہوگئی؛ جس کا اساسی سوال یہی ہے کہ سب سے پہلے مائیکرو فکشن کو ایک حد تک ڈیفائن کر لیا جائے۔۔۔تسمیہ غالباً زیادہ اہم نہیں۔۔۔عام سوچ اسے 'افسانے کی مختصر صورت' قرار دینے تک رسائی رکھتی ہے جبکہ ایسا نہیں، اس لیے کہ 'مختصر' یا 'طویل' ہونا یکسر اضافی امر ہے۔ عوامل کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایک فرد بیس صفحے کی کہانی کو بھی 'مختصر' گردان سکتا ہے؛ دوسرے کی نظر میں دو صفحے کی قرات بھی بار ہو سکتی ہے؛ اس طرح 'مائیکرو فکشن' کو میکانیکی سطح پر کسی پھیلے ہوئے بیانیے کا محض ملخص کہنا درست نتیجے سے ہمکنار نہیں کرے گا!!

فکشن سے وابستہ اصناف نے اپنے تعینات اور شناخت کے لیے داخلی ہیئتوں پر اصرار کیا ہے اور بجا کیا ہے۔ جہاں صرف 'ڈاؤن سائزنگ' کی کاریگری دکھائی گئی ہے وہاں الگ پہچان کا وجود اپنا ہونا منوا نہیں سکا۔ ہاں! بادی النظر میں 'مائیکرو فکشن' کا اختصار ہی فوری طور پر سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ناولٹ کی بابت بات کرتے ہوئے عمدہ مثال مہیا کی تھی کہ گرامر کی رو سے ناولٹ، ناول کی تصغیر سہی لیکن اس کو مرد کی مشابہت پر بچہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہیں سے روشنی لے کر اس مضمون کی تفہیم ہو سکتی ہے کہ 'مائیکرو فکشن' کا جداگانہ تشخص اس کے: موضوع، مواد، اسلوب، تکنیک اور ٹریٹمنٹ سے ہوگا نہ کہ اس کی مجرد 'مصغر حالت' سے۔ مانا کہ بڑے فکشن رائیٹرز مائیکرو فکشن کی جانب توجہ کر رہے ہیں؛ تسلیم کہ اردو میں اسے رائج کرنے کی کوششیں ثمر آور ثابت ہو رہی ہیں؛ لیکن جب تک ایک مائیکرو فکشن اپنا جواز اس اساس پر فراہم نہیں کر پاتا کہ: یہ حقیقت، یہ واقعہ، یہ خیال۔۔۔بجز مائیکرو فکشن کے کسی اور ''صنفِ فکشن'' میں بیان ہی نہیں ہو سکتے تھے؛ اس وقت تک اسے مضبوط بنیاد نصیب نہیں ہو سکے گی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید صنعتی عہد میں مختصر نویسی نے واقعتاً ایک تقاضے کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن اس سوال کا جواب شاید ایسا سہل نہ ہو کہ ایک داستان اگر اپنی ضخامت میں ناول سے کہیں کم ہو تو کیا کیا جائے گا؟ ظاہر ہے ہمیں پھر یہاں رکنا پڑے گا کہ داستان کا مافوق الفطرت، تخیلاتی بل کہ 'غیر حقیقی' ہونا نیز اس کے ضمنی قصوں کا بکھیڑا اصل قضیہ ہے۔۔۔باقی یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ کیا کسی صنف کے اصول وضوابط پہلے سے وضع کر کے اسے مروج کیا جا سکتا ہے؟ لیکن مائیکرو فکشن کے حق میں سب سے طاقتور دلیل بہرحیث یہ موجود رہے گی کہ اصناف نظم ونثر الہامی نہیں ہیں، نہ ان کے پیراڈائمز حتمیت کی فصیلوں میں مقید ہیں۔ اگر دستور ترمیم آشنا نہ رہے تو بلاشبہ کچھ عرصہ تلک وہ اپنی حفاظت آپ کرتا رہتا ہے مگر مآل کار موت اس کی تقدیر بن کر رہتی ہے!! اور یہ 'مآل کار' بہرحال صدیوں پر محیط نہیں ہوتا!! سو، تعریف کا محاصرہ اس قدر شدید نہ ہو کہ ہر کمک بند کر کے اسے فنا کی طرف دھکیل دیا جائے۔ یہ فطری لچک ہے جو اسے جاری رہنے کے انعام سے فیضیاب کرے گی۔ اصولی سطح پر مائیکرو فکشن کا راستا روکا نہیں جا سکتا، البتہ مستقبل میں اس کی باطنی زیست نے اپنی بقا کا ثبوت دینا ہے لیکن ارتقا کی شرط پوری کر کے، جس میں تدریج کا آہستہ خرام عمل قابلِ ذکر امر ہے، جی ہاں! جیسے موسم کے تغیر کو کیلنڈر کے اعداد اور گھڑی کے ہندسوں میں قطعیت کے ساتھ قید نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مائیکرو فکشن سمیت کسی نئی صنف ادب کو شماریات کے بندی خانے میں اسارت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا!! واقعتاً ایک موسم ٹھہرتا نہیں؛ دوسرے میں منقلب ہو جاتا ہے پر یکا یک نہیں؛ کسی متعین تاریخ کو نہیں؛ اتنے بج کر اتنے منٹ پر نہیں؛ دھیرے دھیرے پیش قدمی کرتا ہے۔۔۔بعینہٖ اسی کی مثال اصناف بھی غیر محسوس طور پر نئی صورتحال کی پیش کار ہو جاتی ہیں لیکن سمے کی گزران کو منہا کرنے پر کبھی اصرار نہیں کرتیں!!

اس معروضی اعتراف کے ساتھ کہ راقم خلاق ہونے کا مدعی نہیں، نہ آئین ساز ہونے کا ادعا لاحق ہے لیکن ایک طالب علم کے طور پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس فکشن رائیٹر کی اس اہم صنف سے ذہنی مطابقت ہے، وہ چند غیر حتمی جہتیں سامنے رکھے تو شاید بہتر رہے گا:

۱۔ فکشن کا اساسی عنصر منہا نہ ہو۔

۲۔ اگر معانی پھیلاؤ پر آمادہ نہیں ہیں تو الفاظ کا سمٹاؤ نری پری مشقت ہی قرار پائے گی۔

۳۔ مائیکرو فکشن کا 'پیس آف لٹریچر' بننا ناگزیر ہے اور وہ اس کی تخلیقی توانائی کے متکلم ہونے سے جڑا ہوا عمل ہے۔

۴۔ مائیکرو فکشن کا متن Un said کی صفت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں رکھتا تو مشکل آن پڑے گی، اسی مقام پر ایک سے زائد پرت کے قضایا کا کٹھن مرحلہ آغاز ہوتا ہے کہ جس ان کہی اور شیڈ کے جداگانہ پہلو

سے اس کے وجود نے آباد ہونا ہے، اس تک ہماشما کی رسائی بازیچہ اطفال نہیں ہوگی۔ ہاں! ایک ہی خواندگی کے خوگر آرام سے سٹک جانے میں عافیت جانیں گے لیکن قرات کا ذوق رکھنے والوں کے فکرونظر میں متعدد اکناف نے نشوونما کے مراحل سے گزرتے رہنا ہے، تادیر۔۔۔

۵۔ فی الوقت یہ عاجز مائیکروف کو: رمزیت، ایمائیت، اشاریت، اخفا اور استتار سے جدا نہیں کر پا رہا ___ یوں علامت اور تجرید دونوں اس کی نشوونما میں کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس نکتے کی تصریح بے محل نہ ہوگی کہ مائیکروف کو کسی: واضح، قطعی اور متعین رنگ کی Solid State حاصل نہ ہونے میں ہی اس کی تفرید مضمر ہے؛ اس کو اعلا لطافت سے جدا کرنا لطف کو زائل کرنے کے مترادف ہوگا؛ اس کا امتیازی وصف سلب کرنے کے مساوی ہوگا۔

۶۔ مائیکروفکشن کا نقاد اسے مانا جائے گا جو مائیکروف کی 'تقطیع' کر سکتا ہو۔

۷۔ خیال ہے مائیکروف میں شامل ہو کر 'رموز اوقاف' نصابی سطح سے اٹھ کر تخلیقی عمل کے مدار میں داخل ہو جائیں گے۔

۸۔ آخری بات:

مائیکروف کسی ذہنی ورزش کا عنوان نہیں ہے؛ نہ کم لفظوں میں کہانی نویسی کا انعامی مقابلہ؛ اس کے قلب القلوب کا مرکزہ اپنی ماہیت میں موہوم کے مساوی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کا منصب زندگی کی لطیف ترین صورتحال کو لطیف ترین پیرایے میں ڈھالنا ہے؛ جس نے ممکنہ محدود متن قاری کے سپرد کر کے اس کے وجود میں کہرام سا برپا کر دینا ہے؛ گویا مائیکروف تو مضراب ہے اور قاری کی روح ساز ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مثالی مائیکروف کو مثالی قاری ملتا ہے یا نہیں؟ ہاں! یہ آرزو ضرور ہے کہ مائیکروف اپنی جگہ اس طرح بنائے کہ کبھی 'پاپولر لٹریچر' کی تہمت اس کا مقدر نہ بنے!!

لہٰذا اب مائیکروفکشن نگار اور اس کے قاری، دونوں نے ارتقائی مراحل طے کرنے ہیں اور ظاہر ہے ہتھیلی پہ سرسوں نہیں جمائی جا سکتی!! یہ چنار کا درخت ہے، چلیے صدیاں نہ سہی، دہائیاں تو بیتیں گی!! لیکن اس باضابطہ طرف نے بہرطور مستحکم رہنا ہے کہ 'اصولی سہولت' میں قاری رہے گا، لکھاری، نہیں کہ مائیکروف رائیٹر نے کہیں زیادہ دشوارگزار جادے کا چناؤ کرنا ہے۔ یعنی عبارت میں Economy of Words اور Brevity وغیرہ ایسے اوصاف کی شمولیت پھر بڑے درجے کا کھیل نہیں ہے۔ اصل جادو خیال کے اعماق اور مضمون کی وسعتوں کو گزند سے بچانا ہے۔ بس برقی توانائی بنا کسی تخفیف کے Needle's Eye میں سے گزر جائے۔ ایسے میں سچ عریانی پر بھی نہ اترے، افسانے کی روح 'افسانہ پن' بھی قائم رہے!! ایک طرف اتنی آہن گداز جہد اور اس کے ہمراہ عدم تحفظ کا احساس، کیونکہ متداول صنف میں لکھنے والا Secure ہو کر لکھتا ہے، اسے صرف مظروف کا چیلنج درپیش ہوتا ہے، ظرف کا نہیں۔۔۔

''ابتدا میں یہاں دریا تھا/ دریا سڑک بن گیا/ سڑک کی شاخیں ساری دنیا میں پھیل گئیں/ سڑک پہلے دریا تھی، اس لیے ہمیشہ بھوکی رہتی!!''

یہ 'مائیکروف' پڑھتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ اس عاجز کے مقدمے کو عملی نظیر میسر آ گئی ہے ___ جبکہ یہ مائیکروف نہیں، Ben Okri کے ناول: The Famished Road کی ابتدائی سطور ہیں ___ آیئے مل کر کسی 'باقاعدہ مائیکروف' کی جستجو کریں!! تاہم مراد بر آنے تک قلب میں ترازو ہو جانے والے محولہ بالا طلسم سے نورکشید کرتے رہنے میں کیا مضائقہ ہے!!!

اختتامی کلمے کے طور پر کانفرنس کے مرکزی منتظم اور اردو مائیکروفکشن کے بنیادگزاروں میں شامل سید تحسین گیلانی سے قدرے بے تکلف ہو کر کہنا ہے: میرے عزیز! اس صنف کو سرد و گرم چشیدہ ہونے دو! اپنے مخصوص مزاج کے مطابق عجلت کا مظاہرہ نہ کرنا کہ یہ سچ ہے جو جلدی جوان ہو جاتے ہیں وہی جلدی بوڑھے بھی ہو جاتے ہیں!! نیز مکالمہ ضرور جاری رکھو لیکن اس نوزائیدہ کو انکوبیٹر میں رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا اور Pre-emptors کی مخالفت سے بھی نہ گھبرانا! بھلے ہی مائیکروف کے آخر میں روف/ اوف کی صوت سے ''ادبی سرمایا دار'' بدک اٹھیں، دیکھو دیکھو! یہ تو نری پری اشتراکیت کی بازگشت ہے!!

اورحان پاموک

۲۰۰۶ء نوبل انعام یافتہ ترک ادیب آٹھویں لاہور لٹریری فیسٹیول میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ جہاں پہلے نوجوان اہلِ قلم سے گفتگو کے سیشن میں اورحان پاموک نے کہا کہ ''ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ کرداروں کے ساتھ پوری طرح انصاف کرے۔ میں نے اپنے ناول کے کرداروں کو قاری کے لیے آسان اور پُرکشش بنانے کے لیے جدیدت کے تجربات بھی کیے ہیں جس پر مجھے فخر ہے۔ ناول کے ذریعے قاری کو میں نے اپنے تجربات و احساسات میں شریک کر کے خوشی حاصل کی ہے اور آئندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔

○

اک گم شدہ شناخت

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

کورونا وائرس کے فتنے سے پریشان تقریباً ساری دنیا کے انسان مسلط کردہ لاک ڈاؤن میں قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی بندہ طبعی موت بھی مر جاتا ہے تو اس کی تجہیز و تکفین اور آخری رسومات ادا کرنے میں خود اس کے افرادِ خاندان پس و پیش کرتے ہیں جیسے تیسے مرنے والے کو اس کی آخری منزل تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سرکاری طور پر ادا کی جانے والی رسومات عبرت خیز ہوتی ہیں ایسے ہی نفسانفسی کے ماحول میں اردو ہندی کے ایک بے لوث اور مخلص قلم کار انل ٹھکر 4 فروری 2020 کو قیدِ حیات و بندِ غم سے آزاد ہوگئے۔ فون اُٹھاتے ہی ''السلام علیکم'' بولنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ راولپنڈی کا ''چہارسو'' مجھے ہمیشہ انل ٹھکر ہی کے توسط سے ملا کرتا تھا۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میرے نام کوئی شمارہ نہ بھی آئے تو وہ اپنا رسالہ مجھے بھیج دیا کریں گے۔ جب کبھی میرا کوئی مضمون یا غزل چہارسو میں شائع ہوتی تو اس کی اطلاع انل ٹھکر صاحب ہی سے ملتی تھی۔

جناب انل ٹھکر کی پیدائش 6 جون 1934 کو ورسامیڈی (ضلع کچھ) گجرات میں ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم لائل پور موجودہ فیصل آباد پاکستان میں ہوئی۔ ان کا اصل نام چتر بھج ٹھکر تھا وہ اردو ہندی گجراتی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ بھارت میں ہبلی کرناٹک میں آکر بس گئے۔ اسکول آف آرٹ کی ہم جماعت گریجا سے 1953 میں شادی کی۔ انل ٹھکر کے پسماندگان میں ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہی نہیں بلکہ ہندو پاک کے کئی فرزندان و دختر ان ادب ہیں جو ان کے قلم کے وارث ہیں۔ انل صاحب نے نہ صرف ان گنت افسانے لکھے بلکہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے۔ ان کے ڈرامے خالی خانے 1982، اندھے رشتے 1986 اور چوتھی دیوار 2006 میں منظر عام پر آئے۔ انل ٹھکر نہ صرف ڈرامے لکھتے تھے بلکہ سٹیج بھی کیا کرتے تھے۔ ڈراموں کی ہدایت کے ساتھ ساتھ اداکاری کے جوہر بھی دکھایا کرتے تھے۔

ان کے افسانوں پر مشتمل مجموعے گرم برف 1990، موسمی پرندے 1999، صفر ضرب صفر 2007، نادیدہ فصیل 2018 میں منظر عام پر آئے۔ انل ٹھکر کے تقریباً سبھی افسانے کنڑی زبان میں ترجمہ ہو کر موقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ایک ڈرامہ ''چوتھی دیوار'' کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہے جس کا کنڑی زبان میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ان کے ناول اوس کی جھیل 2002، خوابوں کی بیساکھیاں 2008، رشتے 2012، گم شدہ شناخت 2014، پیشِ اشک 2017، اردو ہندی حلقوں سے داد پا چکے ہیں۔ ان کا ایک اور ناول گناہِ کبیرہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے 2019 میں شائع ہوا۔ ان کی تقریباً ساری کتابیں اسی مطبع سے شائع ہوئی ہیں۔

انل ٹھکر ایک حساس قلم کار ہیں۔ ان کی زندگی زیادہ تر مسلمانوں کے درمیان گزرتی رہی۔ اس لیے ان کے مسائل کو انھوں نے بڑے بے باکانہ اسلوب میں اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں پیش کیا۔ ان کی بے باکی میں بے لوثی بھی شامل ہے۔ بے لوثی، بے غرضی و بے نیازی ہی تو بے باکی کی بنیاد بنتی ہے۔ شعبہء اردو و فارسی کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ سے جناب محمد غوث برچھی والے نے انل ٹھکر شخصیت اور فن پر 2007 میں پی ایچ ڈی کی، گلبرگہ یونیورسٹی سے شمیم ریحانہ نے ''انل ٹھکر بہ حیثیت ڈرامہ نگار'' 2007 میں ایم فل کے لیے مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ میسور یونیورسٹی میں بھی انل ٹھکر کے فکر و فن پر Ph.D کے لیے ریسرچ جاری ہے۔ تین روزہ عالمی کانفرنس برائے امن ۲۱ تا ۲۳ دسمبر ۲۰۱۳ء میں انل ٹھکر کو لاہور پاکستان مدعو کیا گیا تھا جہاں آپ نے مقالہ پیش کیا اور مہمان نوازی کا لطف اٹھایا۔

انل ٹھکر بھی عجیب بے نیاز ناول نگار ہیں۔ ان کا ہر ناول بغیر کسی تمہید کے یک دم شروع ہو جاتا ہے۔ نہ ابتداء میں کوئی مقدمہ، پیش لفظ ہوتا ہے نہ ناول نگار کا کوئی تعارف ہی ہوتا ہے۔ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اب تک کیا کیا لکھا؟ کسی قسم کی ذرا سی بھی معلومات ناول میں نہیں ہوتی ورنہ ہمارے بیشتر ادیب و شاعر کی ہر کتاب میں اس کی پچھلی شائع شدہ کتابوں کی تفصیل اور آئندہ یا زیرِ ترتیب کتابوں کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں مگر انل ٹھکر کی ہر کتاب اس قسم کے تکلفات سے عاری ہوتی ہے۔ انل ٹھکر کے موضوعات بھی منفرد ہوتے ہیں۔ کوئی مسلمان اگر ایسے کسی موضوع پر قلم اٹھائے تو خود اُسے اٹھا لیا جائے۔ ایسے قلم کار کے لیے نوبیل انعام سے بھی بڑا انعام یہ ہوگا کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے تاکہ وہ چین سے لکھ سکے۔ اس کے ساتھ وہ سلوک نہ کیا جائے جیسا کرناٹک کے کلبرگی اور گوری لنکیش کے ساتھ کیا گیا۔

ان کا ناول ''رشتے'' ایک ایسی ماں کی دکھ بھری کہانی ہے جو کافی دولت مند ہونے کے باوجود ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تسکین کے لیے کسی یتیم خانے سے ایک بچی لا کر پالتی ہے۔ ناز و نعم میں پلنے والی بچی کو بالغ ہونے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اس کو پال پوس کر بڑا کرنے والی اس کی حقیقی ماں نہیں ہے۔ وہ اس یتیم خانے کی تلاش میں گھر چھوڑ دیتی ہے۔ یتیم خانے کا پتہ بتانے کے نام پر ایک غنڈہ اس کا اغوا کرتا ہے مگر اس کا ایک ساتھی غنڈہ جو خود بھی یتیم خانے کا پلا بڑھا ہے اس لڑکی کی آبرو بچا کر اسے اس کے ماں باپ کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اس لڑکی کو احساس دلاتا ہے کہ جنھوں نے تمھیں آرام و آسائش کی زندگی دی وہ بے حد احترام و عزت کے لائق ہیں نہ کہ وہ ماں جس نے جنم دے کر بچی کو یتیم خانے کے حوالے کر گئی۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی موضوع ہے

جس کو بڑے سلیقے سے انل ٹھکر نے برتا اور ایک کامیاب ناول لکھا۔اس پر فلم بنائی جاسکتی ہے بلکہ ایسی فلم بنی بھی ہے۔

انل ٹھکر کا ایک اور بے پناہ ناول ''پسِ اشک'' بھی اقلیتوں کے مسائل سے جوجھتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ملک کی آزادی سے پہلے اور مابعد کے حالات میں اس ناول کے کردار سانس لیتے ہیں۔ایک معمولی ٹیچر قوم کی خدمت میں اونچ نیچ سے گزرتا ہے کیوں کہ وہ قوم کا معمار ہے۔اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ آدمی کو اپنی علمی جدو جہد جاری رکھنی چاہئے۔یہ معمولی ٹیچر اپنے خسر سے حکمت بھی سیکھتا ہے۔اس طرح نونہالوں کے ساتھ ساتھ ضرورت مندوں کا بروقت علاج کر کے انھیں نئی زندگی بخشتا ہے۔اسکول کی ترقی خودگاؤں کے ایک مسلم ذمہ دار کو ایک آنکھ نہیں بھاتی چنانچہ ٹیچر اپنا استعفیٰ پیش کر کے ملازمت ہی چھوڑ دیتا ہے۔ٹیچر اپنی اکلوتی ہونہار بیٹی کی شادی اپنے سالے کے لڑکے سے کرتا ہے جو جنگلات کا رشوت خور اور شرابی آفیسر نکلتا ہے۔

انل ٹھکر صاحب نے اس ناول میں عام حنفی مسلمانوں میں مروج تین طلاق کے مسئلے کو بھی اٹھایا ہے کہ کس طرح جاہل مسلمان نشے اور غصے کی حالت میں بیوی سے سخت ناراض ہو کر ایک ہی مرحلے میں تین طلاق دے کر اپنی اور اپنی بیوی کی بھی زندگی برباد کر دیتے ہیں اور بچوں کو بھی نفسیاتی مریض بنا کر چھوڑتے ہیں۔قرآن وحدیث میں تو بڑی سہولتیں حاصل ہیں مگر مسلمان بندہ فقہی بکھیڑوں میں پڑھ کر پچھتاتا رہتا ہے۔ٹیچر کی بیٹی نغمہ کو اس کا شوہر اختر شراب پینے پر مجبور کرتا ہے۔انکار پر نشے کی جھونک اور غصے میں اسے طلاق دے دیتا ہے۔بعد میں وہ عیاشی کرتا رہتا ہے۔ایک دیوداسی کے حسن کا شکار ہو کر AIDS میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس دوران اُس کی مطلقہ بیوی نغمہ اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر ہو جاتی ہے جس کے دواخانے میں وہ علاج کے لیے داخل کیا جاتا ہے۔آخر کار وہ دورانِ علاج ہی مر جاتا ہے۔برے کا انجام برا ہوتا ہے۔انل ٹھکر نے سمجھ میں آنے والی آسان زبان میں سمجھ میں آنے والے مسائل پر ناول لکھ کر سمجھ بوجھ کی زندگی گزارنے کا پیغام دیا ہے تاکہ بہتر سماج قائم ہو۔

ان کے تازہ ترین بلکہ آخری ناول ''گناہِ کبیرہ'' کا بنیادی کردار ایک غریب گونگا بہرہ بچہ طارق ہے جو اپنی بے بسی پر اللہ تعالیٰ سے شاکی ہے۔پھر ایک ہمدرد ڈاکٹر کے ہاتھوں اس کی سماعت و گویائی بحال ہوتی ہے۔اب وہ لڑکا شعلہ بیان مقرر ہے۔ناول میں ایک ہندو لڑکی جانکی کا کردار بھی دکھایا گیا ہے جو اپنے ہم جماعت مسلمان رفیق سے محبت کرنے لگتی ہے اسے لَو جہاد کا نام دے کر اس لڑکے کا قتل کر دیا جاتا ہے۔یہ گونگا بہرہ لڑکا جواب صحت مند نوجوان بن چکا ہے اس لڑکی کے دواخانے کا منیجر ہے۔اس لڑکی نے اُسے بھائی بنا رکھا ہے۔یہ لڑکا اپنی منہ بولی بہن کی عزت وعصمت کو بدکردار سماجی ٹھیکیداروں سے بچانے میں ان کا قتل کر دیتا ہے اور خود کو پولیس کے حوالے Surrender کر دیتا ہے۔اس کا ان کاؤنٹر کر دیا جاتا ہے۔اس میں کچھ اور بھی کردار ہیں جو اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔دادی ماں جب بچوں کو کہانی سناتے ہوئے کسی کردار کو ادھورا چھوڑ دیتی ہے تو بچے اُسے یاد دلاتے ہیں کہ پھر اُس کردار کا کیا بنا؟ تب دادی کہانی کے تانے بانے میں اس کو کھینچ لاتی ہے اور قابل قبول انجام تک پہنچاتی ہے۔آج تو انٹرنیٹ کے دور کے بچے ہیں مگر کہانی کار دادا سے کیسے پوچھیں کہ وہ خود گم ہو گیا ہے۔

نیوگ کے موضوع پر لکھا ہوا انل ٹھکر کا ناول ''خوابوں کی بیساکھیاں'' پڑھ کر میں نے لکھا تھا کہ اگر اسے سلمان رشدی نے قلم بند کیا ہوتا تو اس کے ہاتھ قلم کر دیے جاتے اور قاضی عبدالستار نے لکھا ہوتا تو ان کا سر قلم کر دیا جاتا اس موضوع پر لکھنے کے لیے کلیجہ چاہیے اور یہ کلیجہ نام نہاد So Called مسلمان بھی لا نہیں سکتا ورنہ اس کا وہی حشر ہوتا جو ایم ایف حسین کا ہوا۔تسلیمہ نسرین تو کیا سلمان رشدی کو بھی غیر مسلم تو مسلمان ہی سمجھتے ہیں۔اپنے گھر پر گنیش کی پوجا کرنے اور کروانے کا اہتمام کرنے کے باوجود غیر مسلم کی نظر میں سلمان خان تو مسلمان ہی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ انل ٹھکر مسلمان نہیں ہیں ورنہ ''خوابوں کی بیساکھیاں'' جیسا ناول لکھنے کی پاداش میں پتہ نہیں کیا ہو جاتا بلکہ کیا کیا ہو جاتا۔

ناول کی ہیروئین منگلا پیاسی عورت ہے۔اس کا جاگیردار شوہر بسوراج اس کی پیاس بجھانے سے قاصر ہے۔شادی ہو کر سترہ سال گزرنے کے باوجود وہ کنواری ہی ہے۔اس کی ساس کو اپنی جاگیر بچانے کے لیے وارث کی ضرورت ہے۔مقامی بڑے پنڈت کے مشورے سے نیوگ کے تحت چھوٹے سنیاسی سوامی کے ذریعے راز دارانہ طور پر منگلا کو ماں بنانے کے جتن کیے جاتے ہیں۔منگلا تو بے چاری پیاسی ہی تھی وہ خوشی سے راضی ہو جاتی ہے۔بچہ پیدا ہوتا ہے تو ساس تو وارث پا کر نہال ہو جاتی ہے۔اس کے بعد منگلا اور چھوٹے سوامی کو ایک دور دراز مقام لے جا کر ندی میں غرقاب کروا دیتی ہے۔نیوگ کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کے موضوع پر ایک ہندو قلم کار ہی کھل کر لکھ سکتا ہے۔ویسے بھی بانجھ پن Infertility کے تدارک کے نام پر عورت کے رحم میں کسی غیر مرد کا نطفہ داخل کرنے کا کاروبار زور وشور سے مہذب سماج میں جاری ہے جو نیوگ کی ترقی یافتہ شکل ہی تو ہے بھلے ہی ترقیِ معکوس ہی سہی۔اب تو Surrogate Baby بھی پیدا کیے جا رہے ہیں جنھیں قانونی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔بہر حال انل ٹھکر نے بڑے حساس موضوع کو برت کر ادبی دنیا کو چونکا دیا تھا۔فن کار جب اپنے فن سے چونکاتا ہے تبھی زندہ رہتا ہے اور انل ٹھکر کو چونکانا خوب آتا ہے۔انل ٹھکر نے اس میں جہاں مذہبی ٹھیکیداروں کی عیاشیوں کا پردہ فاش کیا ہے وہیں عورت پر عورت ہی کی خودغرضی اور ظلم وزیادتی دکھائی ہے۔

نیوگ کے انوکھے موضوع پر انوکھا ناول ''خوابوں کی بیساکھیاں'' کے بعد دہشت گردی کے دہشت ناک موضوع پر ''گم شدہ شناخت'' لکھ کر چونکانے کی اپنی روایت برقرار رکھی ہے۔کتاب اپنے انتساب ہی سے بولنے لگتی ہے۔

''ان بے قصوروں کے نام
جنھیں دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں

جیلوں میں بند کر دیا گیا''۔

یہ ناول دہشت گردوں کی کارستانیوں کی روداد سناتا ہے جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلاسبب بے گناہ افراد جیلوں میں ناکردہ گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ کئی مسلمان بچے بارہ پندرہ تیس سال کی جیل کاٹنے کے بعد رہا کیے گئے کہ اُن کا جرم ثابت نہیں ہوا۔ ان کے باعزت بری ہونے کی خوشی تو ہوتی ہے مگر ان کی زندگی کے وہ قیمتی سال انھیں کون واپس دلا سکتا ہے اور پھر انھیں سماجی مرتبہ بھی کیا مل سکے گا؟ یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے، ایسے حساس موضوع پر قلم اٹھا کر انل ٹھکر بڑی جواں مردی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی حق گوئی و بے باکی کو سلام۔ کوئی تو ہے جس کے

قلم میں خون ہے لیکن قلم پہ خون نہیں
کہ لکھنے والے بڑے ہی ہنر سے لکھتے ہیں

فی نفسہٖ کوئی دہشت گرد نہیں ہوتا بلکہ بنایا جاتا ہے۔ ظلم سہنے کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ بے قصور کو سزا دینا گویا اُس کے دل میں نفرت کا بیج بونا ہے۔ انل ٹھکر جیسے بے باک قلم کار ہی ایسے حساس موضوع کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ حیرت ہے کہ انل ٹھکر نے ایسا خطرناک موضوع چن کر اسے بے باکی سے ناول کے حوالے کر دیا۔ انل ٹھکر قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے مظلوموں کی حمایت میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ ساری حساس دنیا جانتی ہے کہ بیشتر مقامات پر بم ساز و بم انداز وہ نہیں ہیں جو قرار دیے گئے ہیں بلکہ وہ ہیں جن سے چشم پوشی کی گئی، جن پر اعلیٰ پشت پناہی کی وجہ سے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکا۔ انل ٹھکر کا ناول ''گم شدہ شناخت'' ایسے ہی کرداروں سے روشناس کرواتا ہے جن کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ جو سماج میں عزت دار کہلائے جاتے ہیں مگر گھناؤنا روپ رکھتے ہیں۔

سیاست دانوں کو آگے چل کر اندیشہ ہوتا ہے کہ رامانند سوامی یہ راز اگل دے گا کہ اس نے فسادات محض انہی سیاست دانوں کے کہنے پر کروائے تھے اسی لیے رامانند سوامی کو بھی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ اگر راز کو راز نہ رکھا گیا تو جیل ہی میں اس کا قتل کروا دیا جائے گا اور اس کے قتل کے لیے ایک پیشہ ور قاتل کو سپاری بھی دی جاتی ہے مگر اس پیشہ ور قاتل کو جیل کا مسلمان قیدی پکڑ لیتا ہے اور سوامی رامانند کی جان بچاتا ہے جنھیں گولی لگتی ہے پھر وہ سوامی کو اپنا خون بھی دیتا ہے تا کہ سوامی کی جان بچ جائے۔ یہ وہی مسلمان قیدی (امجد) خان بابا ہے جس پر اپنے ہی دوست شمشیر سنگھ کے قتل کا الزام ہے۔ سوامی رامانند جب اپنے کیے پر شرمندہ ہو کر سیاست دانوں کی پول کھولنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کو پاگل بنانے کا انجکشن دے کر پاگل خانہ بھجوانے کے جتن کر دیے جاتے ہیں تا کہ اصل مجرموں کے چہروں سے نقاب اترنے نہ پائے۔ البتہ اشوک کو اپنے باپ شمشیر کے قاتلوں کا پتہ چلتا ہے تو وہ دلاور سنگھ اور حکم سنگھ کا قتل کر دیتا ہے۔

اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ تمام واقعات ایسے مربوط ہیں کہ قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہیں۔ بعض واقعات اپنی جگہ ایک مکمل کہانی کا حسن بھی رکھتے ہیں۔ جیسے حاجی صاحب کے گھر میں کام کرنے والی نورا (فخر الدین کی بیوی) کی عصمت دری کرفیو کے دوران کالج سے جلد گھر آ جانے والا حاجی صاحب کا بیٹا افضل کرتا ہے جب کہ حاجی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ گھر سے باہر کسی عزیز کے پاس گئے ہوئے تھے۔ گھر لوٹ کر وہ دیکھتے ہیں کہ نورا نے خودکشی کر لی ہے۔ سبب ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن چھان بین کے بعد انسپکٹر افضل کو حوالات میں بند کر کے حاجی صاحب سے معقول رقم لے کر اُسے رہا کرتا ہے اور یوں حاجی صاحب کی نیک نامی متاثر ہونے سے رہ جاتی ہے۔ اس طرح یہ ذیلی کہانی ناول کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ مکمل ہے۔ سماج کے چند کھوکھلے کرداروں پر روشنی ڈالتی ہے ناول کے ایک باب کے طور پر یہ کہانی ''چہارسو'' راولپنڈی میں شائع ہو چکی ہے۔

نیا نیا دولھا رفیق، ڈاکٹر ارمان اور دینی مدرسے کا مولوی فخر الدین اور خان بابا ناکردہ گناہ کے سبب جیل میں سڑ رہے ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ سوامی کے اعترافِ گناہ سے انھیں رہائی کی امید بندھی تھی مگر اس پر پانی پھر گیا۔ ایسے کئی کردار حقیقی زندگی میں بھی منظرِ عام پر آئے جو اصل مجرم قرار پائے۔ مگر ٹھاٹ سے آزادانہ جی رہے ہیں جب کہ کئی نوجوان جو رہائی کی اُمید میں جیل کاٹ رہے ہیں وہ معجزے کے منتظر ہیں۔ یہی انل ٹھکر کے ناول کے کردار ہیں۔ ان کے انجام سے خود ناول نگار بھی بے خبر ہے اس لیے انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی نادم سوامی یا کوئی دیانت دار کرکرے سامنے آتا بھی ہے تو اسے منظر سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

قابلِ مبارکباد انل ٹھکر نے ایک حساس موضوع پر دل کو چھو لینے والا ناول لکھ کر ان بے گناہوں کی طرف توجہ دلانے کے جتن کیے جو ناکردہ گناہی کی سزا جھیل رہے ہیں۔ ہم دعا کر رہے تھے کہ اللہ اس ادبی کرکرے کو سلامت رکھے۔ مگر افسوس کہ 4 فروری 2020 کو چپکے سے یم دوت نے اس کا کام تمام کر دیا۔

فلائنگ کار

این۔ ای۔ سی۔ کارپوریشن جاپان نے پہلی ہوائی گاڑی متعارف کرانے کا تجربہ کیا ہے۔ سرِ دست اس ہوئی گاڑی نے ایک منٹ کی اڑان بھر کر تجربے کو کامیاب ہونے کی نوید دی ہے۔ این۔ ای۔ سی کے ذمہ داران کو اُمید ہے کہ ون سیٹر ہوائی کار دو ہزار تیس (۲۰۳۰ء) تک فروخت کے لیے مارکیٹ دستیاب ہوگی۔ جس سے ڈاک کی ترسیل کا کام لیا جائے گا۔ اس کامیاب تجربے کے بعد دو ہزار تیس (۲۰۳۰ء) سے یہ انسانی سفر کے کام آ سکے گی۔

ایک صدی کا قصّہ

پردیپ کمار
دیپک کنول (ممبئی)

اُسکی پہچان دوتلوار کٹ مونچھیں، اُسکے چوڑے چکلے شانے، گالوں میں پڑنے والے گڑھے ،زیتونی رنگت ،اوراُسکے چلنے کا شاہانہ انداز تھا۔ان خوبیوں نے اُسے فلمی دنیا کا شہزادہ اور بادشاہ بننے کا موقع فراہم کیا۔وہ کمال کا آدمی تھا۔وہ حقہ بھی اُسی نزاکت سے پیتا تھا جس نزاکت کے ساتھ وہ اپنا من پسند سگریٹ سٹیٹ ایکسپریس پیتا تھا۔وہ بنگالی ہوکے بھی جس عمدگی سے اُردو بولتا تھا، فلمی شائیقین یہی سمجھتے تھے کہ وہ لکھنو کا کوئی نواب ہے۔یہ یقین کرنا بڑا مشکل تھا کہ وہ بنگالی ہے۔اس انسان کا نام پردیپ کمار تھا۔

پردیپ کمار کا اصلی نام سیتل بیتی بیال تھا۔وہ چار جنوری 1925 کو مغربی بنگال کے شہر کلکتہ میں پیدا ہوا۔سترہ سال تک وہ پڑھائی میں مصروف رہا۔ بچپن سے ہی اُسکا یہ شوق تھا کہ وہ اداکار بنے۔وہ اپنے خواب کو اپنے سینے میں سترہ سال تک پالتا رہا۔سترہ سال کا ہونے کے بعد اُسنے ایک دن اپنے باپ کے سامنے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اداکار بننا چاہتا ہے۔اُسکا والد اُسکے فیصلے سے بر افروختہ ہواُٹھا اوراُس نے اُسکے فیصلے کو سختی سے مسترد کر دیا مگر وہ تو یہ طے کر کے بیٹھا تھا کہ اُسے اداکار بننا ہے اسلئے اُسنے باپ کی ایک نہ سنی اوراپنے شوق کی تکمیل کے لئے وہ گھر سے نکل پڑا۔وہ اپنی منزل پانے کے لئے کئی دنوں تک ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔اُسکا مقصد تھا اداکار بننا تھا سواُسنے اسٹیج سے شروعات کی۔گھر والوں نے تو حقہ پانی بند کر دیا تھا اسلئے اپنا خرچہ پانی نکالنے کے لئے وہ فالتو وقت میں ایک ریسپشنسٹ کی نوکری بھی کرتا تھا۔

چند ناٹکوں میں کام کرنے کے بعد اُسنے فلموں میں قسمت آزمائی کی سوچی۔یہاں اُسے اداکار کا کام تو نہیں ملا البتہ اُسے کلکتہ کے اروراہ اسٹوڈیو کے ایک کیمرہ مین کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔وہ اپنے سامنے فلمی اداکاروں کو کام کرتے دیکھتا تھا تو اُسکے اندر کام کرنے کی للک اور زیادہ بڑھ جاتی تھی اوروہ خلوت میں بیٹھ کر اُن اداکاروں کے کام کی نقل کرتا تھا۔اسٹوڈیو میں کام کرنے کے باوجود اُسنے اسٹیج سے کنارہ نہیں کیا۔ایک دن فلمستان اسٹوڈیو کے مالک دیبکا بوس جو کہ بنگالی نژاد تھے نے اُسے ایک ناٹک میں دیکھا۔فلمستان والے ہمیشہ نئے چہروں کی تلاش میں رہتے تھے۔دیبکا بوس نے جب اس نوجواں کا ناٹک دیکھا تو اُنہیں اس کا کام بڑا پسند آیا اور اُنہوں نے اسے اپنی نئی بنگالی فلم ''کرشن لیلا'' میں لیا جو کہ 1946 میں ریلیز ہوئی۔اسکے بعد اُسے فلم ''الکھ نندا'' میں لیا گیا۔یہ فلم 1947 میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ان دونوں فلموں کے ہدایت کار وہ خود تھے۔ایک اور ہدایت کار نے بھی اُسکا ناٹک دیکھ کے اُسے پسند کیا۔اُس ہدایت کار کا نام ہیمنت گپتا تھا۔۔وہ اُسکے کام سے کافی متاثر ہوااور اُسنے اُسے اپنی بنگالی فلم کے لئے سائن کیا۔اس فلم کا نام ''بھولی نائی'' تھا جو کہ 1948 میں ریلیز ہوئی۔اسکے بعد دیبکا بوس نے اُسے ایک اور فلم کے لئے سائن کیا جس کا نام ''42'' تھا جو کہ 1951 میں ریلیز ہوئی۔ان ساری بنگالی فلموں میں وہ سیتل بیتی بیال کے نام سے پیش ہوا۔

ہندی فلموں کے جانے مانے فلمساز ایس مکھر جی جو کہ بنگالی نژاد تھا نے ہیمنت گپتا کی فلم ''بھولی نائی'' دیکھی۔اُسے فلم پسند آئی اور اُسنے اس فلم کو ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا۔اُسنے اس کے ہدایت کار کو بمبئی بلایا اور اُسکے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ ہیرو سیتل بیتی بال ہی رہے گا۔ایس مکھر جی نے ہیمن گپتا سے کہا کہ وہ ہیرو کو لے کے بمبئی آجائے۔ہیمن گپتا پردیپ کمار کو بمبئی لے آیا۔ایس مکھر جی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہیمن گپتا کے ساتھ مل کر اُسکا نام بدل ڈالا۔دونوں نے مل کر اُسکا نام پردیپ کمار رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ فلم شروع ہوجائے سر منڈھاتے ہی اولے پڑ گئے۔بمبئی میں دنگے پھوٹ پڑے۔فلم شروع نہ ہوسکی اور پردیپ کمار کو مایوس ہوکے واپس لوٹنا پڑا مگر اُسے زیادہ دنوں تک انتظار نہ کرنا پڑا۔۔ایس مکھر جی پردیپ کمار کو بھولا نہیں۔چند مہینوں کے بعد پردیپ کمار کو ایس مکھر جی کا بلاوا آ گیا۔ہیمنت گپتا کی فلم شروع نہ ہوسکی۔ایس مکھر جی نے اُسے فلم ''آنند مٹھ'' کے لئے سائن کیا جسمیں اُسکے مدمقابل قد آور اداکار پرتھوی راج کپور اور فطری اداکاری کی ملکہ گیتا بالی تھے۔اس فلم کی کہانی اٹھارویں صدی کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔یہ ایک وطن پرست کی کہانی تھی۔اسمیں پردیپ کمار کا رول بڑا دم دار تھا۔اس فلم کا یہ گانا ''وندے ماترم'' ایک طرح سے قومی ترانہ بن گیا تھا۔

فلم ''آنند مٹھ'' کی کامیابی سے خوش ہوکر ایس مکھر جی نے پردیپ کمار کو ایک اور بڑا تحفہ دیا۔اس بار پردیپ کمار کے لئے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ایس مکھر جی اُسے فلم ''انارکلی'' میں بڑے پیمانے پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ایس مکھر جی اس فلم کو بڑے پیمانے پر بنانا چاہتا تھا۔سلیم انارکلی کی لافانی محبت پر بننے والی اس فلم کی کہانی مشہور ہدایت کار اور فلم ساز ناصر حسین نے لکھی تھی۔اسے موسیقی سے آراستہ کرنے کا کام اپنے زمانے کے چوٹی کے سنگیت کار سی رامچند رکو سونپا گیا تھا۔اس میں پردیپ کمار کی ہیروئن بینا رائے تھی۔چونکہ پردیپ کمار بنگالی نژاد تھا۔اسکے لئے اُردو بولنا اتنا آسان نہ تھا اسلئے پردیپ کمار نے اسے اپنے لئے چیلنج سمجھ کر بہت جلد نہ صرف اُردو سیکھی بلکہ ایس مکھر جی نے اُسے شہزادہ سلیم بننے سے پہلے پوری ٹریننگ دلوائی کہ ایک شہزادہ کیسے چلے گا۔کیسے بات کرے گا۔اُسکی چال ڈھال میں ایک شاہانہ انداز لانے کے لئے اُسنے خاصی محنت کی۔اُسکی محنت رنگ لائی۔فلم نے ملک بھر میں دھوم مچائی۔اس فلم میں ایک درجن کے قریب گانے تھے۔اسمیں ایک

گانا تھا۔محبت میں ایسے قدم لڑکھڑائے، زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔ایس مکھر جی نے اس گانے پر کافی اعتراض کیا اور سی راجندر سے کہا کہ وہ یہ گانا اس اس فلم سے باہر کردے کیونکہ یہ گانا کسی کو ٹھے کا لگتا ہے اور اس فلم کے مزاج سے میل نہیں کھاتا ہے۔اُس نے لتا منگیشکر کے لئے بھی چند نازیبا الفاظ کا استعمال کیا جس پر سی راجندر کافی ناراض ہوا۔اب کے سی راجندر بھی اڑ گیا کہ اگر یہ گانا اس فلم سے ہٹے گا تو وہ یہ فلم چھوڑ دے گا۔مجبوراً یہ گانا فلم میں رکھنا پڑا۔خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس گانے نے ایسی دھوم مچائی کہ فلمی شائقین اس گانے کو دیکھنے اور سننے کے لئے بار بار تھیٹر میں آنے لگے۔اس گانے کی سحر کاری کو دیکھ کر ایس مکھر جی کو لتا منگیشکر سے معافی مانگنی پڑی۔فلم نے ریکارڑ توڑ بزنس کیا۔یہ فلم 1953 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم نے فلمستان کے خزانے بھر دئے۔پردیپ کمار اس فلم سے راتوں رات اسٹار بن گیا۔

پردیپ کمار فلمستان کے لئے پارس ثابت ہوا تھا۔نند لال جسونت لال جو کہ اپنے زمانے کے بہت ہی معتبر اور مانے ہوئے فلمساز تھے وہ فلم ''انارکلی'' میں اُسکا کام دیکھ کر اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے اُسے اپنی اگلی میں فلم لینے کا فیصلہ کیا۔وہ اُسے ''ناگن'' میں ایک نئے انداز میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ناگن کی کہانی سپیروں کے گرد گھومتی تھی۔زروبکتر میں ملبوس شہزادہ سلیم محلوں سے نکل کے سڑکوں پر آ گیا تھا۔اس بار اُسکے ہاتھ میں شاہی تلوار نہیں بلکہ بین تھی جسے وہ بجا رہا تھا۔اس فلم کی موسیقی کی ذمہ داری گلوکار ہیمنت کمار کو سونپی گئی تھی اور وہ اس فلم کو اپنی مدھر دھنوں سے آراستہ کرنے میں جٹا تھا۔اس فلم کو بھی بڑے پیمانے پر بنانے کا پلان تھا۔اس فلم میں پردیپ کمار کی ہیروئن وجینتی مالا تھی۔اس فلم میں چودہ گانے تھے جو کہ ایک ریکارڈ تھا۔مزے کی بات یہ تھی کہ سبھی گانے ایک سے بڑھکر ایک۔اسمیں ہیمنت کمار پردیپ کمار کی آواز بنا تھا جب کہ لتا منگیشکر نے وجینتی مالا کے لئے پلے بیک دیا تھا۔اس فلم کی موسیقی ایسے سر چڑھ کے بولی کہ فلم نے بزنس کے سارے ریکارڑ توڑ دئے اور نند لال جسونت لال کے گھر میں ہن برسنے لگا۔یہ فلم 1954 میں ریلیز ہوئی۔

ان دو فلموں کی کامیابی نے اُسے فلمسازوں کی پہلی پسند بنا دیا۔اُسنے پچاس کی دہائی میں دس فلمیں سائن کیں۔فلمی دنیا کی چوٹی کی اداکاراؤں کو پردیپ کمار کے ساتھ کاسٹ کیا گیا۔پچاس کی دہائی میں اُسکی دس فلمیں ریلیز ہوئیں جو کہ ایک ریکارڈ تھا۔یہ فلمیں تھیں نمی کے ساتھ ''جے شری'' نرگس کے ساتھ ''عدالت'' نوتن کے ساتھ ''ہیر'' اور مینا کماری کے ساتھ ''بندھن''۔اُسنے وی شانتا رام اور راجکپور کے ساتھ بھی کام کیا۔فلمیں تھیں ''صبح کا تارا'' اور ''جاگتے رہو''۔یہ فلمیں 1956 میں ریلیز ہوئیں۔ان سبھی فلموں کو وہ کامیابی نہیں ملی جو انارکلی اور ناگن کو ملی تھیں۔

سہراب مودی کی فلم ''راج ہٹ واحد فلم تھی جس نے اُسکی مقبولیت کا بھرم بنا کے رکھا۔ایک تو اسمیں مدھو بالا کی سحر آگیں اداکاری تھی۔ساتھ میں شنکر جے کشن کی دلفریب موسیقی تھی جس نے فلم بینوں پر جادو کر دیا۔یہ فلم 1956 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کی کامیابی سے حوصلہ پا کر پردیپ کمار نے مدھو بالا کے ساتھ ایک کامیاب جوڑی بنانے کی کوشش میں پانچ فلمیں سائن کیں۔یہ فلمیں تھیں۔''یہودی کی لڑکی''''گیٹ وے آف انڈیا''''پولیس''''محلوں کے خواب'' اور ''پاسپورٹ''۔شومئی قسمت ان میں سے ایک بھی فلم نہ چلی اور پردیپ کمار کا خواب پارہ پارہ ہو گیا۔اسی طرح وجینتی مالا کے ساتھ اُسکی فلم ''ایک جھلک''''ناگن'' کے مقابلے میں ایک فیصد بھی نہ چلی۔پردیپ کمار کا وجود ہچکولے کھانے لگا۔شروعاتی دور میں جس بے پایاں کامیابی سے وہ ہمکنار ہوا تھا، کامیابی کی دیوی اب اُس سے دور دور بھاگنے لگی تھی۔وہ اپنے کیریئر کے بارے میں کافی فکرمند تھا تبھی رامانند ساگر اُسکے لئے ایک سوغات لے کے آیا۔وہ فلم ''گھونگٹ'' بنا رہا تھا جسمیں اُسنے بینا رائے کو بھی سائن کیا گیا۔فلم ''انارکلی'' میں اُسکی جوڑی بینا رائے کے ساتھ سب سے زیادہ کامیاب رہی تھی۔شاید یہی میزان لگا کے رامانند ساگر نے بینا رائے کو کاسٹ کیا تھا حالانکہ وہ اس کے مدمقابل نہیں تھی۔اُسکی ہیروئن آشا پاریکھ تھی جب کہ بینا رائے اسمیں بھارت بھوشن کی ہیروئن بنی تھی۔یہ فلم جمنی مدراس کے بینر تلے بن رہی تھی۔رامانند کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔فلم بیحد کامیاب رہی۔

''گھونگھٹ'' نے اُسکی ڈولتی نیا کو کسی حد تک سہارا دیا۔یہ فلم 1960 میں ریلیز ہوئی۔اس کے فوراً بعد اُسکی ایک اور کامیاب فلم ریلیز ہوئی جسکا نام ''سنجوگ'' تھا۔اسمیں اُسکی ساتھی کلاکار انیتا گوہا تھی۔اس فلم کے فلمساز مزاحیہ اداکار اوم پرکاش تھا۔یہ فلم بھی ٹھیک ٹھاک رہی۔یہ فلم 1961 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُسکی اور دو فلمیں بھی ریلیز ہوئیں جن کا نام ''پاسپورٹ'' اور ''بٹوارہ'' تھا۔پھر اُسکے بعد آئی فلم ''پاسپورٹ''۔یہ فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔پردیپ کمار کے ستارے ایکبار پھر گردش میں آ گئے تھے۔تبھی راجشری پکچرس اُسکے لئے خوشی کی نوید لے کے آ گئے۔اُنہوں نے اُسے اپنی فلم ''آرتی'' کے لئے معاہدہ بند کیا۔راجشری نے فلمی دنیا میں اپنی خاصی ساکھ بنالی تھی۔اس فلم میں اُسکے ساتھ اشوک کمار اور مینا کماری تھی۔اس فلم کے ہدایت کار بڑے ہی باصلاحیت بنگالی ہدایت کار فنی مجمدار تھے۔اس فلم کو روشن نے موسیقی سے سنوارا تھا جب کہ گیت کار مجروح سلطان پوری تھے۔اس فلم نے باکس آفس پر دھوم مچا دی۔اُس زمانے میں اس فلم نے پچھتر لاکھ کا بزنس کیا جو کہ آج کے حساب سے 48 کروڑ روپے ہیں۔اس فلم کے لئے مینا کماری کو بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڑ ملا۔ساتھ میں منفی رول کرنے والی ششی کلا کو بھی فلم فیئر اعزاز سے نوازا گیا۔مینا کماری دوسری ہیروئن تھی جس کے ساتھ پردیپ کمار کی بیشتر فلمیں کامیاب رہی تھیں۔وہ مینا کو بحیثیت اداکارہ بیحد پسند کرتا تھا۔اُسنے مینا کماری کے ساتھ سات فلموں میں کام کیا۔جیسے ''عدل جہانگیر''''بندھن''''چتر لیکھا''''بہو بیگم''''بھیگی رات''''آرتی'' اور ''نور جہاں''۔کمال امروہی نہیں چاہتا تھا کہ مینا کماری پردیپ کمار کے ساتھ کام کرے۔یہ بات پردیپ کمار نے اپنے ایک

انٹرویو کے دوراں کہی تھی۔اسی طرح اُسنے مالاسنہا کے ساتھ آٹھ فلموں میں کام کیا۔یہ فلمیں تھیں ''نیاز مانہ''''ہملیٹ''''بادشاہ''''ڈیٹکٹو''''فیشن''''ایک شعلہ''''دنیا نہ مانے''اور''مٹی میں سونا''۔ان فلموں میں کوئی بھی فلم کامیابی کی اُس معراج تک نہ پہنچ سکی جس طرح ''انارکلی''اور''ناگن''پہنچ چکی تھی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم''راکھی''ریلیز ہوئی۔بھائی بہن کے رشتے پر مبنی یہ فلم بیحد جذباتی تھی۔اسمیں پردیپ کمار کی ہیروئن وحیدہ رحمان تھی جب کہ وحیدہ کے بڑے بھائی کے رول میں دادامنی اشوک کمار جلوہ گر تھا۔یہ فلم بھی خاصی کامیاب رہی۔یہ دونوں فلمیں 1962 میں ریلیز ہوئیں۔اشوک اور وحیدہ رحمان کے ساتھ اُسنے ایک اور فلم کی جس کا نام''میری صورت تیری آنکھیں''تھا۔

اسکے فوراً بعد اُسے ایک اور بڑی تاریخی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کا نام''تاج محل''تھا۔اس فلم کا فلمساز اے کے نڈیاڈوالا تھا اور ہدایت کار ایم صادق تھا جو اس طرح کی فلمیں بنانے میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔اس میں اُسے ایک بار پھر بینا رائے کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا کہ بینا رائے ہی اُسکے لئے سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔فلم کو بڑے پیمانے پر فلمایا گیا۔اسکا سنگیت روشن نے اپنی مدھر دھنوں سے سنوارا۔گانے ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے۔''پاؤں چھو لینے دو۔اور جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا،سر چڑھ کے بولنے لگے تھے۔یہ فلم 1963 میں ریلیز ہوئی۔

کیدار شرما نے اُسے فلم''چترلیکھا''میں کلیدی رول کے لئے سائن کیا۔یہ فلم بہت بڑے پیمانے پر بنائی جارہی تھی۔یہ گپتا دور کی ایک تاریخی فلم تھی جسمیں پردیپ کمار راجکمار سمٹا بھیج گپتا کا کردار ادا کررہا تھا۔اس فلم کے لئے عالیشان سیٹ بنائے گئے۔اس فلم کے گانے ساحر کے قلم کی اُپج تھے۔اسمیں اُسے اشوک کمار کا ساتھ بھی ملا تھا۔وہ بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کررہا تھا۔فلم 1964 میں ریلیز ہوئی۔فلم باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔اسکے بعد آئی فلم ''بھیگی رات''جسمیں اُسکے ساتھی کلاکار اشوک کمار اور مینا کماری تھے۔یہ فلم بھی کوئی کارنامہ نہ کرسکی۔اسکے بعد آئی''بہو بیگم''اور''نور جہاں''جن کے ہدایت کار ایم صادق تھے۔ساتھی کلاکاروں میں اشوک کمار اور مینا کماری اہم کرداروں میں جلوہ گر تھے۔دونوں فلمیں باکس آفس پر ڈھیر ہوگئیں۔یہ دونوں فلمیں پردیپ کمار کے لئے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئیں۔

نئی ہیروئنوں کی جو کھیپ میدان میں آگئی تھی جیسے سائرہ بانو، سادھنا، یا شرمیلا ٹیگوران میں کسی ایک کے ساتھ پردیپ کمار نے ایک بھی فلم نہ کی تھی۔چار سال تک وہ گھر میں بیٹھا کسی پرڈیوسر کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔یہاں وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔فلمی دنیا کا یہ اصول رہا ہے کہ یہاں چڑھتے سورج کی سبھی پوجا کرتے ہیں،ڈوبتے سورج کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے۔نیا ہیرو راجیش کھنہ فلمی اُفق پر ایسا چھا گیا تھا کہ اُسکی چمک سے باقی سارے ستارے ماند پڑ گئے تھے۔پردیپ کمار کا ستارہ تو پہلے سے ٹمٹمارہا تھا۔اس نئی چکاچوندھ میں وہ کہیں گم ہوگیا۔جن لوگوں کو اُسنے کروڑوں روپے کما کے دئے تھے وہ بھی اُسے بھول گئے۔بھارت بھوشن کی طرح وہ بھی فلمی دنیا کی بے مروتی کا شکار ہوگیا۔

ایک دن اُسکی نراشا میں اجے بسواس اُسکے لئے آشا کی نوید لے کر آیا۔وہ فلم''سمبندھ''بنا رہا تھا۔اُسنے پردیپ کمار کو اس فلم میں ایک اہم کردار کے لئے سائن کیا۔یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اجے بسواس اُسکا داماد تھا۔اُسکی شادی اُسکی تیسری بیٹی بینا سے ہوئی تھی جو خود ایک ایکٹرس تھی۔فلم 1969 میں ریلیز ہوئی یہ فلم کامیاب بھی رہی۔اس سے پہلے کہ وہ اس فلم کی کامیابی کا جشن منا پاتا،اجے بسواس نے اُسے بڑی گہری چوٹ پہنچائی۔وہ اُسکی بیٹی سے الگ ہوا تھا۔اُسنے بینا کو طلاق دی تھی۔

پردیپ کمار کا ایک بھرا پرا خاندان ہے۔اُسکے ناتے پوتے سب فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔اُسکا چھوٹا بھائی کالید اس ایک فلمساز ہے۔اُسنے اپنے بیٹے سندیپ کمار اور اداکار دیپ کھوسلہ کے ساتھ مل کر اپنی کمپنی کھولی جس کے تحت اُنہوں نے فلم''پروین بابی''بنائی جس کا ہدایتکار پردیپ کمار کا بھتیجا سندیپ کمار تھا۔پردیپ کمار نے بھی دیپ کھوسلہ کے ساتھ مل کر ایک فلم کمپنی کھولی جس کا نام ''دیپ اور پردیپ پروڈکشن''رکھا گیا۔اُنہوں نے اس بینر کے تلے کئی فلمیں بنائیں جن میں زیادہ تر دیپ کھوسلہ ہی کلیدی کردار میں نظر آتا تھا۔فلمی دنیا میں یہ خبریں گشت کررہی تھیں کہ دیپ کھوسلہ پردیپ کمار کی وجہ سے کنگال ہوگیا کیونکہ وہ اُسکا پیسہ اپنے اوپر خرچ کرتا ہے۔پردیپ کمار کو بار بار یہ صفائی دینی پڑتی تھی کہ یہ اُسکی خون پسینے کی کمائی ہے جسے دیپ کھوسلہ اُڑا رہا ہے۔بقول پردیپ کمار اُسے دیپ کھوسلہ کی فلم''بٹوارہ''میں مفت میں ہی کام نہیں کرنا پڑا بلکہ اُسے جیب سے بیس ہزار دینے پڑے۔دیپ کھوسلہ کنگال ہو کے مرگیا اور الزام پردیپ کمار پر لگا۔پردیپ کمار کا کہنا تھا کہ دیپ کھوسلہ سے شراکت کرنے سے پہلے اُسکے خیر خواہوں نے اُسے متنبہ کیا تھا کہ وہ دیپ کھوسلہ کے چکر میں نہ آئے۔اُسنے دوستوں کی بات نہیں سنی اور اُسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔پردیپ کمار کا وقت اتنا برا چل رہا تھا کہ اُسنے 1977 میں ایک فلم شروع کی جس کا نام''کل کی بات''رکھا گیا۔اس فلم کے لئے ہیروئن کے رول کے لئے ساریکا کو سائن کیا گیا جب کہ ہیرو کے رول کے لئے سچن زیر تجویز تھا۔سچن سے پردیپ کمار نے بات کی اور اُسے اس فلم میں کام کرنے کے لئے کہا۔سچن نے اس فلم میں کام کرنے سے انکار کردیا۔اُسکے انکار نے پردیپ کمار کا دل توڑ دیا اور اُسنے اس فلم کو بند کردیا۔

پردیپ کمار ایک نستعلیق انسان تھا۔اس طرح کے دو اداکار تھے۔ پردیپ کمار اور بھارت بھوشن جو ساری زندگی شریف النفس رہے۔ان کا نہ کوئی معاشقہ عام ہوا نہ ہی کسی ہیروئن کے ساتھ اُن کا عشق چلا۔اُنہوں نے سادگی سے شادیاں کیں اور اپنے گھر بسائے۔دونوں کے آخری ایام برے گزرے۔ بھارت بھوشن تو کسم پرسی کے عالم میں رہا جب کہ پردیپ کمار کو اس چکاچوندی دنیا کو خیرباد کہہ کے اپنے آبائی وطن لوٹنا پڑا۔

باقی صفحہ ۱۲۳ پر ملاحظہ کیجیے

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

پیارے بھیّا گل وگلزار جیو، سدا سکھی رہو۔

بے حد انتظار کے بعد ''چہارسو'' نظر نواز ہوا۔ حسبِ معمول اپنی گوناگوں خصوصیات کے ساتھ۔ اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز اس ناچیز کے نام ہے۔ سچ جانیے میں نے خود کو کبھی اس قابل نہیں جانا تھا کہ مجھے قرطاسِ اعزاز سے سرفراز کیا جائے۔ اسی لیے آپ کے بار بار اصرار پر میں منع کرتی رہی ہوں لیکن اب چہارسو میں جمع ہو کر کچھ کام سامنے آیا ہے تو خود مجھے حیرت ہوئی۔

''کہ میں بھی کچھ کر گزری ہوں؟'' یہ کریڈیٹ آپ کو جاتا ہے۔ آپ نے وہ کام کر دکھایا جو میں شاید کبھی کسی کو کرنے نہ دیتی۔ اور کسی کو ضرورت بھی کب محسوس نہ ہوئی۔ میں تو آدھی صدی سے افسانہ لکھتی چلی آ رہی ہوں۔ آپ نے مجھے میری پہچان کرادی۔ ''چہارسو'' ملنے سے پہلے شبہ طراز نے موبائل پر ''چہارسو'' کی زیارت کرائی تو میرا مارے خوشی کے مرزا غالبؔ کے شعر کے مطابق کچھ ایسا حال ہوا:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اس رات گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہ سب رخصت ہوئے تو اپنے پلنگ پر بیٹھ کے موبائل کھولا اور رات گئے تک پڑھتی رہی۔ لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دُور پائی۔ رات کروٹیں بدلتے گزری صبح کو دو نفل شکرانے کے اللہ کے حضور پیش کیے کہ اس باری تعالیٰ نے مجھے عزت بخشی۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے شکریہ کے چار لفظ ناکافی لگتے ہیں۔ آپ کا ذہن اور ہاتھ کیسے کیسے کارہائے نمایاں ادا کر رہے ہیں۔ ہر ماہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ادب کے ہیرے موتی قارئین کو پیش کرتے ہیں۔ پچھلے تیس سالوں سے آپ یہ کام انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔ بے اختیار جی چاہا کہ ان عظیم ہاتھوں کا بوسہ لوں۔ دعائیں تو ہر لمحہ آپ کے لیے ہیں۔ مسلسل ایک اعلیٰ درجے کا شمارہ قارئین کو پیش کرتے ہیں اور قرطاسِ اعزاز کی حامل شخصیات کو خوشیاں بانٹ رہے ہیں اور نہ صلے کی تمنا نہ کوئی مالی فائدہ۔

سچی بات یہ ہے کہ اپنا شمارہ دیکھ کر اتنی مسرت ہوئی کہ خود پر پی ایچ ڈی ہونے کی خبر سن کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے میرے لاشعور میں یہ خواہش چھپی بیٹھی ہو! خیر بھیا۔۔۔ رسمی سہی آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اب بات ''چہارسو'' کے مندرجات پر ہو جائے۔ افسانے سبھی بہت اچھے اور معیاری ہیں۔ مجھے خاص طور پر ملکیت سنگھ مچھانا کا ''پاکستانی''، بلراج بخشی کا ''سقوط''، انل ٹھکر کا ''جنٹل مین ڈرنکس''، فیروز عالم صاحب کا ''گھروندے انا کے'' اور گلزار جاوید کا ''بشرطِ استواری'' پسند آئے۔ انل ٹھکر اور فیروز عالم ویسے بھی میرے پسندیدہ قلمکار ہیں۔ ''افق سے اُترا چاند'' میں رینو بہل نے جناب مہندر پرتاپ چاند سے تفصیلی تعارف بہت اچھے انداز سے کرایا ہے۔ رینو بہل آپ کا شکریہ۔ مضامین بھی سب بھلے اور معلوماتی ہیں جن سے جانکار کو روشنی ملتی ہے۔ ڈاکٹر سائرہ بتول کو پہلی بار پڑھا۔ انہوں نے تلفظ کی گلکاری خوب دکھائی ہے۔ اور ہاں دیپک کنول صاحب سے کہیے بھئی پلیز آپ ''ایک صدی کا قصہ'' بند نہ کیجیے۔ اگر دو چار لوگ بور ہوتے ہیں تو ہونے دیجیے۔ بہت سے لوگ پسند بھی تو کرتے ہیں نا۔ میرے جیسے بہت سے قاری اپنی ماضی میں کھو کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ثریا کے بارے میں پڑھ کر بہت مزا آیا تھا۔ ان کے ماموں اور نانی صاحبہ سے میرے ذاتی مراسم رہے ہیں۔ ثریا نے خط لکھ کر مجھے بمبئی کی دعوت دی تھی اور اپنی کارڈ سائز کی تصویر دستخط کر کے بھیجی تھی جو آج بھی میرے البم میں موجود ہے۔ اور گلزار میاں یاد آیا ''قرطاسِ اعزاز'' میں درج شعر نے بہت لطف دیا۔ شعر میرے حسبِ حال ہے:

جب وہ بچھڑا تھا رات باقی تھی
کٹ گئی عمر رات باقی ہے

عذرا اصغر (کراچی)

جناب گلزار جاوید صاحب، سلام نیاز۔

آپ نے چہارسو میں محترمہ ذکیہ مشہدی کے مکتوب زیرِ نظر کو جگہ دی ہے۔ اس مکتوب میں موصوفہ نے جناب شموئل احمد صاحب سے شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک فاش غلطی کا اعتراف کیا اور یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ ''بہرحال کہیں کچھ کنفیوژن ہوا ہے۔''

میرے افسانے ''زر یاب'' کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے ذکیہ مشہدی صاحبہ اس نوع کی فاش غلطی کی مرتکب ہوئی ہیں اور کنفیوژن کی بھی البتہ اس کا اعتراف کرنے میں ہچکچا رہی ہیں۔

''میں محترمہ شہناز عابدی کے کچھ اور افسانے پڑھنے کی خواہشمند ہوں۔ نشاندہی کریں تو ممنون ہوں گی۔'' سو بھئی آپ محترم نشاندہی فرمائیں۔ مجھے حکم دیتیں تو اپنی ایک آدھ کتاب ان کو بھجوا دیتی۔ براہِ راست میں آپ کے سوال: بقول ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) ''قد آور خواتین کی موجودگی میں اپنی شناخت بنانے کے لئے آپ کو بہت محنت کرنا پڑی۔''

''کچھ تفصیل ان دنوں کی بیان کرنا پسند کریں گی۔؟'' کے جواب میں عذرا اصغر صاحبہ نے جو ارشاد فرمایا وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں خاموشی سے لکھتی رہی۔ معروف پرچوں میں چھپتی رہی۔ کسی کے کندھے پر بندوق چلانے کی کوشش نہیں کی۔ ناقدین نے کبھی گھاس نہیں ڈالی۔ اہمیت ہی نہیں دی۔ چنانچہ میری پہچان بہت دیر سے بنی لیکن میں مطمئن ہوں اور اپنے قارئین کی شکر گزار ہوں۔''

عذرا اصغر صاحبہ کا لکھا ہوا آج کے ہر اس لکھاری پر لاگو ہوتا ہے جو کسی 'نیٹ ورک' سے نہ جڑا ہو۔۔۔زیرِ نظر چہارسو کے افسانے سارے کے سارے حقیقت نگاری کے لائقِ تحسین نمونے ہیں، ایک آدھ کو چھوڑ کر۔

آہستہ آہستہ آپ کا اور ہمارا اپنا یہ جریدہ آج کے پاکستان اور ہندوستانی فکشن کا نمائندہ جریدہ بن چکا ہے۔ مبارک ہو کیا بتاؤں کہ میں کس قدر دکھی ہوں۔ سچ پوچھئے تو نہ پڑھا جا رہا ہے، نہ ہی لکھا جا رہا ہے۔ چہارسو کے پیار میں بہت کچھ پڑھ لیا اور اتنا کچھ جیسے تیسے لکھ بھی لیا فریضہ سمجھ کر۔ اللہ تعالیٰ عالم انسانیت پر رحم کریں اور ''کرونا وائرس'' کی وبا کے خاتمے کے احکام جاری فرمائیں۔ آمین۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

پیارے بھائی گلزار جاوید، ہمیشہ خوش رہو

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام محترمہ عذرا اصغر ملا۔ میں عذرا اصغر صاحبہ سے انکی تحاریر و تخلیقات کی وساطت سے گذشتہ پندرہ سال سے واقف ہوں جب وہ لاہور کے جریدے ''تخلیق'' میں نہ صرف تواتر سے لکھتی تھیں بلکہ اس کے حلقہ ادارت میں بھی شامل تھیں۔ پھر یہ میری عین خوش قسمتی تھی کہ مجھے ان سے بالمشافہ ملنے کا اتفاق ہوا جب وہ کراچی میں مقیم تھیں، ایک شام میں میں ان سے ملنے انکے در دولت پر گیا۔ اس کے بعد آپ کے تیسرے صاحب زادے کی شادی پر راولپنڈی میں ان سے ملاقات رہی اور پھر انہوں نے کراچی میں ایک مختصر ادبی تقریب میں مدعو کیا جہاں انہوں نے کمال محبت اور عزت سے مجھے محمود شام، غالب عرفان اور اسد محمد خان سے متعارف کروایا جسکا میں آج تک شکر گذار ہوں۔ عذرا صاحبہ نہ صرف ایک نہایت حسین خاتون ہیں بلکہ ایک نہایت خوبصورت انسان ہیں۔ ان میں گذرے وقتوں کی تہذیب، انداز گفتگو، نشت و برخواست اور چھوٹوں کے دل جیتنے کے اوصاف موجود ہیں جو اب کم کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ میری ان سے ذاتی واقفیت کے باوجود آپ نے جو انکے بارے میں مواد جمع کر دیا ہے اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اردو ادب میں اتنا بلند مقام رکھتی ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنف، کئی رسائل کے ادارتی حلقے میں شامل، خوچندر سالوں کی بانی، کالم نگار، ریڈیو و ٹیلی وژن کی فنکار اور کئی انعام یافتہ، میری اس کم علمی کا آپ نے خوب ازالہ کیا ہے۔ میں آپکی اس کاوش کو سلام کرتا ہوں کہ جب آپ کسی کا قرطاس اعزاز نکالتے ہیں تو اسکے ساتھ کمال کا انصاف کرتے ہیں (جسکی مثال میں خود ہو) میں عذرا اصغر صاحبہ کے فن پر کیا لکھوں جب انکے متعلق الطاف فاطمہ، انور سدید، میرزا ادیب، مشکور حسین یاد، رشید امجد اور اے بی اشرف جیسے اردو ادب کے دمکتے ستاروں نے اپنی رائے دی ہو۔ میں نے یہ تمام مضامین پڑھے۔ اسنے میرے دل پر بڑا اثر کیا اس کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک کسک پیدا ہوئی کہ کاش ان میں سے، یا ان جیسے کسی ایک فنکار نے میرے بارے میں کچھ لکھا ہوتا، یہ بھی اسی لئے لکھا جا رہا ہے کہ مجھے اپنی جگہ معلوم ہو جائے کہ میں تو ایک ٹمٹماتا دیا ہوں مگر اس کے باوجود عذرا اصغر صاحبہ نے میری ہر تحریر کو سراہا ہے میری سرگذشت سے لیکر ابھی شائع ہونے والی کتاب ''زندگی نایاب ہے'' پر بھی انہوں نے الحمرا میں مضمون لکھا ہے۔ آپ چہارسو کے ذریعے ان تک میرا اسلام و شکریہ پہنچا دیں۔

اس سے پہلے کہ میں باقی مشمولات میں پر تبصرہ کروں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یوں تو چہارسو کا ہر نمبر لاجواب ہوتا ہے مگر یہ نمبر بہت ہی دل کھینچنے والا تھا۔ میں نے کئی تخلیقات صرف یہ سوچ کر شروع کیں کہ ایک آدھ پیراگراف پڑھ کر باقی پھر پڑھونگا مگر ہر ایک نے ایسی گرفت میں لیا کہ ختم کر کے ہی دم لیا۔ سب سے پہلے انل ٹھکر صاحب کا افسانہ پر چند الفاظ۔ نفسیاتی الجھن پر مبنی یہ کہانی بہت ہی خوب لکھی گئی ہے اور ٹھکر صاحب نے اسکی بنت بہت اچھی کی ہے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی جسمانی بیماری کی غیر موجودگی میں یہ مسئلہ جوانی میں بہت حد تک نفسیاتی ہی ہوتا ہے اور بہت سے ازدواجی مسئلوں کا سبب بن جاتا ہے۔ میں نے کچھ ماہ پہلے ''کائینات میں جنس کا کردار'' پر ایک علمی مضمون لکھا ہے۔

مجھے ملکیت سنگھ کا افسانہ ''پاکستانی'' جو بڑی حد تک رپورتاژ تھا بہت ہی پسند آیا۔ انکی تحریر میں شہد کی مٹھاس تھی۔ دراصل انسانوں کے درمیان نہ مٹنے والا جذبہ محبت کرنے اور محبت کئے جانے کا ہے۔ یہاں مجھے یہ لکھنے دیجئے کہ دونوں ملکوں کے میڈیا کے زہریلے برتاؤ کے باوجود ایسے ہی تجربات بہت لوگوں کو ہوئے بھارتی صحافی خشونت سنگھ، گلزر اور مہندر پرتاب جب اپنی جنم بھومی دیکھنے گئے تو لوگوں نے راستوں میں آنکھیں بچھا دیں۔ اسی طرح بشریٰ رحمٰن دہلی گئیں تو انکو بھی دلی کے بازار میں دکانداروں نے آنکھوں پر بٹھایا۔

آپکا افسانہ بشرط ستواری حسب دستور ایک کاٹ دار تحریر تھی۔ آپ نے ہمارے جھوٹے معاشرے کی تصویر کشی خوب کی۔ اعزازی تقریب کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ تقریب کے مہمان خصوصی جیسی شخصیات اب ہمارے معاشرے میں پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں۔۔مگر ایسے بھی ہیں جو اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے ہیں چاہے ان کی وجہ سے دنیا کی آسائشوں سے محروم رہیں۔ اس میں میرے سگے بھائی سلطان عالم بھی شامل تھے۔ افسانے کا آخیر نہ صرف چونکا دینے والا ہے بلکہ ہر سوچنے والے کے لئے ایک لمحہ فکریہ چھوڑ جاتا ہے۔

اس دفعہ معمول سے کہیں زیادہ نثر و نظم میں نئے نام نظر آئے اور پاکستان سے باہر بھی لکھنے والے کئی نام نظر آئے۔ مجھے چہارسو کی یہ پالیسی بہت پسند ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ میں ''گرین کارڈ'' پڑھنا چاہتا تھا مگر رات ہو گئی تھی کل پڑھونگا کیونکہ میں خود امریکا میں پچاس سال سے ہوں اور یہ افسانہ میرے مانوس ماحول میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے مجھے اسے پڑھنے کی آرزو ہے۔

آخیر میں شاعری کے سیکشن میں، نوید سروش، غالب عرفان، شگفتہ

نازلی، ڈاکٹر ریاض، بڑے بھائی سمان یوگندر بہل، آصف ثاقب، اور نسیم سحر قابل ذکر ہیں۔ مہندر پرتاب پر رینو بہل کا مضمون نہایت خاصے کی چیز ہے۔ اس شمارے میں شہلہ نقوی کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی ۱۹۸۷ میں ہم دونوں امریکا سے واپس آ کر کراچی کے آغا خان ہسپتال میں تعینات تھے تو کچھ یاد اللہ ہوگئی تھی۔ خط کی طوالت کی معذرت مگر چہارسو میرا اپنا جریدہ ہے۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' شمارہ مارچ اپریل ۲۰۲۰ء محترمہ عذرا اصغر سے منسوب ہے جو سات افسانوی مجموعوں اور دو ناول کی مصنفہ ہونے کے علاوہ ملک کے بہت سے اخبارات میں کالم نگاری بھی کرتی رہی ہیں۔ ان کے افسانوں میں شائستگی اور مشرقی حسن وحیا کا عنصر نمایاں ہے جبکہ وہ جنسی جرائم اور دہشت گردی پر مشتمل کہانیاں تخلیق کرنے سے دور رہی ہیں۔ وہ اچھوتے اور دلچسپ انداز میں افسانے تحریر کرتی ہیں جن کی نمایاں خصوصیت ان کے گہرے مشاہدات کے اظہار میں ان کا مہذب انداز بیان ہے۔ ''اردو ادب کا بازیگر'' کے عنوان سے صوفی منش ادیب مرحوم ممتاز مفتی کے بارے میں ان کا خاکہ بہت زبردست ہے۔ شمارہ میں اچھے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

انل ٹھکّر کا افسانہ ''جنٹل مین ڈرنکس'' عورت کے بے جا شک اور ایک بے محصور مرد کے انجانے خوف کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کی دلچسپ کہانی ہے۔ یہ تحریر انل ٹھکّر کے اپنے ہاتھوں سے چہارسو کو بھیجی گئی شاید آخری تحریر ہے اور نہایت دکھ سے لکھ رہا ہوں کہ وہ ۴۔اپریل ۲۰۲۰ء کی دوپہر اچانک دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے ہیں اور یوں دنیائے اردو ادب کے ایک درخشندہ ستارے اور ایک پرخلوص اور تمام تعصّبات سے آزاد انسان کی دلچسپ تحریروں سے قارئین ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے مثلاً ''نادیدہ دیوار'' پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ برصغیر میں رہنے والے دیگر مذاہب کے بارے میں بھی حیرت انگیز معلومات رکھتے تھے۔ ہم ان کے خاندان کے غم میں شریک ہیں اور دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے ''گھروندے انا کے'' عنوان سے کہانی تحریر کی ہے جس پر ہمیشہ کی طرح حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ کہانی ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جس نے جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر ہمیشہ کے لیے دامن دکھوں سے بھر لیا:

جانے جھوٹی آن کی خاطر جہاں میں کس طرح
آفتیں ہر سمت کی دن رات سہہ جاتے ہیں لوگ

''بشرطِ استواری'' (گلزار جاوید) منفرد اور شستہ انداز میں لکھی ہوئی بامعنی تحریر ہے جس کا مرکزی خیال آخر میں واضح ہوتا ہے کسی بھی معاشرہ میں ہمیشہ کے لیے جبر، ناانصافی اور ناہمواری کا نظام ہمیشہ کے لیے نہیں چل سکتا۔ ہمارے ہاں دولت چند ہاتھوں میں گنتی کے لوگوں کے پاس ہے جبکہ کروڑوں عوام کو باعزت زندگی کے ساتھ دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ بمشکل نصیب ہے۔

اگر معاملات یونہی چلتے رہے اور اصلاح نہ کی گئی تو ایک وقت آئے گا جب چاروں طرف سے عوام اُٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر سبھی کو چھلنی سے گزرنا ہوگا بقول فیض احمد فیض:

''جب تاج اچھالے جائیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے''

شہناز عابدی نے ''ہم دیکھیں گے'' کے عنوان سے افسانہ تحریر کیا ہے جو ظالمانہ اور فرسودہ نظام سے بغاوت کی دلچسپ کہانی ہے۔ نہ جانے کاروکاری جیسی جاہلانہ روایات کب تک معصوم زندگیوں کا خون بہاتی رہیں گی۔ حکومت سخت قوانین بنا کر ایسے جرائم کے لیے جب تک سزائے موت کا اعلان نہیں کرتی تب تک یہ قبائلی ظالمانہ نظام یونہی چلتا رہے گا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد بہت سے خاندان اپنے وطن اور پیاروں سے جدا ہونے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ ملکیت سنگھ نے افسانہ ''پاکستانی'' میں پنجاب کی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دوری کے حوالے سے بہت دلچسپ روداد بیان کی ہے جب اُسے ایک لمبے عرصے کے بعد وطن کی خوشبو مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب کھینچ لائی جہاں اُس کا بلاتفریق ذات و مذہب انتہائی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا۔

بلراج بخشی نے ''سقوط'' میں دلچسپ فنی اصطلاحات کے ساتھ دشمن کے دو مخالف فوجی جوانوں کے درمیان ایک غیر معمولی مقابلہ کا ذکر کیا ہے جس میں اول تو دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ روک لیے تھے جو انسانی جذبہ کے محرک کا قدرتی نتیجہ تھا لیکن اس خیال سے کہ کہیں ان پر غداری کا لیبل نہ لگ جائے جلد ہی بیک وقت دونوں نے فوجی روایات کے پیشِ نظر ایک دوسرے پر فائر کھول دیا اور یوں دونوں نے اپنی اپنی جانیں قربان کر دیں جس کے بعد انہیں بعد از مرگ بہادری کے قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مہندر پرتاپ چاند پنجاب کے ہر دلعزیز ادیب اور شاعر ہیں۔ رینو بہل نے اُن کے بارے میں عمدگی سے تفصیلی مضمون شائع کیا ہے۔ اور یوں ان کی زندگی کے بارے میں قارئین کو تفصیل سے ''افق سے اترا چاند'' کے عنوان سے تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔

حسن منظر کا مضمون ''خاص ملک، خاص لوگ، خاص علاج'' کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے مثلاً بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ چین کے عظیم انقلابی رہنما کا اصلی نام ماؤزے تنگ نہیں بلکہ مؤزے زونگ تھا اس طرح سویٹ یونین USSR کا 74 سالہ نظام ختم کرنے میں روس کے صدر بورس یلسن کا کیا کردار تھا اور کیا وجہ تھی کہ امریکہ کے دورے کے دوران انہیں دل وجان سے خوش آمدید

کہا گیا اور آخری عمر میں وہ کس مرض کا شکار ہو گئے تھے۔

شاعری میں آصف ثاقب، رضیہ اسماعیل، پروین شیر، یوگیندر بہل تشنہ، غالب عرفان، ہارون الرشید، رؤف خیر، اسد عباس کا کلام خاص طور پر متاثر کن ہے۔ دلچسپ افسانوں، مضامین اور خوبصورت شاعری پر مشتمل شمارہ ترتیب دے کر قارئین کی نذر کرنے پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادر گلزار جاوید، آداب۔

محترمہ عذرا اصغر کے نام ''چہارسُو'' کا قرطاسِ اعزاز موصول ہوا۔ پڑھ کر ہمیشہ کی طرح دل خوش ہوا کہ وبا کے ان دنوں میں بھی آپ نے اپنے پڑھنے والوں کو اس بہانے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اللہ آپ کی ہمت اور حوصلے کو برقرار رکھے۔

''چہارسُو'' کے صفحات کم ہیں پھر بھی آپ جس سلیقے سے پرچے کو نکھارتے ہیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ یہ زیادتی ہوگی آپ کے ساتھ اگر میں اپنے ترجمے کی اشاعت پر آپ کا شکریہ ادا نہ کروں۔ یہاں موقع اور محل کی مناسبت سے میں ایک چھوٹی سی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں امید ہے کہ آپ کو یہ بات ناگوار نہیں لگے گی۔ وہ غلطی یہ ہے حضور والا کہ ''خوبرو ترین ڈوبنے والا دنیا کا'' کے اصل مصنف کا نام سہواً شامل اشاعت ہونے سے رہ گیا ہے۔ یہ کہانی دورِ جدید کے ایک عظیم قلمکار گیبرئیل گارسیا مارکیز کی ہے۔ اردو پڑھنے والے اب اس نام سے بخوبی واقف ہیں۔ اصل لکھنے والے کا نام رہ جانے سے کہانی کا گلیمر آدھا رہ جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ شمارے میں یہ وضاحت فرمادیں گے تو نہ صرف ریکارڈ میں یہ بات آجائے گی بلکہ مجھے بھی سکونِ قلب ہوگا کہ اعترافِ تخلیق ہوگیا ہے۔

حضور والا آپ ''چہارسُو'' میں ترجموں کو اہمیت دیتے ہیں یہ دیکھ کر بھی مجھے طمانیت ہوتی ہے کہ اس طرح آپ کے قارئین کو غیر ملکی مختصر کہانیوں/ افسانوں کے Trend کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آپ کی کوششوں میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

ظفر قریشی (نیویارک)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

مدیرہ ''تجدیدِ نو'' محترمہ عذرا اصغر کی متنوع تخلیقات اور ناقدین کی گرانقدر نگارشات نے مطالعاتی آسودگی کا وافر سامان ذہنوں کے لیے مہیا کیا ہے جو ''چہارسُو'' کی گزشتہ تابندہ روایات کی تجدید و توثیق کرتا ہے اور ادبی دنیا سے وابستہ شخصیات کو بعض صورتوں میں نہ صرف اس اعزازی پلیٹ فارم سے متعارف وشناسا کراتا ہے بلکہ اُن کی تشہیر و مقبولیت کا فریضہ بھی تخلیقی تسلسل کے لیے بطریقِ احسن انجام دیتا ہے۔۔۔ جو دریں حالات ادبی پروموشن کے لیے بہر طور مثبت اقدام تصور کیا جاتا ہے۔

اس گلوبل ولیج میں کورونا نے جس طرح تہلکہ مچا رکھا ہے اور اس مہلک و موذی وائرس نے کرّہ ارض پر بسنے والے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اس کے پیشِ نظر صرف اور صرف احتیاطی تدابیر سے ہی خدا سب کو محفوظ و مامون رکھے کہ نہ تو اینٹی بائیوٹیکس اس کے لیے موثر ہیں اور نہ ہی کوئی حتمی ویکسین ہی اب تک دریافت ہو پائی ہے اگرچہ بعض ممالک اس کی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔

درج زیریں دعا ہمیشہ ورد زباں رہے۔

خدا کو رحم آتا ہے۔ خدا کو رحم آئے گا
فقط تم حوصلہ رکھنا۔ ذرا سا فاصلہ رکھنا
جھکا کے سر کو سجدے میں۔ خدا سے رابطہ رکھنا!

''بشرطِ استواری'' آغاز سے ہی ہمیں باضابطہ تقریب کا سامع و ناظر بنا دیتی ہے جہاں مہمانِ خصوصی کے مداح و معترف ان کی جداگانہ خصوصیات الگ سی ترجیحات، غیر منقلب طرز معاشرت کے ساتھ منفرد مقام و مرتبے کا تعین کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے انداز سے موصوف کا تذکرۂ خیر کیے جاتے ہیں۔ دراصل اسے لکھاری کا وصفِ خاص ہی کہنا چاہیے کہ وہ قاری کو اپنے تخلیق کردہ ماحصل میں محصور کیے رکھے یا وہ خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگے جبکہ ہر انسان کے اندر از خود بھی ایک محتسب موجود رہتا ہے جو زمینی صداقتوں سے حقائق کی گہرائیوں میں اتر کر خود کو ایسے جانچتا، پرکھتا ہے جیسے تجزیاتی آئینے کے رُوبرو ہو جس سے کچھ بھی مخفی نہ ہو کبھی کبھی دوسروں کی آراء و قیاسات سے بہت مختلف متضاد اور نفسیاتی طور پر معلوماتی کیفیت سے دوچار کرنے کا باعث بھی بنتا ہے مگر کیا کہ وفاداری بشرطِ استواری یہی تو ہے نا!

ادارہ چہارسو نے گزشتہ وقیع و دقیع قرطاسِ اعزاز کے حوالے سے محترم سلیم شہزاد صاحب کی فنی جہتوں و تخلیقی زاویوں کو مناسب انداز سے منصۂ شہود پر لا کے اُن کی جامع پذیرائی کی اُس کے لیے تو اگر بنفسِ نفیس مدیر چہارسو کو ''براہِ راست'' تشکر کو سپردِ قلم کرتے تو لامحالہ قارئین اُن کے حسنِ اخلاق کو قدر کی نگاہ سے پڑھتے۔ باقیات و نادرات فیض احمد فیض نے بیک ٹائٹل کو فیض فہمی اور فیض شناسی سے کچھ اور معتبر و معزز بنا دیا ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

عزیزی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

کرونا وائرس کی وجہ سے جہاں سارا نظام زندگی معطل ہے وہاں ڈاک بھی نہ تو آتی ہے اور نہ جاتی ہے۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ نہ جانے کہاں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا تو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کیونکہ ان دنوں اوروں کی طرح میں بھی گھر میں بند ہوں۔ اخبارات بھی نہیں آرہے صرف کتابوں ہی کا سہارا ہے۔

عذرا اصغر سے مکالمہ تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھا۔ بعض سوالات کے

جوابات دیتے ہوئے وہ کچھ تذبذب میں مبتلا نظر آئیں۔ جدید اردو افسانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کا تحریر کردہ مضمون ''اردو ادب کا باز یگر'' جو ممتاز مفتی کے بارے میں ہے ایک الگ ہی ذائقہ رکھتا ہے۔ ممتاز مفتی بھی کیا کمال کے لکھاری تھے۔

بلراج بخشی کا ''سقوط'' ایک ایسے المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس وقت ہماری سرحدوں کے ساتھ بڑی تیزی سے آگے بڑھایا جارہا ہے اور اس کا انجام وہی ہوگا جو اس کی آخری سطور میں جھلکتا ہے۔ ملکیت سنگھ مچھانا کا ''پاکستانی'' ان کی پاکستان سے دلی محبت کا آئینہ دار ہے۔ میں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں اس مرتبہ دیپک کنول نے برصغیر کے لیے بے مثل گلوکار طلعت محمود کی یادیں تازہ کی ہیں۔ طلعت محمود غزل کی گائیکی کے بادشاہ تھے۔ ہندوستان کی فلم انڈسٹری ایک صدی سے زیادہ کا سفر طے کر چکی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ہندوستان میں بولنے والی فلموں، ریڈیو اور ادب کی ترقی پسند تحریک کا آغاز تقریباً ساتھ ساتھ ہوا۔ چالیس کے دہائی سے لے کر ساٹھ کی دہائی تک سینما کا دور ایک سنہری دور کہلایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی فلمی دنیا میں اعلیٰ پائے کے اداکار، موسیقار، گلوکار، شاعر اور ہدایتکار ایک ساتھ ایک کہکشاں کی صورت نمودار ہوئے۔ ان نابغہ روزگار شخصیات کی محنتوں کے نتیجے میں جہاں اعلیٰ پائے کی فلمیں منظر عام پر آئیں وہاں یادگار گیت اور غزلیں تخلیق کے مراحل سے گزر کر امر ہو گئیں۔ معروف ادیب اور صحافی رضا علی عابدی نے ان عظیم ہستیوں کے بارے میں اپنی مشہور کتاب ''نغمہ گر'' میں ایک مقام پر ایک نہایت خوبصورت جملہ لکھا ہے۔ ''کیسے جیالے لوگ تھے، کیسے بڑے بڑے کام کر گئے۔ یاد رہیں گے برس ہا برس۔''

طلعت محمود بھی اس سنہرے دور کا ایک لازوال کردار ہیں وہ لکھنؤ کی ثقافت اور سلیقہ مندی کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ نہایت خوش اخلاق، نہایت ملنسار اور نہایت خوش لباس تھے۔ تقسیم کے دوران ان کی والدہ محترمہ اور خاندان کے دیگر لوگ کراچی منتقل ہو گئے تھے لیکن طلعت محمود اس وقت شہرت کے جس مقام پر تھے شاید وہاں سے ان کے لیے ہجرت نقصان دہ ثابت ہوتی۔ دیپک کنول کی کتاب فلمی دنیا کے معمار اسلام آباد میں کتابوں کی ایک دکان پر دیکھی تھی۔ اب ارادہ ہے کہ اسے خرید کر آرام سے کسی وقت پڑھ لیا جائے۔ انہوں نے اپنے خط میں اس سلسلے کو اب موقوف کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے وہ یہ کام یقیناً ایک عرصے سے کر رہے ہیں شاید تھک گئے ہوں گے۔ لیکن اگر وہ اس سلسلے کو مزید جاری رکھ سکتے ہیں تو یہ ان کا احساس ہوگا۔ کیونکہ یہ ایسا موضوع ہے جس کا کوئی انت نہیں ہے۔

پچھلے ایک شمارے میں مرزا حامد بیگ نے پی ٹی وی کے ایک شاعر شاہد مسعود کی شاعری پر ایک عمدہ مضمون لکھا تھا۔ میاں چنوں کے مظہر بخاری انہیں موجودہ ٹی وی اینکر شاہد مسعود سمجھ بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے یہ مضمون بس سرسری نظروں سے دیکھا ہے چہ معنی؟

ہارون الرشید (بالاکوٹ)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' کے توسط سے ادبی کہکشاں میں چمکتے دمکتے مزید ایک ستارے کو سلیم شہزاد کے روپ میں دیکھا تو دل سے بے اختیار آپ کے لیے دعائیں نکلیں۔ مجلّے کا ہر صفحہ بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ سلیم صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان پر لکھے گئے مضامین اور ''براہِ راست'' نے ان کے اَن گنت فنی و شخصی محاسن کو اجاگر کیا۔

افسانوں کا اس مرتبہ ایک میلہ سجا پایا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کہانی۔ جو اتنے اہم نثر نگاروں کے تخلیقی کمالات کی عکاسی کر رہے ہیں۔ غزلوں اور نظموں نے بھی خوب رنگ جمایا۔ ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کے ناول ''نجات دہندہ'' پر ڈاکٹر ریاض احمد صاحب نے ایسا سیر حاصل تبصرہ تحریر کیا کہ ناول کے حصول کی تگ و دو شروع کر دی ہے۔

گزشتہ دنوں دہلی میں ہونے والے پُر تشدد واقعات کی تصاویر ٹیلی ویژن پر دیکھ کر جی بہت ملول ہوا۔ لگ بھگ پچیس افراد کو نفرتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دلی بارہا مرتبہ اُجڑی۔ آج آنکھوں سے دیکھا تو بہت دکھ ہوا۔ سوچتا ہوں وہاں کے شعراء، ادباء، نثر نگاروں، صحافیوں اور دیگر حساس طبع انسانوں پہ کیا گزری ہوگی۔ ہم پاکستانی ان کے دُکھ درد میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم وہاں محبت، امن اور آشتی کے لیے دعا گو ہیں۔ تمام اہل قلم خواتین و حضرات سے دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ اپنے اپنے قلم کو محبت، شانتی اور انسانیت کے فروغ کے واسطے استعمال کریں تا کہ نفرتوں کی بیخ کنی ہو سکے۔

نیئر اقبال علوی (لاہور)

جانِ ادارت شانِ چہارسو پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

کورونا وائرس کی گرفت نے گردوپیش میں لرزہ سا طاری کر رکھا ہے۔ توبہ استغفار کا ورد ہے۔ اللہ کی طاقت کے سامنے ہر کوئی بے بس ہے۔ امریکہ کو اپنی جوہری طاقتوں پر بڑا ناز تھا۔ اب کورونا کو بم پھینک کر نیست و نابود کیوں نہیں کرتا۔ ''چہارسو'' جب سے آیا ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ جس کی تحریروں میں مونی ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کا افسانہ (دسوں انگلیاں دسوں چراغ) میں شوق سے پڑھتا رہا ہوں۔ چہارسو نے ان کو اعزاز دے کر ہم پر احسان کیا ہے۔ ان کے رسالے تجدید نو میں مجھے عزت ملتی رہی ہے۔ ان دنوں ''تجدید نو'' چپ ہے شاید میری طرف نہیں آتا، چھپتا ہوگا۔ عذرا اصغر صاحبہ تخلیق کی ادارت بھی کرتی رہی ہیں۔ وہاں بھی میرا واسطہ پرانا ہے۔ ایک بار محترمہ نے کراچی سے میرے خط کا جواب دیا تھا۔ بہت خوشی ہوئی تھی۔

ان کے افسانوی اور ادارتی کارناموں نے ان کو فروغ دیا ہے۔ خطوط کے حصے میں احباب کی تحریری محبتیں نہایت دل خوش کن ہیں۔ خدا سلامت

رکھے بڑے جی دار لوگ ہیں۔ دیپک کنول صاحب نے اپنے خط میں مجھے مذکور کیا ہے خدا انہیں خوش رکھے۔ چہارسو میں ان کے مضامین رسالے کا مان بڑھاتے ہیں۔ یہ سلسلہ بند نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو کئی لوگ باقی ہے جن کا ذکر نہیں ہوا۔ طلعت محمود سے متعلق بہت سی باتیں اس مضمون سے سامنے آئیں۔ طلعت محمود کی آواز مجھے بہت پسند ہے۔ ان کے بہت سے گانے مجھے یاد ہیں مثلاً غمِ زندگی کا یارب نہ ملا کوئی سہارا، زندگی دینے والے سن، میرا جیون ساتھی بچھڑ گیا، میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا۔۔۔ اور بہت سے۔ سی ایچ آتما پر شاید ان کا مضمون نہیں آیا۔ دیپک کنول جیسے کنول سے پری نکلتی ہے۔ وہ چراغ نکالیں آپ کا انتظار رہے گا۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

آج سب سے پہلے انل ٹھکر صاحب کی بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اُن کی اچانک وفات نے ہلا دیا۔ کوئی شخص ایسے بھی کبھی جاتا ہے۔ چلتے پھرتے کام کرتے باتیں کرتے اچانک خاموش ہو جائے اور تین گھنٹوں میں اس کا وجود بھی خاک میں مل جائے۔ دل کو یقین نہیں ہوتا مگر حقیقت یہ ہی ہے جسے ہمیں قبول کرنا پڑے گا۔ پہلے وکرم صاحب اور اب ٹھکر صاحب۔ چہارسو پریوار کے دو اہم ادیب کھو دیئے۔ پرماتما اُن کی آتما کو شانتی دے۔ تازہ شمارے میں اُن کا افسانہ ''جنٹل مین ڈرنکس'' شاید اُن کا آخری افسانہ ہوگا۔

عذرا اصغر صاحبہ کو اُن دنوں سے پڑھ رہی ہوں جب میں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز نے اُن کی پوری زندگی کی کتاب کے صفحات کھول کر دل خوش کر دیا۔ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کی پیدائش دہلی کی ہے۔ ممتاز مفتی صاحب پر اُن کا خاکہ دلچسپ ہے اگر وہ انٹرویو جو انہوں نے مفتی صاحب کا کیا تھا اُس کی تفصیل بھی درج کر دیتیں تو مزہ دوبالا ہو جاتا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے کھٹے میٹھے سوالوں کے جواب خوب دیے۔ جان کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ انہوں نے اپنی تعلیم کا سفر بچوں اور پوتوں تک جاری رکھا۔ باحوصلہ خاتون ہیں۔ دل میں احترام اور بڑھ گیا۔ انٹرویو میں پوری زندگی سمیٹ دینا قابلِ داد ہے۔ ''ہیڈ کوارٹر'' افسانہ اچھا لگا۔ مسافتوں کی تھکن نے تشنگی بڑھا دی کاش پورا ناول پڑھ سکتے۔

شمارے میں شامل سبھی افسانے دلچسپ ہیں۔ شہناز خانم صاحبہ نے جن روایات کا ذکر کیا ہے وہ میرے لیے نئی معلومات ہیں۔ کہانی کا اختتام بہت پسند آیا۔ فیروز عالم صاحب کا افسانہ ایک مدت بعد پڑھ کر اچھا لگا۔ اُن کے افسانے دلچسپ اور زندگی سے جڑے ہوتے ہیں۔ صادقہ صاحبہ نے نادیدہ خوف میں خوف کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ بخشی صاحب نے جنگی میدان کی ایسی منظر کشی کی ہے جیسے وہ پہلے فوج میں رہ چکے ہوں۔ اُن کا مشاہدہ زبردست ہے۔ ملکیت سنگھ جی کا افسانہ دلچسپ اور بڑا جذباتی افسانہ ہے۔ ایسے لگتا ہے جس جگہ کا وہ ذکر کر رہے ہیں اُن گلیوں میں وہ گھوم کر آئے ہیں۔ گلزار صاحب کے افسانہ کا اندازِ بیان منفرد ہے۔ کرپشن کا بیان کیسے چابکدستی سے کیا ہے۔ میٹھی چھری چلائی ہے کچھ بھی چھوڑا نہیں۔ یہ کمال کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ اشعار بڑے مناسب افسانے میں شامل کیے ہیں۔ ظفر قریشی صاحب کا ترجمہ کیا افسانہ بے حد عمدہ ہے۔ زہریلا انسان اپنے اختتام کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اب تو دل چاہتا ہے کہ ایک ہی بار سارا پڑھ لیا جائے۔

غزلوں اور نظموں کا حصہ حسبِ معمول دلچسپ ہے۔ سچ جانیے تو کئی شاعروں کو چہارسو کی ہر محفل میں اُن کا کلام پڑھ کر لگتا ہے یہ سب اپنے ہیں بے شک اُن سے کوئی ذاتی تعارف نہیں۔ شگفتہ نازلی، نوید سروش، فرح کامران، غالب عرفان اُن چند ناموں میں سے ہیں۔

تشنہ صاحب، پروین شیر، محمود شام، شگفتہ نازلی صاحبہ اور ابنِ انشاء کی نظمیں پڑھ کر مزہ آیا۔ ایک بات تو بتایئے کہ آپ فلمز کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں؟ معلوماتی بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ آپ اسی طرح محنت کرتے رہیں اور ہم سب کو ادبی تحفہ دیتے رہیں اور سب کی دعائیں بٹورتے رہیں۔

دعا کرتی ہوں کہ جس خطرناک دور سے دنیا گزر رہی ہے وہ جلد از جلد نپٹ جائے۔ کسی کا بھی جان و مال کا نقصان نہ ہو۔ سب شاداب رہیں آباد رہیں۔ رونقیں پھر سے لوٹ آئیں (آمین)۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، سلام مسنون اور رمضان مبارک۔

گذشتہ کئی ہفتوں سے دنیا بھر کے ساتھ ساتھ ارضِ وطن بھی کرونا وائرس سے بری طرح متاثر ہوئی ہے، زیادہ تر لوگ قرنطینہ یا قیدِ تنہائی میں رہنے پر مجبور ہو گئے ہیں، ایسے میں چہارسُو کا تازہ شمارہ موصول ہوا تو آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دینی پڑی۔ محترمہ عذرا اصغر کی پُر وقار تصویر والے ٹائٹل کے ساتھ یہ شمارہ بجا طور پر انہیں قرطاسِ اعزاز کا حقدار قرار دے رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی ایسی بڑی ادبی شخصیت کی طویل ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کا یہ سلسلہ بذاتِ خود ''چہارسُو'' کے لیے بھی کسی اعزاز سے کم نہیں۔ محترمہ سے ابھی فروری ۲۰۲۰ء کے وسط میں ماہنامہ ''تخلیق'' کی جانب سے ہونے والی 'آٹھویں تخلیق ایوارڈ'' کی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی، پھر 'تخلیق' ہی کے تازہ شمارے میں بھی ان کا انٹرویو شائع ہوا، اب چہارسُو میں ''براہِ راست'' کے روایتی سلسلے میں آپ کا ان سے لیا گیا انٹرویو اُن کے بارے میں مختلف پیرایے میں بہت کچھ بتا گیا ہے، اور ہمیشہ کی طرح آپ کے سوالات بھی ظاہر کرتے ہیں کہ منتخب شخصیت کے لیے سوالنامہ مرتّب کرنے سے پہلے آپ اس کے بارے میں پہلے لکھی گئی ہر تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پورے شمارے میں ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کے تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور علمی کارناموں کا احاطہ کرنے کی وجہ سے یہ

شمارہ قاری، ناقد اور محقق سب کے لیے یقیناً ایک مربوط دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے، جس کے لیے آپ تو مبارک کے مستحق ہیں ہی، مگر عذرا اصغر بھی اس کی مستحق ہیں۔

آپ کا افسانہ ''بشرطِ استواری'' بظاہر ایک سیاسی شخصیت کے اعزاز میں ہونے والی تقریب کی روداد ہے مگر اس میں ملکی حوالے سے ہماری منافقتوں اور مصلحتوں کا پردہ بڑے عمدہ انداز میں چاک کیا گیا ہے، اور اس کے آخر میں مہمانِ خصوصی (یا صاحبِ تقریب) کے دکھ بھرے الفاظ قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں اور افسانے کے عنوان کی معنویت بھی اس پر پوری طرح کھل جاتی ہے۔ چند الفاظ دہرانا یہاں ضروری سمجھتا ہوں: ''۔۔۔آئے گا، وہ وقت ضرور آئے گا۔۔۔آج نہیں تو کل۔۔۔کل نہیں تو پرسوں۔۔۔جب لوگوں کے ہاتھوں میں لوہے کی چھلنیاں ہوں گی۔۔۔جو آنکھ جھپکنے میں گدلے پانی کو شیشے کی طرح صاف شفاف کر دیں گی۔۔۔۔'' گلزار جاوید بھائی، کاش وہ وقت ہماری زندگیوں میں ہی آجائے کہ ہم بھی وہ بہار کا موسم دیکھ سکیں۔

جناب آصف ثاقب کی حمدِ باری تعالیٰ عمدہ انداز میں ذاتِ کبریائی کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے۔

''زہریلا انسان'' کی ۲۵ رویں قسط میں جناب تابش خانزادہ نے اس دلچسپ کہانی کو ایک مختلف موڑ دیا ہے جس میں مغلیہ عہد میں اقتدار کی خاطر قریبی رشتوں کو قتل کرنے یا قلعوں کے تہہ خانوں میں قید کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے یہاں بڑے تحقیقی انداز میں اس قلعہ میں پائے جانے والے ڈھانچے کو مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بھائی دارا شکوہ کا ڈھانچہ قرار دیا ہے۔ اور یوں ان کے ناول کی یہ قسط سپیروں اور سانپوں کے بارے میں ان کی حیرت انگیز معلومات کے ساتھ ساتھ اب تاریخی پہلو سے بھی زیادہ پہلودار ہو گئی ہے۔ چنانچہ جس موڑ پر یہ قسط ختم ہوئی ہے، مجھ سمیت قارئین کو اگلی قسط کا منتظر رہنا تو بنتا ہے!

دیگر افسانوں اور مضامین پر میں کچھ نہیں لکھ رہا کہ اس سے اس خط کی تکمیل میں تاخیر ہو گئی تو پھر شاملِ اشاعت ہونے سے رہ جائے گا۔ بس برادرم حمید شاہد کے بہت اہم مضمون ''تنقید کا کردار'' کی تحسین لازمی ہے کہ اس میں تنقید کے حوالے سے بہت اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ کچھ اہم باتیں رہ گئی ہیں مگر یار زندہ صحبت باقی۔ اس کرونائی موسم میں میرے یہ دعائیہ الفاظ آپ سمیت تمام قارئین کی نذر کہ اللہ سب کو سلامت رکھے اور کرونا کی وباء سے جنم لینے والی مشکل صورتِ حال سے ہمیں جلد از جلد نجات دلائے۔ مع الخیر۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو جس باقاعدگی اور جدت پسندی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے اُسے دیکھ کر حوصلہ بھی ملتا ہے اور دل سے دعائیں بھی نکلتی ہیں۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ نے ایک نہایت عالم فاضل ادیب، شاعر اور نقاد جناب سلیم شہزاد کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کر کے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اس بار رینو جی نے میری توجہ اس بات پر دلائی ہے ناول کی پچھلی قسط میں میں نے بھگوان کو جمع کے صیغے میں یعنی بھگوانوں لکھا ہے جو غلط ہے۔ خدا کی طرح بھگوان بھی ایک ہے۔ میں نے اپنے ہاں اسے درست کر دیا ہے۔ قارئین بھی اسے بھگوان پڑھیں۔

دوسری بات کہ چتا کو آگ لگانے کے لیے مٹی کا تیل استعمال نہیں ہوتا گھی یا تیل استعمال ہوتا ہے۔ میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے قارئین کے علم میں یہ باتیں لانا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی رینو جی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میری توجہ کتاب کی ان خامیوں پر دلائی۔

دیپک کنول نے اپنے خط میں قارئین کا مشورہ لیا ہے کہ آیا وہ اپنے اس سلسلے کو جاری رکھیں یا منقطع کر دیں۔ کنول جی آپ اسے اپنی سانسوں تلک جاری رکھیے۔ آپ فلمی دنیا کے ان ابواب سے ہماری دنیا کو روشن کر رہے ہیں جو آپ کے دیپک کے بنا اندھیرے میں گم ہو جائے گی۔ خدارا اس سلسلے کو جاری رکھیے۔

گلزار بھائی، آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنے دولت کدے پر میری خاطر ایک خوبصورت محفل سجا کر چہارسو کے کئی لکھاریوں سے میری ملاقات کا بہانہ بنایا۔ میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے آپ کے دولت کدے پر میری پذیرائی کی۔ اور تمام قارئین کا شکریہ کہ وہ ابھی تک میرا ناول دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔ فیصل آباد گیا تو وہاں دیگر احباب کے علاوہ عزیزہ طیبہ خان نے بھی ملاقات کا شرف بخشا۔ پاکستان سے واپسی پر آپ سب کی محبت بھری یادیں لایا ہوں جن کے سہارے چند برس اور گزر جائیں گے۔

تابش خانزادہ (نیویارک)

گلزار جاوید انکل، آداب۔

'چہارسو' میں اکثر سیفی لائبریری میں پڑھتی رہتی ہوں۔ ویسے تو میرے پاس ۳۰ سے زیادہ رسالے آتے ہیں جن میں اردو دنیا، بچوں کی دنیا، بیباک، انشاء، آجکل وغیرہ شامل ہیں، لیکن پاکستان سے شائع ہونے والے رسالے لائبریری میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں جن میں تخلیق، روشنائی اور چہارسو بھی شامل ہیں۔ 'چہارسو' کے کئی دستاویزی نمبر شائع ہو چکے ہیں جن میں 'مجتبیٰ حسین نمبر' 'مشرف عالم ذوقی نمبر' 'نند کشور وکرم نمبر' وغیرہ شامل ہیں۔ 'چہارسو' کا ایک پرانا شمارہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ 'چہارسو' ایک معیاری پرچہ ہے جس میں ایک بہترین Selection کے ساتھ ساتھ منفرد انداز کے مضامین، افسانے، نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ یہ رسالہ بڑی ہی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ گلزار جاوید صاحب کی کہانیاں اکثر میں 'انتساب' میں پڑھتی رہی ہوں

، چونکہ انتساب کی کمپوزنگ بھی میں ہی کرتی ہوں اور بھی کئی رسالے جیسے آجکل وغیرہ میں آپ کے افسانے پڑھے ہیں ۔ اس شمارے میں بھی آپ کا افسانہ 'کانچ کا چھنا کا' پڑھا جس میں 'ڈیش' نام کے کردار سے ہی کہانی میں نیا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ 'چہارسُو' میں سب سے اہم کالم 'براہِ راست' اس رسالے کی جان ہوتا ہے ۔ اگر میں رسالے کی دیگر تخلیقات نہیں بھی پڑھتی تو یہ کالم ضرور پڑھتی ہوں ۔ اس شمارے میں سب سے زیادہ پسند مجھے دیپک کنول کا مضمون 'ایک صدی کا قصہ' آیا جس میں گیتا بالی کی آپ بیتی بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کی گئی ہے اور ہرکیرتن کور سے گیتا بالی بننے تک کا قصہ لکھا ہے۔ دیپک کنول جو کہ دلیپ کمار کے کافی قریب رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی فلمی معلومات بھی ادبی معلومات سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے 'سنتا کی گوری' جیسا افسانہ تحریر کر کے ایک Record قائم کر دیا ہے۔

ہرکیرتن کور کے والد جو اپنی لڑکیوں کو آگے بڑھا کر کامیاب بنانا چاہتے تھے وہ بھی اس دور میں جب لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا گناہ سمجھا جاتا تھا، جی جان لگا دی لیکن ہار نہیں مانے اور تمام مخالفت سہنے کے باوجود قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ اس کے بعد وہ ممبئی رہنے لگے۔ جب میں نے آگے پڑھا تو میں حیران رہ گئی کہ ممبئی میں ہرکیرتن کور اپنے پریوار کے ساتھ ایک باتھ روم میں رہتی تھی، لیکن اس کی محنت اور اداکاری کو دیکھ کر اس نے کئی فلمیں کیں اور دھیرے دھیرے کامیابی حاصل کر کے شمی کپور سے شادی کر لی۔ گیتا بالی کا قصہ ہمیں حوصلہ دیتا ہے کہ ہمیں ہمیشہ کوشش کرتے رہنا چاہئے، چاہے ہم کامیاب ہوں یا ناکامیاب کیونکہ ہمیشہ ہم اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتے ہیں۔ Neil Gaimen کا قول ہے۔

''اگر آپ غلطیاں کر رہے ہیں اس کا مطلب آپ کچھ بڑا کر رہے ہیں''۔

افسانے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں خاص طور پر اسلم جمشید پوری کا افسانہ 'میں تمہاری کہانی نہیں لکھ سکتا' میں ایک قلمکار کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی اس کی مجبوریوں کو بھی۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے موضوع بکھرے ہوئے ہیں جن پر ہماری نظر تو پڑتی ہے، لیکن انہیں الفاظوں میں پرونا ایک مشکل کام ہوتا ہے، خاص طور پر (Sexual Harassment)، اس موضوع پر سینکڑوں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ اسی طرح ایک لڑکی اس کہانی میں قلمکار کے پاس انصاف مانگنے آتی ہے کہ اس پر کہانی لکھ کر اس کے ساتھ انصاف کر دیا جائے، لیکن آخر تک ایسا نہیں ہوتا۔ نہ جج انصاف کرتا ہے نہ ہی قلمکار۔۔۔ آخر وہ جائے کہاں؟

نگہت یاسمین کی کہانی 'سے کی کہانی' میں گھریلو مسئلہ پیش کیا ہے۔ اس کہانی میں انیسہ بیگم کا کردار سب سے خاص ہے جو اپنے بیٹے اسد کے لئے ایک غریب گھر کی لڑکی نغمانہ سے رشتہ طے کر دیتی ہیں، جبکہ اسد چاہتا تھا کہ خوب جہیز لانے والی لڑکی سے شادی ہو، لیکن انیسہ بیگم اس پر فدا ہو جاتی ہیں اور شادی طے کر دیتی ہیں۔ پہلے تو سب کچھ ٹھیک رہا، لیکن وقت کے ساتھ اس کے تیور بدل گئے اور اس نے اسد کو اس کی ماں سے دور کر دیا اور ایک دن Old age home بھیج دیا۔ اس شمارے میں Pablo Neruda کی ایک نظم بھی شامل ہے جو بہت اچھا انتخاب ہے۔ Beautiful 10 lines کے عنوان سے جو انگریزی قول کا انتخاب کیا ہے یہ کسی اور رسالے میں ابھی تک دیکھنے کو نہیں ملا، لیکن اگر ان رائٹرس کا نام بھی ساتھ میں درج کیا جاتا جن کے یہ Quotes ہیں تو اور اچھا ہوتا۔ 'چہارسُو' میں جگہ جگہ ایک مختصر سا فلر پڑھنے کو ملتا ہے جیسے 'سراپا محبت' 'چاند پر آلو' 'شعری مشین' وغیرہ یہ بھی 'چہارسُو' میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ باقی نظمیں، غزلیں، مضامین بھی خوب ہیں۔

ستوتی اگروال (سرونج)

- بقیہ -

ایک صدی کا قصہ

پردیپ کمار کی جو امیج تھی وہ اُسکے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی تھی۔ اس فلمی دنیا میں ایسے بہت سارے کلاکار اپنی امیج کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی ریٹائر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں ایک بھارت بھوشن بھی تھا جسے یا تو شاعر کے رول ملتے تھے یا گویا کے۔ اسی طرح پردیپ کمار پر شاہی چھاپ ایسی لگی تھی کہ اگر کہیں کوئی تاریخی فلم بن رہی ہے تو پردیپ کمار کا اُس میں کام کرنا طے ہوتا تھا۔ وہ اس چھاپ کو مٹا نہ سکا اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ دھیرے دھیرے فلموں سے آوٹ ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فلموں کا مزاج بھی بدل جاتا ہے۔ پرانے ہیروز کی جگہ نئے ہیروز فلمی دنیا میں وارد ہو جاتے ہیں۔ پردیپ کمار کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ تاریخی فلموں کا دور چلا گیا تھا۔ اب رومانٹک اور ایکشن فلموں کا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس نئے دور میں پردیپ کمار کے لئے کوئی جگہ تھی ہی نہیں اسلئے اُسنے وقت کے اس بدلاؤ کو بادل نخواستہ قبول کیا اور وہ معاون رول ادا کرنے لگا۔ ''سمبندھ'' ''محبوب کی مہندی'' اور ''جانور'' اور میں اُسنے کریکٹر رول کئے۔ اُسکی آخری فلم ''رضیہ سلطان'' تھی جسمیں اس فلمی شہنشاہ کو کسی شاہی کردار کو ادا کرنے کے قابل نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہ فلم 1983 میں ریلیز ہوئی۔ یہ اُسکی آخری فلم تھی۔

پردیپ کمار بمبئی چھوڑ کے چلا گیا اور اپنے آبائی وطن کلکتہ میں جا کے بس گیا۔ وہ اٹھارہ سال تک گمنامی کی زندگی گزارتا رہا۔ آخر 27 اُکتوبر 2001 کو 86 سال کی عمر میں اُسنے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنے پیچھے تین بیٹیاں رینا، مینا، بینا اور بیٹا دیبی پرساد چھوڑ کے چلا گیا۔ اُسے بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا۔ ہندی، کے علاوہ بنگالی اور انگریزی فلموں بھی میں کام کیا۔

..... سنگی کتابیں، کاغذی پیراہن .....

جن دنوں میں پہلی بار ارنسٹ ہیمنگوے کو پڑھ رہا تھا اور اس کی کتاب ''بوڑھا آدمی اور سمندر'' مجھے اس حد تک پسند آئی کہ میں اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ پھر یہ عقدہ کھلا کہ لحیم شحیم ہیمنگوے کی پہلی پسند فطرت سے عشق ہے۔ سمندر، مچھلیاں، وہیل، جنگلی جانور، بارہ سنگھا۔۔۔ یہ سب اس کے دوست ہیں۔۔۔ سمندر کی گھن گرج بھری موسیقی کا شیدائی ہے۔ کچھ تصویریں دیکھیں تو کہیں ہیمنگوے کسی سانڈ سے کشتی لڑ رہا ہے۔۔۔ تو کسی تصویر میں بارہ سنگھا کے ساتھ کھڑا ہے۔۔۔ ندی کنارے کشتی کی ایک تصویر تھی جہاں شکاری ہیمنگوے ایک چھوٹے سے بچے کی ساتھ بیٹھا ہے اور پاس میں دو بندوق پڑی ہے۔۔۔ ہیمنگوے کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ یہ تمام خوبیاں میرے پیارے دوست یونس خان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ طبیعت سے یونس بھی شکاری ہیں، ہوا میں اڑتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں، غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں اور ایڈونچر کے شوقین ہیں۔۔۔ یونس کے مضامین کا لطف لینا ہو یا ترجمہ پڑھنا ہو، ان کی شخصیت کے اس طلسم سے ہو کر گزرنا ضروری ہے۔ یونس کے موضوعات اور انتخابات اس لیے بھی مختلف ہیں کہ ان کی طبیعت میں فطرت کی موج مستی اور رنگینیاں بھی شامل ہیں۔ اس سے قبل سیمون دی بووا کی طویل کہانی اور اپنے کئی دوسرے تراجم سے وہ ہمیں حیرت میں ڈال چکے ہیں اور اب یہ سنگی کتابیں۔۔۔ ۲۱۳ ق م کا زمانہ جب کنفیوشس کی کتابوں کو پڑھنے پر باضابطہ پابندی لگا دی گئی اور ان کتابوں کا جلانے کا شاہی حکم صادر ہوا تو کنفیوشس مبلغین اور طالب علموں نے انہیں پتھر کی سلوں پر کندہ کر کے محفوظ بنانے کا کارنامہ انجام دیا۔۔۔ اب ایسی سنگی کتابوں کو اردو قارئین تک پہچانے کا حوصلہ سوائے یونس کے اور کس میں ہو سکتا تھا۔۔۔ یونس کا ترجمہ اس قدر بولتا ہوا ہے کہ اوریجنل کا گماں ہوتا ہے۔۔۔ مجھے خوشی ہے کہ بیجنگ کے کنفیوشس معبد میں محفوظ تحریریں اب اردو کا بھی سرمایہ ہیں۔ بعض اوقات مترجم کو شارح بھی بننا پڑتا ہے اور یہ ڈگر بہت مشکل ہے۔ تمثیل، تخیل، علامت، تلمیح، استعارے اور تشبیہہ کو ہو بہو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہوتا۔۔۔ یونس یہ آگ کا دریا اس آسانی سے پار کر گئے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس گراں قدر سرمایہ کو ہم تک پہنچانے کے لیے میں اردو زبان کے ارنسٹ ہیمنگوے یعنی یونس خان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

مشرف عالم ذوقی

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: فکشن ہاؤس، لاہور

..... مسیحا نہیں کوئی .....

قیصر اقبال اپنے تصورات، مشاہدات اور تجربات کو برش رنگوں سے مجسم کرنے والا آرٹسٹ ہی نہیں، بلکہ سُر ساگر کا منجھا ہوا شناور بھی ہے۔ مصورانہ بوقلمونیوں اور دل کے تاروں کو مرتعش کرنے والی مدھ بھری راگ راگنیوں نے اس رنگین مزاج اور ذوق وشوق سے بھرپور تخلیقی شخصیت میں ڈھالا۔ دوسری جانب الفاظ کی وقعت اور علم کی تابنا کی نے قلب ونظر کو سوچنے، سمجھے اور دیکھنے کے نئے زاویوں سے بہرہ ور کیا۔ یوں وہ ایک جہاں دیدہ باشعور تخلیق کار بن کر اُبھرا۔ شعور وہ انسانی صلاحیت ہے جو سماجی رشتوں کو جوڑنے، پرکھنے اور برتنے میں ممد ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت سے کما حقہٗ آگاہ ہے کہ ''انسان فطرت کی نگاہ میں جتنا خوب صورت ہے، وحشت کے لبادے میں اُتنا ہی خطرناک ہے۔'' اسی لیے قیصر اقبال انسانوں سے محبت ہی کو حاصلِ زیست اور اسی محبت کی افزودگی کو عشق گردانتا ہے۔ وہ عوام کے ساتھ اپنے رشتے کو جزو ایمان سمجھتا ہے۔ تنزل زدہ معاشرے کی زبوں حالی، انسانوں پر انسانوں کا روا رکھے جانے والا بہیمانہ ظلم وتشدد، طبقاتی تفریق، استحصالی ہتھکنڈے، ناانصافی، خواتین کی بے حرمتی، حکمران طبقے کی لوٹ کھسوٹ، انسانی آزادیوں کی پامالی، عالمی استعمار کی ریشہ دوانیاں۔۔۔ اس حساس دل فن کار کے موضوعات ہیں۔ یہ نظمیں شاعر کے ہیجانِ دروں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کے بے یار ومددگار اور پسے ہوئے انسانوں کی آواز تو دوسری جانب ظالموں اور بے حسوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑنے کی نقیب بھی ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کوئی سلیم الطبع جس کی تخلیق احسن تقویم کے اصولوں پر ہوئی وہ اپنے فن کے ذریعے بنی نوع انسان کی سربلندی وسرفرازی اور ان کی عزت وناموس کو اوجِ ثریا پر دیکھنے کا خواہاں ہے۔ نیئر اقبال علوی

اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: بلٹی میڈیا، لاہور۔

”چہارسُو“

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
رینو بہل
اقبال کا مردِ مومن
سفر کے خوش نصیب